

شام ڈھلے

آمنہ اقبال احمد



ہر سو گہرا سکوت تھا، چاروں اور گھمبیر سناٹا۔ یہاں وہاں کھڑے گاؤں
ساکت تھے اور۔

ذہلیق شام کے دھندلوں میں دور تک پھیلی پر شکوہ حویلی بہت پر اسرار لگ
رہی تھی۔

وہ گاڑی سے اتر آئی۔ آس پاس نگاہ ڈالی۔ کوئی بھی تو جانا پہچانا چہرہ نہیں
تھا۔ ڈرائیور اجنبی، سامان اٹھانے والا اجنبی۔ گاؤں کے چہرے اجنبی!
غم سے نڈھال وہ حویلی کے بڑے سے منقش چوہی دروازے میں داخل
ہوئی۔ تو قدم جیسے رک سے گئے۔ حویلی تو سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سورج
غروب ہو چکا تھا مگر ایک بھی بتی ایک بھی فانوس روشن نہیں تھا۔ سردی گہرا آئی تھی

'Let your heart guide you.
It whispers, so listen closely.'

مگر کہیں بھی انگلیٹھیوں میں جلتی بڑی بڑی لکڑیوں کی آگ نظر نہیں آ رہی تھی۔
شام گہری ہو چلی تھی اس کے باوجود ملازموں کے چلنے پھرنے، چائے پانی سرو
کرنے کی کوئی کھٹک سنائی نہ دیتی تھی!

”کوئی ہے...؟“ صدے سے بے حال وہ بمشکل پکاری۔

مگر۔ اُس کی آواز حویلی کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

تھکن سے پورہ وہیں وسیع و عریض ہال میں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔
اُسے اپنے ہی گھر میں اپنا آپ اجنبی سا لگنے لگا۔

تجہبی۔ وہ قدموں کی آہٹ پر چوکی۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔

چاروں اور پھیلے تلگے اندھیرے میں میزھیوں پر سے اُترتی لمبے قد کی ایک
چالیس بیالیس سالہ عورت کرخست سا چہرہ نیم وا آنکھیں لئے پراسراری نظروں
سے اُسے گھورتی کسی زومبی کی طرح آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔
پتہ نہیں کیوں؟ وہ دہل سی گئی۔

”آئیے۔ آپ کا سامان آپ کے کمرے میں پہنچ چکا ہے۔“ گہرے سنائے
کو توڑتی اُس کی آواز بھی جیسے کئی سربستہ راز لئے تھی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

”کون سب لوگ؟“ کسی بھی جذبے سے خالی وہ کسی مشین کی طرح بولی۔

”ماما الفت، اکرم بابا، باقی سب...“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ، آنکھوں میں بے شمار بھید تھے۔

”آپ... آپ کون ہیں؟“ وہ پوچھے بیٹانہ رہ سکی۔

وہ مسکرا دی۔ ایک عجیب پراسراری مسکراہٹ!

”سز علی۔ جہاگیر حیدر صاحب نے مجھے آپ کی دیکھ بھال کے لئے

بھیجا ہے۔“

”اودہ۔“

”آپ کا سامان آپ کے کمرے میں لگ چکا ہے۔“ اُس نے ایک بار پھر
اپنی بات دہرائی۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

وہ خاموشی سے اُس کے پیچھے ہوئی۔

اوپر جاتی میڑھیاں، وسیع و عریض راہداریاں، دور تک پھیلے کمرے، سبھی
اندھیروں میں ڈوبے تھے۔

اُس نے اُس کے لئے اُس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لائیٹ آن تھی اور
انگلیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ غنیمت تھا یہ بھی!

وہ۔ اس عورت سے پاپا کے بارے میں کچھ پوچھے، کچھ بات کرے۔ یہ
تو اُسے معلوم ہی ہوگا۔ پر۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُس کا روکھا روکھا سا رویہ دیکھ کر اُسے جھجک سی محسوس ہو رہی
تھی۔ پھر بھی۔

”آپ... کب سے یہاں ہیں؟“ اُس نے پوچھ ہی لیا۔

”میں آپ کے لئے چائے بھجواتی ہوں۔“ اُس کی آن سنی کرتے ہوئے اُس
نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

اودہ۔ اُس کی جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اُس کی بیزاری صاف بتا رہی
تھی!

وہ جاتے جاتے دروازہ بند کر گئی۔

اور۔ شاندارانہ ہکا بکا بند دروازے کو ٹپکتی رہ گئی۔

اُس کا ذہن ماؤف تھا۔ پاپا کا غم، اوپر سے حویلی کا یکسر بدلا اجنبی ماحول!
کس سے کہے؟ کس سے سنے؟

اُس کے صبر کا مزید یار نہ رہا۔ بستر پر پڑ کر وہ بے اختیار رو دی۔ پھوٹ
پھوٹ کر رو دی۔ وہ حیران تھی اب تک خود کو سنبھالا کیسے تھا؟

پاپا کی بہت خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ اے لیولز کے بعد انہوں نے اُسے

میڈیکل میں ایڈمشن بھی دلوا دیا تھا مگر۔ اُسے اس فیلڈ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُسے فائن آرٹ سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ سو۔ پاپا کی منت سماجت کر کے میڈیکل چھوڑ چھاڑ وہ لنڈن سکول آف آرٹس میں داخلہ کروا کے لنڈن چلی گئی۔ بمشکل تین مہینے گزرے تھے کہ اُسے پاپا کے ڈیجھ کی اطلاع ملی۔ اسلجے کی صفائی کر رہے تھے کہ گولی چلی اور اُن کی موت کا سبب بن گئی۔ اُس پر پردیس میں اس کمسنی میں کیا ہتی تھی؟ وہ ہی جانتی تھی۔ وہیں مقیم پاپا کے دوست درانی انکل و آئی نے اُسے سنبھالا دیا۔ اُس کے پاکستان آنے کا بندوبست کیا۔ ورنہ وہ تو سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔

غم سے نڈھال ایئرپورٹ پر اتری، باہر نکلی۔ تو اُس کی نظریں بے تابی سے انکل جہانگیر کو تلاش کر رہی تھیں۔ اتنی دیر اُس نے خود کو بمشکل سنبھالا تھا۔ اب اُن کے کندھے پر سر رکھ کر ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی۔ وہ پاپا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن میں اُس نے بارہا پاپا کی خوشبو محسوس کی تھی۔ مگر۔

اُن کے بجائے اُن کے ایک بالکل اجنبی ڈرائیور نے اُسے ریسیو کیا۔ اُس کے استفسار پر اُسے بتایا کہ وہ دو ہفتے کی میٹنگ کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے۔ اُس کے لب دلچ میں بھی سرد مہری تھی۔ جب اُس نے انکل کی فیملی آئی، سرفراز بھائی، تانیہ اور تاجیہ کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا وہ لوگ بھی ساتھ گئے تھے۔ یہ بتاتے ہوئے ڈرائیور کے لہجے کی بیزاری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

ایسا کیوں تھا؟ وہ تب بھی سمجھ نہیں پائی تھی!

مُر رونق حویلی میں زندگی کی پہلچ کیوں رکھ گئی تھی؟ روشنیوں کی چکا چوند اندھیروں میں کیوں بدل گئی تھی؟ مانوس مشفق چہروں کی جگہ اجنبی اور سرد مہر صورتوں نے کیوں لے لی تھی؟

یہ معمہ اب بھی اُس کی سمجھ سے باہر تھا!

روتے روتے ہی اُسے خیال آیا۔ انکل جہانگیر موجود نہیں تھے۔ وہ ماموں جان سے تو بات کر سکتی تھی۔

آنسو پونچھتے ہوئے وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ مگر جانے کیوں نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔ ایس ہوتے ہوئے وہ اٹھی۔ الماری میں رکھے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالنا چاہا مگر اُسے حیرت ہوئی سیل فون وہاں نہیں تھا۔ بہر حال۔

اُس نے سوٹ کیس سے کپڑے نکالے، واش روم گئی، گرم پانی سے نہائی، نرم و گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے، بال برش کئے ہی تھے کہ وہی ملازم جو اُس کا سامان گاڑی سے لایا تھا اُس کے لئے چائے لے کر آ گیا۔

”فون خراب ہے کیا؟“ شندی نے اُس سے پوچھا۔
”جی نہیں۔ آپ زیرو ڈائل کریں۔ مسز علی آپ کو مطلوبہ نمبر ملا کر دے دیں گی۔“

تو۔ فون بھی مسز علی کے قبضے میں تھا!

اُس نے ارادہ ترک کر دیا۔ چائے بنائی اور کپ اٹھاتے ہوئے بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔

رات کی تاریکیاں گھر آئی تھیں، دور حویلی کے گیٹ کی بتیاں جلا دی گئی تھیں اور ساکن ساکن سے گارڈز نے جا بجا پوزیشن سنبھال لی تھی!

اُس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تصور میں جو اُس نے دیکھا تھا۔ کہ وہ گھر پہنچے گی تو انکل جہانگیر اور اُن کی فیملی نہوگی۔ ماموں جان اور اُن کا پورا خاندان ہوگا۔ ماما الفت ہوں گی۔ اکرم بابا ہوں گے۔ خاندان کے ڈکھی لوگ خود روتے ہوئے اُس کے آنسو پونچھیں گے۔ اُسے تسلی دیں گے، ڈھارس بندھائیں گے۔ وہ جو پردیس میں پاپا کے ڈیجھ کی خبر سن کر ترپتی تھی، اُس کا مداد اہوگا۔ اُسے صبر آئے گا۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ سرے سے کوئی تھا ہی

نہیں۔ ماما الفت، جو اُسے رورو کر پاپا کے ڈچھ کی تفصیل بتاتیں، اکرم بابا جو اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے آنسو روک نہ پاتے۔ کہیں بھی تو نہیں تھے دونوں! آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔ وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ چائے کا کپ جوں کا توں میز پر رکھ دیا۔ تھکے تھکے بے جان سے قدم اٹھاتی دروازہ کھول کر وہ کوریڈور میں آ گئی۔

حویلی میں گہرا سناٹا تھا۔ ہر سوتا ریکیوں کا راج تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی اُسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ خود اپنے قدموں کی آہٹ پر اسرار سی لگنے لگی۔

چلتے چلتے وہ پاپا کے کمرے پر آ کر رک گئی۔ دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ چمچر ریں کر کے پٹ خود بخود اہو گیا۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی۔

سامنے ہی پاپا کا بیڈ دیکھا۔ تو سب بھول بھال گئی۔ اُن کے تکیوں سے لپٹ کر چیخ کر رونے لگی۔

”پاپا آپ کیوں چلے گئے۔ میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی... پاپا میں بالکل اکیلی ہوں... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے... بہت اندھیرا ہے پاپا...“ وہ روتے روتے بے سدھ ہو گئی۔

دفعتاً اُس نے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ خوفزدہ سی ہوتے ہوئے اُس نے رخ موڑ کر دیکھا۔ مسز علی تھی!

”ڈائینگ ہال میں آپ کا کھانا لگا ہے کھا لیجئے گا۔“ اُس نے اطلاع دی اور۔۔۔ دھیرے دھیرے چلتی باہر نکل گئی۔

نہ مسز علی نے کمرے کی لائیٹ آن کی تھی نہ اسی شندی نے آن کی۔ اسی طرح باہر نکل آئی۔ کوریڈور میں واپس چلتے ہوئے اُس نے محسوس کیا وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔

پے کمرے کے آگے سے گزرنے لگی تو اُسے خیال آیا اتنی بڑی خالی حویلی

اور وہ بالکل تنہا۔ رات اکیلے سوتے ہوئے اُسے ڈر لگے گا۔ مگر۔۔۔ کس سے کہے؟ نہ ماما الفت تھیں نہ اکرم بابا نہ باقی ملازموں کی ریل پیل۔ صرف ایک ملازم تھا اور۔۔۔ مسز علی۔ دونوں جیسے رو بوٹ تھے۔ سپاٹ لپچے میں روکھی سی بات کی اور چل دیئے۔

آج ڈائینگ ٹیبل پر پاپا کی سیٹ خالی تھی۔ وہ پھر رو دی۔ ایک نوالہ بھی حلق سے نہیں اُترا۔ اُٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے کپڑے تبدیل کئے اور بستر میں لیٹ گئی۔ تھکی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی مگر۔۔۔ حویلی کا بدلہ بدلہ نقشہ ذہن پر چھایا رہا۔ نہ نیند آئی نہ کچھ سلجھا سکی۔

تجھی۔ مسز علی ٹرے میں دودھ کا گلاس لئے آ گئی۔ کوئی بھی دستک دیئے بنا، کوئی بھی آہٹ کئے بغیر۔

”یہ دودھ پی لیجئے گا۔“ اُس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے میکینیکل انداز میں کہا اور۔۔۔

اپنی مخصوص دھیمی چال چلتی باہر نکل گئی۔

وہ بستر سے اُٹھ آئی۔ صوفے پر بیٹھی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ کہ وہ کئی گھنٹے سے بھوکی پیاسی تھی اور سخت نفاہت محسوس کر رہی تھی۔

واش روم جا کر اُس نے دانت برش کئے، واپس آئی، لائیٹ آف کی اور بستر میں گھس گئی۔

مسز علی کا رویہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ روکھا روکھا اور جیسے بھید ہے لئے تھا۔ اُسے اکیلے میں خوف آنے لگا۔ ہر چیز پر اسرار نظر آنے لگی۔ سنان حویلی، ساکت ساکت سے چوکیدار اور سب سے بڑھ کر چلتی پھرتی زومبی۔ مسز علی!

تکیوں سے چپٹے ہوئے اُس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

معا۔۔۔ سائینڈ ٹیبل پر رکھے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

وہ اچھل کر رہ گئی۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھایا۔
”جہانگیر حیدر صاحب سے بات کریں۔“ مسز علی کی مکر وہ سی آواز سنائی دی۔

مگر۔ انکل جہانگیر کا سن کر اُس کی جان میں جان آ گئی۔
وہ ضروری آفیشل کام سے کراچی گئے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ اُسے خود ریسور نہ کر سکے۔ آئنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹر سے چیک آپ کروانے ساتھ گئی تھیں۔ وہ چونکہ کام میں مصروف تھے اس لئے تانیہ، ناجیہ اور سرفراز بھائی آئی کو سنبھالنے ساتھ گئے تھے۔ مسز علی بقول اُن کے بہت اچھی خاتون تھی۔ اب چونکہ شاندانہ اکیلی رہ گئی تھی، اور بے شمار املاک کی اکلوتی وارث تھی اور پیسہ ہی چونکہ انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ اس لئے اب اُسے بے انتہا احتیاط برتنا تھا۔ ایسے میں مسز علی جیسی مضبوط عورت ہی اُس کا بہتر خیال رکھ سکتی تھی۔ فون بھی اُس کی تحویل میں اس لئے دیا گیا تھا کہ اب وہ اکیلی تھی اور ڈائریکٹ کالز اُس کی پریشانی کا سبب بن سکتے تھے۔ ماما الفت، اکرم بابا، پرانے ملازم وچکیدار سب نمک حرام تھے۔ اس لئے اُن کو نکال باہر کیا گیا تھا۔۔۔

سلسلہ منقطع ہوا تو اُس نے ریسور کرڈیل پر رکھ دیا۔ سرائیک بار پھر تکیوں میں دے کر آنکھیں موند لیں۔

انکل کی آواز سن کر اُس میں ہمت آ گئی تھی، وہ روئی تھی تو اُنہوں نے اُسے تسلی دی تھی۔ حوصلہ دیا تھا، دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی تھی اور۔ کہ اسے ہی زندگی کہتے ہیں!

”پیسہ ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ تمہیں بے انتہا احتیاط برتنا ہو گی۔۔۔“ اُس کے کانوں میں انکل کی آواز گونجی۔

اُس کی سینکڑوں کروڑوں کی جائیداد تھی۔ امی کی پہلی شادی ایک

Millionaire سے ہوئی تھی۔ امی خود بھی ایک کھاتے پیتے باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پڑھائی کے دوران داؤد صاحب کو کچھ ایسی بھانگی تھیں کہ ڈیڑھ سال سے ہوئی اپنی منگنی تڑوا کر اپنے خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود اُن سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد البتہ اُن لوگوں نے امی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکلوتے بیٹے کی بیوی تھیں۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ مثالی خاندان اور مثالی شادی تھی۔ مگر امی کو اتنی خوشیاں راس نہ آئیں۔ سال بھر بعد ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں سب ختم ہو گئے۔ ساس، سر، بیٹا، سبھی۔ امی پتہ نہیں کیسے معجزانہ طور پر بچ گئیں۔ اکیلی امی پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اپنے پرانے سب کی نظر اُن کے شوہر کی بے پناہ دولت پر لگی تھی۔ طرح طرح سے پریشان کرنے لگے۔ گھر سے باہر نکلتیں تو ہراساں کرتے۔ فون کالز کر کے ڈراتے دھمکاتے۔ زندگی دوبھر ہو کر رہ گئی تھی۔ نانا انتقال کر چکے تھے۔ ایک بھائی تھا وہ بھی اپنے بکھیڑوں میں الجھا تھا۔ ایک بڑی سوتیلی بہن شادی کے بعد کینیڈا میں قیام پذیر بھی پیچھے مڑ کر ہی نہیں دیکھا تھا۔ نانی کو اپنے دکھ بتا کر وہ اس عمر میں اُنہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ دل کا حال بتاتیں بھی تو کس کو؟

مگر نانی ماں تھیں۔ اُنہوں نے نہیں بھی بتایا پھر بھی سب سمجھ گئیں۔
زندگی کے برسہا برسوں کے تجربے کی روشنی میں اُنہوں نے امی کو کسی مضبوط سہارے کا مشورہ دیا۔ اور دور پار کے جاننے والوں میں نکاح کے دو بول پڑھا کر اُنہیں پاپا کی حفاظت میں دیدیا۔

پاپا ایک شریف انسان تھے۔ پیر سڑتھے۔ جتنے اچھے خود تھے اتنے ہی اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ امی سے بے لوث محبت کی۔ اُن کے لامحدود املاک کی نہایت ایمانداری سے دیکھ بھال کی۔

شاندانہ پیدا ہوئی تو لگا دونوں مکمل ہو گئے۔ ہر طرف سکون تھا اطمینان تھا۔ زندگی ایک خوبصورت ڈگر پر چل نکلی تھی۔ حویلی میں اُس کی وجہ سے چہل پہل

ہوتی تھی، رونق ہوتی تھی۔ امی اور پاپا کے علاوہ نوکر چاکر بھی تو جان چھڑکتے تھے اُس پر۔ پھر وہ شہر سکول جانے لگی۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ وہ بارہ سال کی تھی کہ اچانک ایک دن امی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پاپا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ لگتا تھا وہ اور پاپا یہ صدمہ برداشت نہ کر پائیں گے۔ مگر انسان بہت سخت جان واقع ہوا ہے۔ وقت ہولے ہولے مرہم لگا تا گیا اور اُن دونوں نے ایک بار پھر زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ پاپا کی ساری توجہ شندی پر مرکوز ہو گئی تھی۔ ماما الفت بھی اولاد سے کم خیال نہ رکھتی تھیں۔ اکرم بابا بھی بہت محبت کرتے تھے اُس سے۔ انکل جہانگیر، آنٹی، تانیہ ناجیہ، سرفراز بھائی اور اسی طرح ماموں جان، ممانی جان، قاریہ، شاہد بھائی اور فہد بھائی بھی ہمیشہ کی طرح گاہے بے گاہے ملنے آتے رہتے۔ اور یوں۔۔۔ زندگی رواں دواں تھی۔

اے لیوٹر کے بعد وہ پاپا سے اپنی خواہش منوا کر لنڈن گئی۔ اور واپس آئی تو اپنے بہت ہی پیارے پاپا کو ہمیشہ کے لئے کھو چکی تھی۔
حویلی وہ حویلی ہی نہیں رہی تھی۔ ہر نگاہ اجنبی تھی۔ اُسے اپنا آپ بھی اجنبی اجنبی سا لگنے لگا۔

تھکا ذہن تھکی روح لئے جانے کس پہر اُس کی آنکھ لگ گئی۔



اُسے آئے آج دسواں دن تھا۔ اس دوران اُسے اپنے اوپر لگی اور بہت سی پابندیوں کا پتہ چل گیا تھا۔ حویلی کے باہر ایک خاص حد کے بعد وہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے حویلی کے دروازے بند ہو جانے کے بعد وہ اُنہیں کھلوانے پر قادر نہ تھی۔ اُس کی کسی دوست کا فون نہیں آ سکتا تھا۔ نہ ہی اُسے اجازت تھی اُنہیں کونٹیکٹ کرنے کی۔ نہ اُس کی کوئی دوست اُسے ملنے آ سکتی تھی۔ نا ہی وہ کہیں جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ کلک نواز اور مسز علی کے علاوہ باہر کسی پڑکھار تک سے بات کرنے کی مجاز نہ تھی۔

بہر حال۔۔۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ رات ماموں جان کا فون آیا تھا۔ اُنہیں کل ہی اُس کے آنے کا پتہ چلا تھا۔ اور آج وہ بمعہ اہل و عیال اُس سے

ملنے آ رہے تھے۔ یہ بھی غیبت تھی کہ اُن کے آنے پر پابندی نہیں عائد کی گئی تھی۔

وہ شدت سے اُن لوگوں کی منتظر تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ تھا۔ ختم کیوں نہیں ہو رہا تھا؟

وقت گزارنے کے وہ اپنے بک ریک سے ایک دلچسپ ناول نکال کر بالکنی میں دھوپ میں آ بیٹھی۔ پھر۔۔۔ وہ بے خبر ہو گئی۔

دورگیت میں اُن کی گاڑیاں داخل ہوئیں۔ تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

وہ دوڑتی ہوئی نیچے گئی۔ وہ سب حویلی کے انٹرنس میں داخل ہو چکے تھے۔

سب سے پہلے وہ ماموں جان سے ملی۔ اُن کے گلے لگ کر زار و تظار روئے

گئی۔ پاپا کی جدائی کی وجہ سے بھی اور اپنے اوپر عائد کی گئی افتاد کی وجہ سے بھی۔

پھر باری باری سب سے ملی۔ ممانی جان اور قاریہ کے علاوہ شاہد اور فہد بھائی بھی

بعد اپنے اہل و عیال کے آئے تھے۔

وہ سب ڈرائیونگ روم میں بیٹھ گئے۔ چائے کے دوران ماموں جان اور

ممانی جان پاپا کی اچانک ڈچھ کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ اُسے تسلی

دیتے رہے۔ ممبر کی تلقین کرتے رہے۔ اُسے واقعی بہت ڈھارس ملی تھی اُن کے

آنے سے۔

لُنج پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ پاپا کی بھی، دور نزدیک کے رشتہ داروں کی بھی،

دوستوں کی بھی، جان پہچان والوں کی بھی۔ مسز علی اپنی مخصوص مُردنی چال اور

پراسرار آنکھیں لئے یہاں وہاں سے گزرتی نظر آ رہی تھی۔ مجسم راز تھی جیسے!

کھانے کے بعد ماموں جان اور ممانی جان تھوڑی دیر کو ستانے بیڈ روم

میں چلے گئے۔ باقی سب پچھلی طرف لان میں دھوپ میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے

لگے۔

شادی نے چپکے چپکے قاریہ کو سب بتا دیا۔ حویلی کا یکسر بدلا ماحول، اُس پر

عائد کی گئی بے شمار پابندیاں اور۔۔۔ مسز علی کا روکھا اور پراسرار رویہ! پاپا کی

ڈچھ کا غم تو ایک طرف وہ تو اپنے ہی گھر میں غیر بنادی گئی تھی۔ مسز علی ہی بخیر کل تھی!

اپنے اوپر آئی مصیبتوں کا ذکر کرتے کرتے وہ ایک بار پھر رو دی۔ قاریہ نے اُسے تسلی دی کہ وہ ابو سے بات کرے گی۔ اور وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔

وقت بہت اچھا کٹا۔ وہ لوگ اُس کی خاطر شام ڈھلے تک رکے رہے۔ مگر

جانا تو تھا۔ صبح سب نے اپنے اپنے آفس بھی جانا تھا۔ ماموں جان نے اُسے

ڈھیروں تسلیاں دیں۔ اُسے اپنی املاک سنبھالنے کا حوصلہ اور درازئی عمر کی

دعائیں دیں۔ ممانی جان نے بھی کچھ کم ہمت نہیں بندھائی۔ پھر سب نے اُسے

اپنے یہاں آنے کی پرزور دعوت دی۔ اور رخصت ہو گئے۔

پھر پور دن گزارنے کے بعد ایک بار پھر تجائی کے عذاب سے خوفزدہ وہ اندر

کی طرف بڑھی۔

سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تو اچانک۔۔۔ ٹانگیں بے جان سی محسوس ہوئیں۔ اُس

نے ریٹنگ کا سہارا لیا اور دھیرے دھیرے چلتی اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

لائٹ آن تھی۔ آنگیٹھی میں بڑی بڑی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ماحول

خاصا کوزی تھا۔

اُس نے انٹرکوم پر پکین سے چائے منگوائی اور۔۔۔ شال لپیٹتی حسب معمول

بالکنی میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

بلا مقصد! دھر! دھر! نظریں دوڑاتی رہی۔ ذہن اب بھی اسی اُدھیر بن

میں مصروف تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟

موا اُسے خیال آیا۔ ماموں جان اور سب نے اُسے اپنے گھر آنے کی

دعوت دی تھی۔

اُسے یکدم ہی بہت ساری خوشی کا احساس ہوا۔ اُن کے یہاں جانے پر یقیناً

کوئی روک ٹوک نہیں ہونی تھی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ نواز اُس کے لئے چائے لیکر آیا تھا۔
برتن اُس کے آگے میز پر لگا کر وہ خالی ٹرے لئے واپس جانے لگا۔
”مسز علی کو بھیج دو“۔ شندی نے کہا۔

اور۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں مسز علی بغیر دستک دیئے، بغیر کوئی کھڑکا کئے اپنی
مخصوص وضع قطع میں اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بولی کچھ نہیں، بس آر پار
ہوتی نظریں اُس پر جمادیں۔

”مسز علی۔ میں اپنے ماموں کے گھر تو جاسکتی ہوں نا“۔

اُسے امید تھی اُس کا جواب ’ہاں‘ میں ہوگا۔ کہ ماموں جان کے یہاں آنے
پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔

”سوری۔ آپ وہاں نہیں جاسکتیں“۔ مسز علی اپنے مشینی لب و لہجہ
میں بولی۔

”کیوں؟“ وہ چڑھی گئی۔

”مجھے یہی حکم ہے۔“

”کیا میں اپنے ہی گھر میں قیدی بن کر رہوں گی؟“ وہ جھنجھلا اٹھی۔

”کم از کم جہانگیر حیدر صاحب کے آنے تک تو ایسا ہی ہوگا۔“ اُس نے
کہا۔ اور واپس مڑتے ہوئے چل دی۔

مارے غصے اور بے بسی کے اُس سے چائے بھی نہیں پی گئی۔

جھنجھلائی جھنجھلائی ہی۔ وہ پھر سے آس پاس دیکھنے لگی۔ در بھاری آہنی
گیٹ کی بتیاں جلا دی گئی تھیں اور۔۔۔ ادھر ادھر کئی چوکیدار حرکت میں آگئے
تھے۔

اُس نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی۔ پاپا کے وقتوں میں حویلی کے ارد گرد کوئی
چار چوکیدار پہرہ دیا کرتے تھے۔ مگر ان دنوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت

سارے چوکیدار اسلحہ سنبھالے کھڑے رہتے تھے۔ کیا یہ سب بھی اُسی پر نگران تھے
؟ وہ سوچے بیٹا نہ رہ سکی!

رات کی تاریکیاں گھر آئیں، سردی چپٹے لگی، تو وہ اندر چلی آئی۔
آگ کے قریب صوفے پر بیٹھی میگزین کے ادراک الٹ پلٹ کر ہی رہی
تھی۔ کہ نواز نے آکر ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔

اُس نے بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اور واپس بیڈ روم میں آگئی۔
کچھ دیر یوں ہی ٹی وی پر مختلف چینلوں بدل بدل کر دیکھتی رہی۔ مسز علی اُس کے
لئے دودھ لے آئی۔ تو اُس نے ٹی وی آف کر دی اور۔۔۔ دروازہ اندر سے
بند کر لیا۔ اب وہ اندر سے کنڈی لگانے لگی تھی۔ کہ کون تھا جس کے لئے وہ
دروازہ کھلا چھوڑتی۔ پہلے تو پاپا ہوتے تھے جو رات کو وقت بے وقت اُس کی خبر
لینے چلے آتے تھے۔ اور پھر اب تو اُسے مسز علی سے بھی خوف آتا تھا۔ پتہ نہیں
کیوں؟

دودھ پی کر وہ کپڑے بدلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ لائیٹ چلی گئی۔ بجلی کو پتہ
نہیں کیا ہو گیا تھا۔ بار بار چلی جاتی تھی۔ اور بقول مسز علی جزیرہ خراب تھا۔ اُس
نے سائینڈ ٹیبل پر رکھی بڑی سی کینڈل جلائی۔ ڈریسنگ روم جا کر کپڑے تبدیل
کئے۔ ٹائمٹ سوٹ پہنا، واپس آئی، بستر میں گھسی اور سر ہانے رکھا ادھر اچھوڑا
کی تھرین اینڈ رن کا ’Forever After‘ اٹھا کر کینڈل لائیٹ میں ہی پڑھنے
لگی۔

رات کا ایک بج گیا۔ تو اُس نے کتاب بند کر کے سائینڈ ٹیبل پر رکھی اور موم
بتی بجھاتے ہوئے بستر میں لیٹ گئی۔

دوبجئے کو تھے کہ اچانک کوریڈور میں کسی کے چلنے کی آہٹ سے اُس کی آنکھ
کھل گئی۔

اس وقت کون ہو سکتا تھا؟ مین دروازہ تو وہ خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے آئی

تھی۔

وہ اٹھی۔ صوفے کی پشت پر سے شال اٹھا کر کندھوں پر لی۔ دروازے کا بولٹ کھولتے ہوئے ذرا سا دیکھا۔

کوئی عورت تھی۔ اس طرف پیٹھ تھی۔ گھٹنوں سے ٹپکتے کپلے بال لئے، موم بتی روشن کئے، آہستہ آہستہ کوریڈور میں چلی جا رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر عورت ہولے سے مڑی۔ ہاتھ میں پکڑی موم بتی کی روشنی میں وہ کوئی بدروح لگ رہی تھی۔ وہ پراسرار انداز میں قدرے مسکرائی اور رخ واپس موڑتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ گئی۔

شدی کے کاٹھو تو لبونہیں تھا بدن میں۔ خوف اُس قدر غالب تھا کہ آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ بمشکل دروازہ بند کیا۔ اور بستر میں گھستے ہوئے تکیوں سے چٹ کر آنکھیں میچ لیں۔

پہلے ہی دن جب وہ گھر لوٹی تھی تو ڈنر سے قبل کوریڈور میں چلتے چلتے پاپا کے کمرے پر جا کر رک گئی تھی۔ دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ 'چر ریں' کر کے پٹ خود بخود اہو گیا تھا۔ تب بھی اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔ پھر سامنے ہی پاپا کا بیڈ دیکھا تو بھول بھال گئی سب۔ بعد میں اس واقعے کو اپنا وہم سمجھ کر بھلا دیا۔

گھر ابھی ابھی۔ یہ عورت!

خوف سے تھر تھراکتی لحاف میں سر منہ لپیٹے وہ بستر سے چٹی رہی اور۔ رات بیتی چلی گئی۔



چند دن اور گزر گئے۔ وہی صبح وہی شام۔ صبح اُس کا ناشتہ کمرے میں آتا۔ بعد میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے وہ نیچے اندرونی لان میں دھوپ میں آ بیٹھتی۔ کوئی کتاب پڑھتی یا یوں ہی خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں بکتی رہتی۔ لُنج کے بعد آرام کرتی۔ شام چائے پینے کے بعد تھوڑا سا حویلی کے باہر نکل جاتی۔ یا پھر اپنی بالکنی میں ہی پوری شام گزار دیتی۔

وہی سائیں سائیں کرتی حویلی تھی، وہی پابندیاں تھیں، اور وہی سربستہ راز! اب تو اُس نے پوچھ گچھ یا تنگ و دوہی چھوڑ دی تھی۔ بس انکل جہانگیر کے آنے کا انتظار تھا۔ جو طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ آنٹی کے کچھ مزید چیک اپ کرنا تھے۔ ساتھ ہی رپورٹس کا انتظار تھا۔ اس لئے اُن لوگوں کا قیام اور بھی

بڑھ گیا تھا۔

دوپہر کو سوکراٹھی تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ واش روم میں مٹی۔ گرم پانی کا شاور لیا تو طبیعت بشاش ہو گئی۔ موڈ رنگ کے گرم کپڑے پہنتے ہوئے اُس نے بال برش کئے۔ وایٹ خوبصورت جیکٹ پہنی اور بالکنی میں آکھڑی ہوئی۔
ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ فطرت سے سرگوشیاں کرتے مناظر نے اُسے مسحور کر لیا۔ اچھا تھا اُسے بالکنی میں آنے کی اجازت تھی۔ ورنہ اس پر بھی پابندی ہوتی تو وہ کیا کر سکتی تھی!

سورج دور اُس پارسری پہاڑ کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ گھنے قد آور درخت چپ چاپ ایسا دہ تھے اور۔ تاحد نگاہ پھیلی سروسوں ڈوبتے سورج کا سیندور چرائے لئے جارہی تھی۔

حسب معمول یہاں وہاں گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ دور آہنی گیٹ پر بھی پہرہ تھا اور۔ حیرت سے اُس نے دیکھا آج حویلی کے مین چوہی دروازے پر بھی ایک گارڈ کھڑا تھا۔

اگر یہ سب اُس ایک اکیلی جان ناتواں کے لئے کیا گیا تھا تو اُسے ایسا کرنے والے کی بزدلی پر ہنسی آرہی تھی!

اندرواہیں کمرے میں آتے ہوئے اُس نے اپنے بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے رات والا ناول اٹھایا اور بالکنی میں آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پڑھنے میں محو ہو گئی۔
تبھی نواز اُس کے لئے چائے لے کر آ گیا۔ برتن اُس کے آگے میز پر لگائے، خالی ٹرے لی اور خاموشی سے واپس چل دیا۔

شام کی چائے کے ساتھ وہ اور پاپا ضرور ہلکی پھلکی سنیکس لیا کرتے تھے۔ کبھی سینڈویچز، کبھی فیش فنگرز، کبھی کوئی عمدہ کیک۔ مگر اب تو جیسے وہ بھول ہی چکی تھی یہ سب۔ نہ ان لوگوں نے کبھی کچھ آفر کیا۔ نہ اُس نے کوئی فرمائش کی۔ اور پھر۔ پاپا بھی تو نہیں تھے۔ وہ اکیلی کیا کھاتی؟

کپ میں چمچ چلاتے چلاتے دو آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آرہے۔
”پاپا آپ کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔ آپ کے بغیر میں زندگی Manage نہیں کر پارہی۔ آپ کے بغیر میں جیوؤں گی کیسے پاپا؟“

پچھلے گال انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتے ہوئے اُس نے کپ اٹھالیا۔
کھیتوں کے اُس پارسری پہاڑ کے دامن میں اُن کے مزارعوں کی کچی پکی بستی میں شام کی پکوان کے دھوئیں اٹھنے لگے تھے، تھکے ہارے گذریئے اپنے ریوڑ ہانکتے گھروں کی طرف چل دیئے تھے اور۔ دن بھر کے نڈ حال پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کی سمت رواں دواں تھے!

چائے پیتے پیتے وہ پھر سے کتاب کے اوراق پلٹنے لگی۔ بہت دلچسپ ناول تھا۔ وہ جلدی ہی محو ہو گئی۔

شام گہری ہونے لگی، سردی کاٹنے لگی، تو اُس نے کتاب بند کر دی۔
ایک نظر آس پاس ڈالی۔ ملگیا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مگر اب تک ارد گرد کوئی بھی جتنی روشن نہیں ہوئی تھی۔ چوکیدار بھی جیسے سارے کے سارے بیک وقت چھٹ گئے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں داخل ہونے کو تھی کہ۔
بائیں جانب سائیں سائیں کرتے درختوں میں اُسے پاپا جاتے دکھائی دیئے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

ایک منہمک کر دینے والی لہر اُس کی ریزہ کی ہڈی میں سے تیر گئی۔
وہ جلدی ہی درختوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔
خود کو سنبھالتی وہ کمرے میں آ گئی۔ لایمٹ آن کی۔ اور بیچ کمرے میں کھڑی دیر تک اپنے واسطے پر پریشان رہی۔

دھیان بٹانے کو انگلیٹھی میں جلتی لکڑیوں کی آگ کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ پھر سے ناول پڑھنے لگی۔
چندی صفحے باقی تھے کہ نواز نے آکر ڈنر لکھنے کی اطلاع دی۔

وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کیوں اُسے چکر سا آ گیا۔ فوراً صوفے کا بازو تھام لیا۔ کتنی کمزوری ہو رہی تھی اُسے۔ طبیعت ذرا بحال ہوئی تو وہ نیچے ڈائیننگ ہال میں آ گئی۔ کھانا کھا ہی رہی تھی کہ حسب معمول لائیٹ چلی گئی۔ ہر سو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نواز سفید بڑی سی جلتی کینڈل لے آیا۔ کینڈل ہولڈر میں اُسے فلکس کیا۔ اور چلتا ہوا۔

اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ چھ کینڈل ہولڈرز جن میں ہمہ وقت کینڈلز لکھڑ اور لائٹس ساتھ ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں نہیں ہوتا تھا؟

بہر حال۔ وہ پھر سے کھانا کھانے لگی۔ کینڈل ہی سے اُسے یاد آیا۔ کل اُس کی بہت ہی پیاری دوست ناہید کی برتھ ڈے تھی۔ ساتھ ہی اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ تو اُسے فون پر بھی گریٹ نہیں کر سکتی تھی۔ ناہید نے بھی تو اُسے کو میٹ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اُسے یقیناً پاپا کی ڈیٹھ کا علم ہو گا۔ اور یہ بھی اندازہ ہو گا کہ وہ ضرور پاپا کی ڈیٹھ پر آئی ہوگی۔ برتھ ڈے پر انوٹیشن نہ سہی اُس کے پاپا کی ڈیٹھ پر تو اُس کے پاس آنے کی بھی کوشش کی ہوگی مگر۔ یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ راز کیا تھا؟ انکل جہانگیر کے آنے پر ہی پتہ چلتا تھا!

اس وقت پھر اُس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب تو آنسوؤں نے پلوں پر ہی بسیرا کر لیا تھا جیسے!

نینکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

کتنی دیرانی تھی! کتنی تاریکی! کوریڈورز میں جا بجا موم بتیوں کے فانوس بھی تھے مگر۔ مسز علی اور نواز۔ شاید انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ خود وہ۔ پاپا کے بعد اور۔ انکل کے انتظار میں۔ بس وقت ہی کاٹ رہی تھی۔ کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

جیسے تیسے کر کے وہ کمرے میں پہنچی۔ یہاں البتہ کینڈل روشن تھی۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔ ایک نظر ٹی وی پر ڈالی۔ لائیٹ ہی نہیں تھی تو ٹی وی کیا آن

ہوتی!

خیر۔ وہ ڈریسنگ روم گئی۔ رات کے کپڑے پہنے۔ واپس کمرے میں آئی۔ تو مسز علی اُس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھ چکی تھی۔

بستر میں گھستے ہوئے اُس نے پشت تکیوں سے نکالی۔ اور ناول کے باقی چند صفحات کینڈل کی روشنی میں پڑھنے لگی۔

بہت انٹرٹیننگ کہانی تھی۔ جلدی ہی اُس نے ختم کر لی۔ دودھ پیا، دانت برش کئے اور۔ کینڈل بجھا کر نرم و گرم فلفلی لحاف اچھی طرح اوڑھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

سبحا۔ اُس کی نظروں میں شام بالکٹی سے اندر کمرے میں آتے آتے بائیں جانب درختوں میں پاپا کا بھولہ گھوم گیا۔ پٹ سے اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔

کبھی پاپا کے کمرے کے دروازے کا پٹ چر رہی کر کے خود بخود اہو جانا، کبھی کسی عورت کا کوریڈور میں چلنا، اور آج شام پاپا کا گھنے درختوں میں نظر آنا!

کہیں اُس کا وہم تو نہیں تھا یہ سب؟ سنسان سنسان جویلی اور پراسراری مسز علی سے دل ہی دل میں خائف اور سہمی رہتی تھی۔ یہ سارا خوف کہیں لاشعور میں بس کر رہا ہے گا ہے ان واقعات کی شکل میں تو سامنے نہیں آ رہا تھا؟

جتنا سوچتی تھی اتنا ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے خیال جھٹک دیا۔ آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ غنودگی نے آ لیا۔

ٹک... ٹک... ٹک...

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کوریڈور میں پاپا کے بٹس کی آہٹ تھی۔ پاپا کے قدموں کی چھاپ!

اُسے لگا آج وہ زندہ نہیں بچے گی۔ خوف اُسے مار ڈالے گا۔ اُس کا دل

بجرتوڑ کر باہر آنے لگا۔

قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔
اُسے نیچے جانا چاہئے تھا۔ مسز علی اُسے ویکلم کرے نہ کرے۔ اُس کا اُس کے
پاس ہونا ضروری تھا۔ کوئی بھی اور واقعہ ہوا تو وہ یقیناً برداشت نہ کر پائے گی۔
ہمت اکٹھی کر کے وہ بستر سے اٹھ آئی۔ بمشکل دروازہ کھولا اور۔۔۔ سہی سہی
پھیلی پھیلی آنکھیں لئے کوریڈور میں آگے کی طرف بڑھنے لگی۔ اسی طرف سے
ایک شورٹ کٹ راستہ نیچے مسز علی کے کمرے کی طرف جاتا تھا۔
چہار سو گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ
آگے بڑھ رہی تھی۔

تبھی۔۔۔ اُس نے دیکھا۔ سامنے کے موڑ کے پاس ہی پاپا کی لائبریری میں
موسوم سی روشنی ہو رہی تھی۔ کون ہو سکتا تھا رات کے اس پہر؟ پھر بھی اُسے کچھ
ڈھارس سی ہوئی۔ لامتناہی اندھیروں میں روشنی کی رفق تو نظر آئی تھی!
وہ شورٹ کٹ چھوڑ اُسی سمت ہوئی۔ قریب پہنچی۔ ہولے سے پٹ واکیا۔
ہمیشہ کی طرح دروازے کی طرف پیٹھ کئے اپنی کرسی پر اپنے مخصوص براؤن کی
جلتی سگریٹ انگلیوں میں دبائے پاپا بیٹھے تھے!

اُس کی ایک بے دریغ چیخ نکلی۔ اور پھر اُسے کوئی ہوش نہیں رہا۔
آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھی۔ ارد گرد دیکھا۔ صبح کی پو پھٹنے کو تھی۔ کمرے
میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور۔۔۔ اجلی اجلی صبح تاریکیوں کے اسرار کو نگل گئی تھی!



انکل جہانگیر اور اُن کی فیملی واپس آ چکے تھے۔ رات انکل نے اُسے اپنے
کنبچے کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی کہ آج وہ اُسے ملنے آرہے تھے۔
وہ بہت خوش تھی۔ سارا خوف، رنج و فکر جاتے رہے تھے۔ دنوں بعد بہت ہلکا
محسوس کر رہی تھی۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ گرم پانی کا شاور لے کر اُس نے اوٹن بلوشلوار
قمیض پہنی۔ کپڑوں سے بچ کر تا خوبصورت پرنٹڈ سٹول کندھے پر ڈالا، ہمرنگ
لیڈر کے شوز پہنے، گھنے خوبصورت بالوں میں برش کیا اور۔۔۔

سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس وقت پھر اُسے سخت کمزوری نے آلیا۔ نہائی بھی
تھی شاید تھک گئی تھی اس لئے۔ غڈ حال سے قدم سنبھالتی وہ حویلی سے باہر نکل

آئی۔
بوجھل گھٹائیں پورے آکاش کو گھیرے میں لئے تھیں۔ نرم خرام ہوا بھگی بھگی
تھی اور۔ بارش اب برسی کہ اب!
شدید سردی تھی۔ اس کے باوجود اسے اچھا لگ رہا تھا سب۔ وہ آگے ہی
آگے بڑھتی گئی۔

تاجہ نظر پھیلے سرسوں کے پھولوں، گھنے قد آور درختوں، اور اس پار سری
پھاڑ پر۔ بادل جھک جھک آ رہے تھے۔ دن میں ہی شام اتر آئی تھی جیسے۔ سحر
زدہ ماحول اسے بھی اپنے سحر میں جکڑے تھا!
”رکئیے۔“ تیزی سے پاس آتے ہوئے ایک گارڈ نے کہا۔
چوکتے ہوئے وہ رک گئی۔

”آپ کو یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“ وہ مزید بولا۔
اوہ۔ وہ واقعی مقرر کردہ حد کراس کر گئی تھی۔
تبھی۔ گارڈ کا سفید رومال نیچے گر گیا۔

”آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے۔ احتیاط کیجئے گا۔“ جھک کر
اپنا رومال اٹھاتے اٹھاتے وہ اچانک رازداری سے بولا۔
وہ متحیر اسے دیکھنے لگی۔

”تم... تم کون ہو؟“

”گارڈ۔ آپ کا گارڈ۔“

وہ مڑا۔ اور اسی تیزی سے واپس چل دیا۔

وہ سن سی وہیں کھڑی رہی۔

’آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے...‘ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔
وہ جیسے حدود دکھانے سے زیادہ اسے وارن کرنے آیا تھا کہ اسے slow poison
کیا جا رہا تھا۔ اور۔۔۔ کہ اسے احتیاط کرنا چاہیے تھا۔

اس کی ساری ایکسائمنٹ جاتی رہی۔ تھکے تھکے سے قدم سنبھالتی وہ پھر سے
حویلی کی طرف آنے لگی۔

کمرے میں آ کر وہ آگیتھی میں جلتی آگ کے قریب صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔
کون اسے زہر دے رہا تھا؟ اس گارڈ کو کیسے معلوم ہوا؟
یہ گارڈ۔ اس تمام عرصہ میں اور تمام لوگوں میں پہلی بار کوئی اس سے
بہدردی کر رہا تھا!

اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا تھا؟ وہ اس وقت اس قدر کنفیوز تھی کہ پوچھ ہی
نہ سکی۔ اور۔ پوچھتی بھی کیسے کہ وہ تو خود اتنی رازداری برت رہا تھا۔ لگتا
تھا رومال بھی اس نے خود گرایا تھا کہ اٹھاتے اٹھاتے اسے بات کرنے کی مہلت
مل سکے۔ اسے تو خود جیسے اس پاس کھڑے چوکیداروں کا خیال تھا۔

اسے کچھ کچھ حویلی میں بچھائے گئے جال کا احساس ہونے لگا۔ اس قدر سخت
پابندیاں، مسز علی کی پراسرار نظریں اور حویلی کا پیتھاک ماحول۔ ان سب کے
پیچھے کیا راز تھا اور کس کا ہاتھ تھا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی!
لنچ ٹیک انکل جہانگیر آ گئے۔ اکیلے ہی آئے تھے۔ ان کے کندھے پر سر رکھ کر
وہ بے طرح رو دی۔

دونوں نے لنچ اکٹھے کیا۔ اس کے بعد وہ اس کے ساتھ اس کے بیڈروم میں
آ کر بیٹھ گئے۔

بہت ساری باتیں ہوئیں۔ پاپا کے متعلق، انکل اور ان کی فیملی کے متعلق،
ماموں جان کے بارے میں۔ بات نہیں ہوئی تو۔ حویلی کے بدلے ماحول کی!
وہ مزید اپنے من میں اٹھتے ان گنت شور مچاتے سوال دبا نہ سکی۔ سب پوچھ
ڈالا۔ بے شمار پابندیوں کی وجہ، مسز علی کا رویہ اور آخر میں جو بار بار حویلی
میں انہوں نے واقعات اسے ہراساں کر کے پاگل کرنے پر تلے ہوئے تھے!
انکل نے گہری سانس لی۔ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ اچانک بہت اجنبی سی

لگنے لگی تھی۔

”بیٹے۔ جہاں تک تمہیں حویلی میں ڈر لگنے کا سوال ہے۔ تو یہ سب تمہارے اکیلے پن کی پیداوار ہے۔ بھائی صاحب اس دنیا میں ہیں نہیں تو حویلی کے باہر درختوں میں یا پھر اپنی سٹڈی میں کیسے نظر آئیں گے؟ کوئی پراسرار عورت کو ریڈور میں سے گزر رہی تھی، تو جب تم نے خود اپنے ہاتھ سے مین دروازہ بند کیا تھا تو کو ریڈور میں کسی عورت کے چلنے پھرنے کا کیا سوال؟ رہی بات پابندیوں کی۔ تو یہ تو اُس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی...“

”میری شادی؟“ وہ پریشان سی بولی۔

ابھی تو اُس نے صرف اے لیو لڑی کیا تھا۔ اور پھر شادی تک یہ پابندیاں؟ اتنا لمبا عرصہ وہ اس قید و بند میں کیسے گزارے گی؟

”ہاں بیٹا! ہم نے طے کر لیا ہے کہ آنیوالے اتوار کو تمہارا نکاح پڑھا دیا جائے۔ تاکہ تمہارا اکیلا پن ختم ہو۔ تم آزادی سے گھوم پھر سکو۔ تمہارے املاک کو سنبھالنے والا بھی تمہیں مل جائے۔ اور میرا بھی وعدہ پورا ہو...“

وہ ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیسا وعدہ؟“ اُس کی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

”بھائی صاحب کے ساتھ کیا ہوا وعدہ۔ مرتے وقت انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ چونکہ اُن کے بعد تم تمہارا جاؤ گی۔ تو ایسا نہ ہو پیسے کی خاطر کوئی تمہاری زندگی کو نقصان پہنچائے۔ اسی لئے انہوں نے مجھ سے تمہارا نکاح سرفراز سے کرنے کی ریکوریسٹ کی تھی۔“

”ک... کون سرفراز؟“ وہ سمجھ نہیں پائی۔

”میرا بیٹا۔ اور کون؟“

اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انکل کو دیکھ رہی تھی۔

سرفراز بھائی۔ پہلے سے شادی شدہ، تین بچوں کے باپ، جہان بھر کے آوارہ اور کئی غلط کاموں میں ملوث!

”مگر وہ تو شادی شدہ ہیں۔ بچے ہیں اُن کے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مرد چار چار شادیاں کر سکتا ہے۔“

”مگر... میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ انکل کی بہت عزت کرنے کے باوجود وہ اس وقت بول اُٹھی۔

”یہ تمہارے پاپا کی خواہش تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری شادی غیروں میں ہو۔“

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

”مگر... میں سرفراز بھائی سے شادی نہیں کروں گی۔“

پاپا کو تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ بلکہ تاکید کی تھی کہ وہ آئیں تو شادی زیادہ سامنے نہ آئے اُن کے۔ شادی کا کیسے کہہ دیا؟

”اچھا۔ میں چلتا ہوں۔ ضروری تیاریاں بھی کرنی ہیں۔“ وہ اُس کی اُن سنی کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

”انکل میں یہ شادی نہیں کروں گی۔“ وہ ہمت کر کے ایک بار پھر بولی کہ۔

ایک شادی شدہ اور بدکار شخص کے ساتھ شادی کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ واپس مڑے۔ آنکھوں میں غیض و غضب اتر آیا تھا۔

”تم کون ہوتی ہو انکار کرنے والی۔“ وہ پھرتے ہوئے بولے۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ اُن کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ مگر۔ سرفراز کے ساتھ شادی؟ یہ بھی اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

”میری مرضی کے بغیر میری شادی نہیں ہو سکتی۔“

اور انکل نے تزاخ سے ایک تھپڑ اُس کے پھول سے گال پر جڑ دیا۔
 ”اب تمہارا باپ نہیں ہے تمہاری ہر جائز ناجائز سنتے کو۔ حیوانی کی طرح مسل
 کر رکھ دوں گا۔“

ساتھ ہی وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔
 گال سہلاتی وہ صوفے پر اونٹنی پڑ رہی۔ اُس کا ذہن ماؤف تھا۔ سوچتے
 بھگنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ بس آنسو تھے کہ تواتر سے بہہ رہے تھے۔
 حواسوں میں آئی تو چھہ بچنے کو تھے۔ آسمان کھل کر برسنے کے بعد اب مطلع
 صاف تھا۔ نیالی شام گھر آئی تھی، سردی در آئی تھی اور۔ حویلی کا اسرار سوا ہو گیا
 تھا!

اٹھتے ہوئے وہ واش روم گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے، واپس کمرے
 میں آئی اور شال کندھوں پر لٹتی بالکنی میں نکل آئی۔
 ڈھلتی شام کے دھند لکوں میں اُس نے دیکھا۔ یہاں وہاں اب بھی گارڈز
 کھڑے تھے۔

”آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے۔ اُس گارڈ کی آواز اُس کے کانوں میں
 گونجی۔“

انکل جہانگیر ہی اُسے poison کر رہے تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ
 اچانک اس قدر بدل گئے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ پاپا سے اُن کا خون کا رشتہ تھا۔
 لیکن۔ وہ اُسے poison کیوں کر رہے تھے؟ وہ تو اُس کا رشتہ اپنے
 بیٹے سے کرنا چاہتے تھے۔ پھر ایسا کرنے کا فائدہ؟

کیا پاپا نے واقعی اُن سے وعدہ لیا ہوگا۔ سرفراز سے اُس کی شادی کرنے کا؟
 اُسے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اُسے اُس کے ذلیل کر تو توں کی وجہ سے
 پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ پھر اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں کیسے دے سکتے
 تھے؟

”جیسے ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ کچھ دن قبل کی انکل جہانگیر کی
 فون پر کبھی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔“

کیا یہی مجبوری تھی پاپا کی؟ کیا دولت کی وجہ سے اُس کی زندگی کو لاحق
 خطرے کی بناء پر انہوں نے کم مہلت کے باعث یہی فیصلہ کر لیا تھا؟
 مانا کہ بالکل تنہا ہونے کی وجہ سے انہیں اُس کی شادی کر دینا ہی مناسب لگا
 ہوگا۔ لیکن۔ سرفراز سے؟

قریبی رشتہ داروں میں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ ماموں جان کے بھی دونوں
 بیٹے شادی شدہ تھے۔ پھر جب وہ دونوں اور سرفراز، سبھی شادی شدہ تھے تو تینوں
 میں سے انہیں سرفراز بہتر لگا ہوگا۔ کہ اپنے بھائی کا بیٹا جو تھا اور پھر۔ بقول
 انکل جہانگیر کے مرد چار چار شادیاں کر سکتا ہے۔ سرفراز قلبی سکون تو نہ دے
 سکتا تھا ہاں شاید اُس کے جائیداد کی حفاظت کر پاتا!

دور پار کا کوئی رشتہ دار بھی تو ہو سکتا تھا۔ لیکن پاپا کے پاس مہلت نہیں تھی۔
 گولی سینے میں لگی تھی اور ایسی حالت میں وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتے تھے۔
 ”پاپا آپ تو مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ مجھے کیسے جیتے جی مار سکتے
 ہیں آپ؟“ وہ خود سے بولی۔

’ذلیل اور غلیظ بہت دیکھے ہیں مگر سرفراز جیسا نہیں دیکھا۔ بدنصیب ہے اُس
 کی بیوی۔ اُس کے ساتھ شادی کرانے سے تو بہتر تھا خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا
 باپ اُسے۔ اچانک اُس کے کانوں میں پاپا کے الفاظ گونجے۔

’بدنصیب ہے اُس کی بیوی... اُس کے ساتھ شادی کرانے سے تو بہتر تھا
 خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا باپ اُسے... خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا باپ
 اُسے... مار دیتا باپ اُسے...‘

نہیں۔ پاپا اُس کی شادی سرفراز سے کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اُس کی
 بیوی کو اُس کے ساتھ شادی پر بدنصیب گردانتے تھے تو خود اپنی نور نظر کو کیونکر اُس

کے حوالے کر سکتے تھے؟

جھوٹ تھا یہ سب۔ انکل پاپا سے وعدے کا گھڑ کر اپنا اُلوسیدھا کرنا چاہتے تھے۔ باقی دنیا سے کہیں زیادہ وہ خود اُس کے پیسے کے چکر میں تھے۔

اس وقت اُس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کم عمر سی لیکن جائیدادوں کے لئے کئے گئے سنے سنائے واقعات سامنے آنے لگے۔ پھر کڑیاں ملائیں تو بھی یہی بات سامنے آنے لگی۔

اتنے بڑے حادثے پر بھی انکل کا منظر سے غائب ہو جانا کہ اُن کا نام آئے بغیر ہر ناروا سلوک اُس کے ساتھ روا رکھا جائے۔ پرانے نوکروں کا صفایا کر دینا تاکہ کوئی اُسے کچھ بتانہ سکے۔ اُس کا سیل فون غائب ہو جانا تو کہ وہ کسی ہمدرد کو اپنا حال نہ بتا سکے۔ مسز علی کی پراسراریت، کہ وہ ڈری سہی رہے اور حویلی کے باہر کڑا پہرہ تاکہ تنگ آ کر وہ بھاگ نہ کھڑی ہو!

بچھلے دنوں پاپا کے کمرے کے دروازے کا خود بخود کھل جانا، کسی عورت کا کوریڈور میں سے گزرتا، پاپا کا یہاں وہاں نظر آنا۔ گو وہ یہ معہ حل نہ کر پار ہی تھی مگر۔ مارے خوف کے وہ پل پل مر رہی تھی۔ اُسے شدید خواہش ہو رہی تھی کہ حویلی میں اُس کے ساتھ کوئی دوسرا ہمدرد موجود ہو اور۔

وہ ہمدرد انکل کو سرفراز کی شکل میں نظر آیا تھا!

کہیں... یہ سب بھی... انکل تو نہیں کر رہے تھے؟ مگر کیسے؟ وہ الجھ کر رہ گئی! ہر سورات پڑ پھیلا چکی تھی۔ سیاہ گٹھاؤں نے اس وقت پھر پورے آکاش کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اُس پار پہاڑوں کے اوپر بجلیاں ترپنے لگی تھیں اور۔ سردی شدید تر ہو گئی تھی!

گہری سانس لیتے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی آئی۔

نواز انگلیٹھی میں آگ جلا گیا تھا۔ کمرہ کوڑی ہو رہا تھا۔

وہ آگ کے قریب بیٹھ گئی۔ بڑی بڑی جلتی لکڑیوں پر نظریں جمائے وہ ہنوز

ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔

سرفراز سے وہ کسی طور شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مرنجانی مگر ایسا نہ ہونے دیتی۔ وہ یہاں سے فرار ہو جائے گی۔ گرچہ پہرہ بہت کڑا تھا۔ مگر۔ وہ نکلے گی، کسی بھی طرح!

رات ڈنر کے بعد وہ اپنے بیڈروم میں گئی۔ ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔ پھر الماری میں اپنے ہینڈ بیگ کا جائزہ لیا۔ چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ کچھ نقدی اور اپنے بینک اکاؤنٹ کا چیک بک بھی تھا۔ اچھی طرح تسلی کر چکی، تو صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وقت گزارنے کے لئے میز پر رکھا میگزین اٹھایا اور۔ اور اُراق پلٹنے لگی۔

اُس نے مین دروازے سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ کیونکہ گذشتہ تین دن سے مین دروازے کا چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید باقی چوکیداروں میں جاملتا تھا۔ ڈارک گرے شلوار قمیض میں ملبوس گارڈز بھی تو بے شمار تھے۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کون کہاں تعینات تھا؟

آج اُس نے نواز اور مسز علی کے جانے کے بعد وہ دروازہ اندر سے بند بھی نہیں کیا تھا۔ تاکہ نکلے تو کنڈی کی آہٹ نہ ہو۔

بارہ بج چکے تو اُس نے لائیٹ آف کی اور۔ آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ بچوں کے بل چلتی، سیڑھیاں اترتی وہ مین دروازے تک آئی۔ بالکل دھیرے سے دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھا۔ مگر دھک سے رہ گئی۔ وہ تو باہر سے بند تھا۔ اتنا عرصہ وہ خواہ خواہ بیوقوف بنتی رہی، خود آ کر دروازہ بند کرتی رہی۔ بہر حال۔

آج اُس نے تہیہ کر ہی لیا تھا۔ دروازہ چھوڑا اُس نے قریبی کھڑکی کھول لی۔ باہر اترتے ہوئے قدم زمین پر رکھے۔

”ہمیں پتہ تھا تم بھاگنے کی کوشش کرو گی۔“ مین دروازے کے پاس ہی

کھڑی مسز علی نے گرچہ دار آواز کے ساتھ اُسے آلیا۔ بازو سے پکڑا اور دروازے کا تالا کھولتے ہوئے واپس اندر گھسٹ لائی۔ ”جیسی آج دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا۔ ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں...“

چینتی چلاتی شانندانہ کو وہ دوبارہ اُس کے بیداروں میں لے آئی۔ غصے سے اُسے بستر پر دھکیلا۔ اور۔

شانندانہ سے مزید برداشت نہ ہوا۔ اٹھی اور۔ کس کر ایک تھپڑ مسز علی کے منہ پر رسید کر دیا۔

”تمہاری یہ ہمت۔“ مسز علی آتش پا ہو گئی اور۔

تزاخ تزاخ اُسے کئی چاٹنے دے مارے۔ پھر۔ کھٹ پٹ کرتی باہر نکل گئی۔

وہ سُن سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناز و نعم میں پٹی۔ آج تک کسی نے اُس سے زور سے بات تک نہیں کی تھی۔ اتنی انسٹ!

”پاپا۔“ اُس نے بے اختیار پاپا کو پکارا۔ اور پھر۔ اپنی بے پناہ بے بسی پر سرگھٹنوں پر رکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

دل کی بھڑاس نکال چکی۔ تو دواش روم گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اور خود کو سنبھالتی دوبارہ کمرے میں آ گئی۔

ایک بار پھر انگلیٹھی کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ اس جال سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ ایتوار میں صرف چار دن باقی تھے۔ وہ تیزی سے ذہن لڑانے لگی۔

اور۔ لمحے بیتتے چلے گئے۔

معا۔ کمرے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس منعکس ہوئیں۔

یقیناً انکل آئے تھے۔ اور یقیناً مسز علی نے انہیں ساری صورتحال بتادی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی سے کمرے کی لائیٹ آف کی۔

اور کبھی کبھی وہیں دروازے کے قریب کھڑی رہی۔

پھر۔ کوریڈور میں انکل اور مسز علی کے قدموں کی چھاپ ابھری۔

”ایتوار کو نہیں۔ کل ہی۔ صبح دس بجے نکاح ہوگا۔“ انکل کہہ رہے تھے۔ ”مگر دھیان رہے شانندانہ کے کانوں میں بھٹک بھی نہ پڑے۔“

”جیسا حکم۔“ یہ مسز علی تھی۔

ڈری ڈری سی وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ آئی۔ بستر میں گھس کر سوتی بنی۔

انکل دھڑام سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آ گئے۔ لائیٹ آن کی۔

”بھاگ رہی تھی۔“ بے دھڑک اُس کا لحاف کھینچ کر پرے ہٹاتے ہوئے وہ دھاڑے۔ ”ابھی چکھاتا ہوں بھاگنے کا مزہ۔“

اور پھر۔ اپنے ساتھ لائے چڑے کے بید سے اُسے اتار بیٹھا، ایسی بے دردی سے پیٹا۔ کہ وہ ہلنے جلنے کے بھی قابل نہ رہی۔ وہیں قالین پر پڑی رہی۔ جگہ جگہ زخموں سے خون رس رہا تھا مگر۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کوئی ہمدرد نہیں تھا اور۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

اب اُس کے آگے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ انکل کی بات مان لیتی، سرفراز سے شادی کر لیتی۔ یا پھر یہاں سے بھاگ نکلتی۔ لیکن۔ کوشش کی تو تھی بھاگنے کی۔ کتنا خوفناک انجام ہوا۔ پھر؟

صبح کے ڈھائی بج چکے تھے۔ دس بجے انکل نے اُس کے نکاح کا پروگرام بنایا تھا۔ وقت بالکل کم تھا۔ سوچنے میں وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

آریا پاپا۔ اُسے فیصلہ کرنا ہی تھا۔ یہاں سے نکلنا ہی تھا!

مجزہ ہی تھا کہ اُس نے انکل کی بات سن لی تھی۔ نہ سنی ہوتی۔ تو کم از کم اس وقت ایسی حالت میں وہ دوبارہ نکلنے کا سوچ تک نہیں سکتی تھی۔

باہر گپ اندھیرا تھا۔ تیز بارش اور آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بجلی بھی

فیل ہو گئی تھی۔ اُسے اس قدر مار پڑ چکی تھی۔ کہ کم از کم مسز علی یا کوئی اور اتنی جلدی دوبارہ اُس سے فرار ہونے کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے ہمت کرنی ہی تھی۔ قسمت یا در ہوئی تو کامیاب ہو جائے گی۔ نہ ہوئی تو خود کو پھندے سے لٹکا لے گی مگر سرفراز سے شادی نہیں کرے گی۔

اُس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر۔ زخموں کی وجہ سے اُس کا رِواں رِواں درد کر رہا تھا۔ فقاہت الگ محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں کیا وہ اتنی ہمت کر لے گی؟ لیکن دوسری صورت میں سرفراز!

No way۔ حوصلہ مجتمع کر کے وہ اٹھی۔ نہ یہ زخموں سے کراہنے کا وقت تھا اور نہ ہی کچھ اور سوچنے کا!

پھر۔ اُسے حیرت ہوئی۔ اُس میں اچانک طاقت آگئی تھی۔ شاید نہایت بھیانک انجام کے ڈر سے، سرفراز سے!

اُس نے جلدی جلدی اپنے جو گرز پہنے، شال لپیٹی اور الماری میں سے اپنا ہینڈ بیگ نکال لیا۔ اب کے وہ مین دروازے کی طرف نہیں گئی۔ نا ہی اپنی بالکنی کا سوچا۔ کہ وہاں سے بھی اُس کے فرار کی توقع کی جاسکتی تھی۔ نہایت آہستگی سے چلتی درمیانی راہداری عبور کرتی پچھلی طرف مہمان خانے میں آگئی، پھر دھیرے سے اُس کی بالکنی میں۔ اُرد گرد دیکھا۔

ہر سو ہو کا عالم تھا۔ چاروں اور تارکیاں تھیں، تیز و تند بارش تھی اور۔ ہڈیوں کو چیرنے والی سردی!

گوگپ اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی پتہ چل رہا تھا کہ بارش اور آندھی کے طوفان کی وجہ سے کوئی بھی چوکیدار اپنی پوزیشن پر نہیں تھا۔ اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ جلدی جلدی اپنا دوپٹہ بالکنی کے ریلنگ سے باندھا اور اُس سے لٹک گئی۔ نیچے نظر ڈالی، چھلانگ لگانے کے لئے فاصلے کا اندازہ کرنے لگی۔

تبھی۔ دو مضبوط ہاتھ آگے بڑھے، اُسے تھاما۔ اور نیچے زمین پر کھڑا کر

دیا۔

خوف کے مارے اُس کی چیخ نکلنے کو تھی کہ اُس نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسی سیدھ میں چلتی جاؤ۔ لفٹ سائیڈ پر بالکل مت ہوتا وہاں دونوں برآمدوں میں گارڈز ہیں۔ براؤنچ روڈ پر میں انتظار کروں گا۔ کوئیک“۔ اُس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہی گارڈ تھا۔ صبح والا۔ اُس نے اُس کی آواز پہچان لی۔

جو بھی تھا۔ مگر تھا اُس کا ہمدرد۔ مزید کچھ سوچے بنا وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔

یہ سروس کا ایریا تھا۔ حویلی کے سامنے کے گیٹ کے علاوہ یہ واحد راستہ تھا، جو کھلا ہوتا تھا اور جو ملازموں کے علاقے کو براہ راست باہر کی دنیا سے ملائے رکھتا تھا۔

پاپا کے دفتروں میں اس راستے پر بھی مسلح پہرے دار تعینات تھا۔ مگر اس وقت سروسٹ کو ارٹھرڈ ویران پڑے تھے اور۔ پہریدار۔ ظاہر ہے برطرف کر دیا گیا تھا!

براؤنچ روڈ یہاں سے فرلانگ بھر پر تھی۔ مگر اُس کی اپنی حالت اتنی خراب تھی۔ کہ تیز چلنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ قدم قدم پر گارڈز اور مسز علی کا خطرہ الگ! بارش میں بھسکتی، بخ بستہ جھکڑوں کے پھیڑے سستی، زخموں سے پور، وہ سڑک کے کنارے پہنچتے ہی وہیں بے سدھ ہو کر ڈھیر ہو گئی۔

تبھی۔ وہ گاڑی پاس لایا۔ غلت میں اُسے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھاتے ہوئے گاڑی کی پستبرزیٹ پر ڈالا، اور ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہوئے گاڑی شارٹ کر دی۔

وہ ہوش میں تھی۔ اُس کے من میں اُس سے پوچھنے کو بے شمار سوال تھے۔

کون تھا وہ؟ بات چیت، نقل و حرکت سے وہ کوئی گاڑی ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔
 خطروں اور بھول بھلیوں میں گھری اس حویلی میں کیا کر رہا تھا؟
 مگر اُسے ویکٹنس اور تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ وہ بولنے پر قادر نہیں تھی۔
 سیٹ کی پشت سے سر نکائے بے حال پڑی تھی۔

سڑک پر نظریں جمائے وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ گاہے گاہے ایک نگاہ
 شاندا نہ پر بھی ڈال لیتا۔ اُس کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ اور چہرے
 کے زخموں پر جیسے ہوئے خون کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

شندی نے شاید پہلو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کراہ منہ سے نکل گئی۔
 ”بہت مارا ہے نا اُس نے تمہیں“۔ اُس کی آواز میں بھی Concern تھی۔
 اُسے کیسے معلوم ہوا؟ شاید اُس کی چیخوں کی آواز سن لی تھی۔

”ہاں“۔ وہ دھیرے سے بولی۔ خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔
 اُس نے گہری سانس لی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ صبح کے چار بج چکے تھے۔

وہ چلتا چلا گیا۔ اُسے اُس کی تکلیف، گیلے کپڑوں اور دیگرگوں حالت
 کا اندازہ تھا۔ مگر اُس کی جائے قیام بھی خاصی دور تھی۔ اور یہی اُس کے حق
 میں بہتر تھا۔ جتنا وہ اُسے اُس کے شہر سے دور لیجاتا اتنا ہی اچھا تھا۔

”آپ... کون ہیں؟“ اچانک شندی کی نڈھال مگر تجسس بھری آواز
 ابھری۔

”میں“۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ ”گاڑی... تمہارا گاڑی“۔ وہ بالکل صبح کی
 طرح بولا۔ کہ اس تمام دوران وہ اُس کی رکھوالی ہی تو کر رہا تھا!
 اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر بھی مضحکہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ بہت
 سارے دن بعد!

اونچائی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ چکر دار موڑ بھی۔ دائیں طرف
 اونچی چٹی ہری بھری پہاڑیاں تھیں، بائیں جانب دریا کا سیس پانی۔

پہلے پہر کے غنماتے تارے نیلگوں روشنی بکھیر رہے تھے۔ پیٹر، پہاڑ، پانی،
 سبھی اجاگر ہونے لگے تھے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ سجدہ ریز اور پاکیزگی شاء خواں تھی!
 اُس نے بھی گاڑی آہستہ سے ایک موڑ کے کنارے پر روک لی۔ ایک نظر
 شندی پر ڈالی۔ زخموں سے چور آنکھیں موندے غالباً سو رہی تھی۔
 وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اپنے رب العزت کے حضور جھکا، سر بسجود ہوا، اُس کی بے
 پناہ عنایتوں کا شکر بجالایا اور۔ ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔

ہری بھری پہاڑی پر چھوٹے سے ایک گاؤں کے اوپر تلے واقع ٹین کی
 چھتوں والے کچے کچے مکانوں سے صبح کی پکوان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ چھوٹی
 چھوٹی ٹیرسڈ کھیتیاں اجاگر ہو گئی تھیں اور۔ ڈھور ڈھنگ جاگ اٹھے تھے!

دائیندگ سڑک پر نظریں جمائے وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔
 اب شہر کی آبادی بھی نظر آنے لگی تھی۔ بازار، بینک، ہوٹلوں اور رہائشی علاقے!
 وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ آبادی ایک بار پھر پیچھے رہ گئی تھی۔ گہرے سبز
 پیٹروں سے لدی پہاڑیاں ایک بار پھر قطار در قطار در آئی تھیں۔

کوئٹہ کی پتلی سیاہ سڑک پر چند موڑ کاٹتا۔ وہ آہستہ سے گاڑی ایک بہت
 بڑے نئے تعمیر شدہ پرائیویٹ ہسپتال کے اندر لے گیا۔

یہیں وہ کنسلٹنٹ سرجن تھا۔ شاف شاندا نہ کو جلالت سے اندر لے گیا۔
 اُس کی مرہم پٹی ہوئی۔ ہسپتال کے صاف سترے کپڑے پہنائے گئے،
 اور اوپر کی منزل پر روم نمبر 4 میں لایا گیا۔ ہسپتال کے اپنے ڈاکٹر کی پیشفت تھی
 اس لئے اور بھی زیادہ توجہ دی جا رہی تھی۔

گھنٹہ ڈیڑھ بعد یا درخان خود بھی آ گیا۔ ڈاکٹر گرے قیمتی سوٹ پر سفید
 اوور آل پہنے تھا۔

وہ بائیں جانب بستر پر لیٹی تھی۔ چہرہ بہت کمزور اور خود نڈھال لگ رہی تھی۔

ایک نرس پاس کھڑی تھی۔ اُسے آتے دیکھ کر مؤدب طریق سے ایک طرف ہو گئی۔

”کیا حال ہے مہم؟“ وہ اُس کے بیڈ کے قریب آتے ہوئے خندہ پیشانی سے بولا۔

وہ صرف مسکرا دی۔ نقاہت سے۔

نرس نے اُس کا Vital chart یاد خان کے آگے کر دیا۔

”سر سچر بھی آئے ہیں۔ پورے جسم پر زخموں کے نشان ہیں۔“ نرس آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

”ہوں۔“ اُس کی نظریں چارٹ پر لگی تھیں۔ ٹیرپچر 100 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ بی پی نارمل تھا۔ اور...

”سر۔ ڈاکٹر نادرنے یہ دوائیاں لکھی تھیں۔“ نرس نے ایک جوئیر ڈاکٹر کا حوالہ دیتے ہوئے شاندارانہ کی کیس ہسٹری کا فائل کھول کر اُس کے سامنے پکڑا۔

”پھر بھی وہ کہہ رہے تھے کہ آپ سے بات کریں کہ آپ کیا Suggest کرتے ہیں۔“

وہ فائل پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دوائیاں صحیح تھیں۔ مگر۔ اُس نے سسٹر سے فائل لے لی۔ ایک اینٹی بائیوٹک بدل کر اُس کی جگہ دوسری لکھ دی۔ ڈائمیٹ بھی لکھ دی۔ پھر فائل نرس کو تھما دی۔

اُس نے شاندارانہ کے سر ہانے دائیں جانب ٹرائی پر نظر ڈالی۔ بریک فاسٹ جوں کا توں پڑا تھا۔

”مہم۔ تم بریک فاسٹ نہیں کرو گی۔ تو سسٹر تمہیں خالی پیٹ دوا کیسے دیں گی ہوں۔“ اُس کی حالت پر اُسے تشویش اور لب و لہجہ میں شفقت اور اپنائیت تھی۔

”جس لیا ہے۔“ وہ ہولے سے بولی۔

وہ مسکرا دیا۔ خوشگوار سے۔

”صرف جس سے کام نہیں چلے گا۔ اور آئندہ تمہیں مریضوں والا پرہیزی کھانا نہیں ملے گا۔ You are not ill خوب کھاؤ پیو تا کہ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ ریمیٹ؟“

نرس دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر خان اپنی پیسٹ سے خاصی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ فائل پر ڈائمیٹ تک خود لکھ دی تھی۔ شاید جاننے والی تھی کوئی۔

”سسٹر۔ میڈیسنز، جلدی پلیز!“ وہ پلٹ کر نرس سے بولا۔

اور نرس غلٹ سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دنوں بعد شندی کا خوف دور ہوا تھا۔ تنہائی کے عذاب سے چھٹکارا ملا تھا۔ رِوَاں رِوَاں درد کر رہا تھا پھر بھی اطمینان نصیب ہوا تھا۔ مگر ذہن میں کئی سوال اب بھی سر اٹھا رہے تھے!

یاور خان اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر آئے زخموں پر نظریں دوڑانے لگا۔

اُس کے بہت خوبصورت چہرے پر نیل پڑ گئے تھے۔ ماتھے اور گردن پر زخم آئے تھے۔ بائیں آنکھ لہو لہان ہو رہی تھی۔ کس بے دردی سے مارا تھا اُس کے چچانے اُسے!

غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اُس کے پہلو میں رکھے ہاتھ کے نبض پر گیا۔

”اوہ... مائے... گوڈ!“ ایک کراہ کے ساتھ بے اختیار شندی کے منہ سے نکلا۔

”سوری۔ کیا ہوا؟“ سخت نادم ہوتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مارے تکلیف کے اُس کی حسین آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”زخم نے یہاں بڑا سا۔“ شندی کا اشارہ اپنے پہلو کی طرف تھا۔ یاور خان نے اُس کی نبض دیکھنا چاہی تھی تو ہاتھ زخم سے چھو گیا تھا۔

”میرا نام شاندانہ ہے۔“

”I see۔ لیکن میں نے احتیاطاً یہاں تمہارا نام نیلو فر لکھوایا ہے۔ یاد

رکھنا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ نرس سے سن چکی تھی۔ اور مصلحت بھی جان گئی تھی۔

”اچھا، میں شاندانہ۔ اب میں جاتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

پھر اُس پر کمبل درست کیا، اُس کے بیڈ سے لگے ریموٹ کنٹرول سے اُس کے بستر کا سرہانا اونچا کیا، سرہانے لگی ٹرائی اُس کے قریب کی، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اُس کے قریب رکھا۔

”تم ناشتہ کرو۔ ٹی وی دیکھو۔ کوئی ضرورت ہو تو یہ بٹن لگے ہیں۔“ اُس نے اُس کے سرہانے دیوار پر لگے بٹنوں کے پورے پیلر کی طرف اشارہ کیا۔

”انہیں استعمال کرو۔ میں آج بڑی ہوں۔ آپ ریشتر کروں گا۔ شاف تمہارا خیال رکھے گا۔ ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اُسے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ چلے گیا۔ اور شندی آہستہ آہستہ ناشتہ کرنے لگی۔

نرس نے آ کر اُسے دوائیاں کھلائیں، اُس کا بستر دوبارہ سیدھا کیا، کمبل درست کیا، اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کمرہ قدرے زیادہ گرم ہو رہا تھا۔ شندی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے

Heat کم کی۔ اور لیٹتے ہوئے جلتی دکھتی آنکھیں موند لیں۔

یہ ڈاکٹر کون تھا؟ کتنا مہربان تھا! سوچتے سوچتے اُسے غنودگی نے آیا۔

اُسے کھانسی شروع ہو گئی تھی۔ ٹیبلٹ بھی تھا۔ اس دوران بار بار نرسیں آئیں،

جونیر ڈاکٹر آئے، ڈائبلینڈ آئی، سبھی اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ شندی

ڈاکٹر خان کی پشیمت تھی وہ اپنی جگہ۔ مگر امیر کین قواعد و ضوابط کے طرز پر چلتے اس

”oh—I'm awfully sorry...“ قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے وہ مزید

آپ سیٹ سا بولا۔

”Don't be, you have been so kind.“ غم آنکھیں لئے

وہ مسکرا دی۔

”تمہاری دوائیں شروع ہو جائیں گی۔ تو تم بہتر ہو جاؤ گی۔ تمہاری کچھ Investigations بھی کروانی ہیں۔ اُن کی بھی جلدی ہی رپورٹس آ جائیں گی۔ پھر...“

”آپ بتائیں گے نہیں آپ کون ہیں؟“ وہ بہر حال جاننے کو بے تاب تھی۔ اُس کی بات کا نٹے ہوئے بولی۔

”اوہ۔“ وہ مسکرا دیا، خوبصورتی سے۔ ”میرا نام یاد رہے۔ یاد رکھیے خان۔ میں اسی ہوسپتال میں کنسلٹنٹ سرجن ہوں۔ وہ میرا گیٹ آپ تھا۔“ اُس کا اشارہ اپنے چند کھٹے قبل کے گارڈ کے جیسے ڈارک گرے شلوار قمیض کی طرف تھا۔ ”اور یہ میری اصلی شکل ہے۔“ اُس نے اپنے سر اپنے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اُس کے لب و لہجہ میں شرارت سی تھی، انداز دوستانہ سا!

اُسے اچھا لگا، دنوں بعد کوئی ساتھی سا ملا تھا!

وہ اُس تک کیسے پہنچا تھا؟ اُس کے حالات کا اُسے کیسے پتہ چلا تھا؟ وہ پوچھنا چاہتی تھی بہت ساری باتیں۔ گویا تیں کرنے میں اُسے بہت ویکٹس محسوس ہو رہی تھی مگر۔

”آپ... مجھے جانتے تھے؟“ اُس نے ابتدا کرنا چاہی۔

”نہیں۔ اپنا نام تو بتاؤ۔“

اُس کے انداز پر وہ بے اختیار ہنس دی۔ ساتھ ہی زخموں میں تکلیف بھی ہونے لگی۔

یاد رکھنا نے دیکھا اُس کے دانت بہت خوبصورت اور ہنسی بہت دلکش تھی۔

ہوسپٹل کا نظام ہی ایسا تھا۔ ہر دم ہر لمحہ، ہر مسیحا انرٹ۔ کوئی پرابلم، کوئی کمپلیٹ منہ سے نکلتے ہی حل کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی تھی۔

شام کے ساڑھے چار بج چکے تھے، اُس نے اپنا سر ہانا اونچا کیا اور آہستہ سے کروٹ سامنے کی چوڑی سی خوبصورت کھڑکی کی طرف لے لی۔ گہری سبز ہری بھری پہاڑیاں یہاں سے بھی جھانک رہی تھیں۔

وہ Resist نہ کر سکی۔ کوشش کر کے بستر سے اٹھ آئی۔ جسم اب بھی کپکپے ہوئے دانے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

دور اُس پار اونچی گہری سبز پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اور پھر۔۔۔ قطار در قطار کئی سلسلے۔ ہر سلسلہ پچھلے سے کم اونچا۔ حتیٰ کہ آخری درختوں سے لدا سلسلہ ہوسپٹل کے پاس آ کر ختم ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ ایک بڑے سے ہرے بھرے پیالے کے پینڈے میں ہوسپٹل بنا دیا گیا تھا۔

گہری سبز پہاڑیوں میں کہیں کہیں سفید بادل بھی در آئے تھے۔ یہاں وہاں کچھ عمارتیں بھی چھٹی نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہ وہیں کھڑی قدرت کے لازوال حسن سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر تھک کر واپس بستر پر آ گئی۔

اتنی ہی دیر میں وہ بے طرح ٹھہرا ہوا مٹی تھی۔ بستر پر لیٹی وہ اپنی سانسیں درست اور کر اہیں روکتی رہی۔ قدرے آرام آیا۔ تو سامنے لگائی وی آن کر لیا۔

تبھی۔۔۔ شام کی چائے آ گئی۔ یونیفارمڈ وارڈ بوائے نے ٹرے ٹرائی پر رکھی۔ اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

ٹی وی پر پروگرام اتنا انٹرسٹنگ تھا کہ وہ ارد گرد سے بے نیاز ہو گئی۔

پورا پروگرام ختم ہوا۔ تو دلیوم بند کرتے ہوئے ریوٹ بائیں جانب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اُس نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ کبیل ٹھیک کیا۔

اور سر بستر کی پشت سے نکالیا۔

تبھی۔۔۔ اُس کی نظر دائیں طرف ٹرائی میں لگے چائے کے برتنوں پر پڑی۔

اوہ۔۔۔ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہوگی!

اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر پکچن ڈائل کیا۔

”کیا مجھے گرم چائے مل سکتی ہے پلیز!“

سوری نیم۔ ٹائم آپ ہو چکا ہے۔ ٹی ٹائم صرف ساڑھے چار سے ساڑھے

پانچ تک ہوتا ہے۔ بہت مودب طریق سے جواب آیا۔

جھنجھلاتے ہوئے اُس نے ریسپورڈاپس رکھ دیا۔

اُسے حیرت ہوئی۔ عرصہ بعد وہ یوں جھنجھلائی تھی جیسے پاپا کے دنوں میں کسی

بات پر جھنجھلاتی تھی۔ غصہ البتہ اُسے بہت کم آتا تھا۔ وہ بہت صلح جو اور امن پسند

واقع ہوئی تھی۔

اور پھر۔۔۔ اُسے دکھ سا ہوا۔ پچھلا عرصہ اُس نے کیسے چپ چاپ ہر بات،

ہر کام، ہر واقعہ خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔ نہ کبھی اپنی مرضی سے کچھ مانگا، نہ

کبھی اپنی مرضی سے کچھ کیا۔ بس جو مل گیا، جیسے ہو گیا۔ چپکے سے قبول کر لیا۔ مسز علی

کی بد تمیزیاں، حتیٰ کہ اُس کی مارتک اُس نے سہہ لی تھی۔

شاید اس لئے کہ وہ بالکل اکیلی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ بے بس تھی۔ بلکہ

شاید اس لئے کہ اُسے انکل جہانگیر کا انتظار تھا کہ جن کے آنے کے بعد سب

حالات نے خود بخود درست ہو جانا تھا!

ہاں یہی بات تھی! اُسے اُنہی کا انتظار تھا مگر۔۔۔

وہ آئے تو اُس نے جلدی سے خیال جھٹکا۔ وہ اُن مخوس گھڑیوں کے بارے

میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اُس بھیا تک ماحول سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ

ان خوشگوار لمحوں میں جینا چاہتی تھی۔ خوشگوار لمحے۔ انجانے، نا آشنا سے۔ جن کا

انجام بھی اُسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن دل کو جیسے یقین تھا۔ کہ اُسے عزت اور

”ہاں۔ لگتا ہے۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”سٹر۔ پلیز ان کے لئے چائے کا کھدیں۔“ وہ نرس سے مخاطب ہوا۔

”جی سر۔“ وہ مؤدب طریق سے بولی۔ اور باہر نکل گئی۔

”تو۔ میم صاحب۔“ بے تکلفی سے کہتے ہوئے وہ حسب سابق اُس کے

بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ ”تمہیں پتہ ہے تمہیں مایمیز نمونیا ہوا ہے۔“

”نوسر۔ مجھے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ بھی دوستانہ انداز میں بولی۔

”ابھی میں نے آپ سے بہت ساری باتیں پوچھنی ہیں۔“

وہ دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ اُسے اچھا لگا۔ ایک بار پھر دلنشیں انداز میں ہنس

دیا۔

”میں۔ بہت بہت بہت تھکا ہوا ہوں۔ مجھے سخت آرام کی ضرورت ہے۔“

بات ٹالنے کا طریقہ اچھا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”میں واقعی تھک گیا ہوں۔ آج لگا تار تین آپریشن کئے ہیں۔ اب گھر

جاؤں گا تو ریٹ کروں گا۔“

”آپ کا گھر کہاں ہے؟“

”یہاں سے چار پانچ میل پر ہے۔“

”پھر... آپ صبح آئیں گے؟“ وہ کچھ متکثر سی لگنے لگی۔

”ام م۔ نہیں۔ آج میں رات کو بھی راؤنڈ لگاؤں گا۔ جن پیشکش کا

آپریشن ہوا ہے اُنکو دیکھنے آؤں گا۔“

”یہاں بھی آئیں گے؟“ اُس کا اشارہ اپنے کمرے کی طرف تھا۔

وہ اُس کی پریشانی بھانپ گیا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ میں اپنا فون نمبر دیتا ہوں۔ جب

چاہو مجھے کال کر سکتی ہو۔“ وہ اُس کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بیڈ سائیڈ

ٹیبلی پر سے کاغذ اٹھانے لگا مگر۔

پروٹیکشن دی جائے گی۔ خلوص اور شفقت ملے گی!

چھ بچ چکے تھے۔ اُس نے کھڑکی کے اُس پار نگاہ ڈالی۔ پریتوں کے پیڑوں

پر شام اتر آئی تھی۔ اکا دکا عمارتوں میں روشن بیتیاں درختوں میں سے چھنٹیں

اسرار سا جگہ رہی تھیں۔ قدرت کا حسن لازوال ہو گیا تھا!

تبھی۔ دستک ہوئی اور۔

ڈاکٹر خان اندر آ گیا۔ ساتھ میں نرس بھی تھی۔ نرس نے کمرے کی لائیٹ

آن کر لی۔

”کیا حال ہے میم۔“ وہ پاس چلا آیا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”ٹھیک تو نہیں ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”ٹمپر پچر بھی ہے اور کھانسی بھی شروع ہو گئی

ہے۔“ وہ نرس کے ہاتھ میں پکڑا چارٹ دیکھ چکا تھا۔

وہ مسکرا دی۔ اُس کے بے تکلف لب و لہجے سے اُس کی بھی جھجک دور ہو رہی

تھی۔

”ایسا تو ہونا تھا۔“ وہ پھر خوشگوار سے بولا۔ ”تم بارش میں بہت بھیگ گئی

تھیں۔“

وہ نظریں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔

یا درخان کی نظر قریب ہی ٹرائل میں چائے کے برتنوں پر مچی۔

”چائے کیوں نہیں پی؟“

”میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ خیال نہیں رہا۔ دیکھا تو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

اور منگوانے لگی تو جواب ملا۔ Time is up...“

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

”تو یہ بات ہے۔ ویسے آئندہ تمہیں ہمارے ہسپتال کے ڈسپلن کو Follow

کرنا ہوگا۔“

”اوہ نو“۔ اُس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ”یہاں تمہارا زخم ہے۔۔۔“

اس وقت پھر اُس کے لب و لہجے میں بے تکلفی کے ساتھ شرارت سی بھی تھی!

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ اُس نے اپنے زخم پر پہلے ہی ہاتھ رکھ دیا تھا۔

وہ اٹھا۔ بیڈ کے گرد گھومتے ہوئے اُس کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر آیا۔ اور کاغذ پر

اپنے پین سے اپنے سیل فون کا نمبر لکھ کر رکھ دیا۔

”اور ہاں۔ تمہیں جو جو چیزیں چاہئیں۔ اُن کی لسٹ بتاؤں۔ رات میں

اپنے پیشکش دیکھنے آؤں گا تو تم سے Collect کر لوں گا۔ کل تک ہر چیز

تمہیں مل جائے گی، ریمیٹ؟“ وہ شفقت اور اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

اُسے معلوم تھا۔ وہ صرف ایک جوڑا کپڑوں میں آئی تھی اور بس!

وہ ممنون نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر ذہن میں سوال مچلا۔

”آپ... آپ...“

”کون ہیں؟“ اُس نے شرارت سے اُس کی بات پوری کی۔

ہاں۔“ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”کل بتاؤں گا۔ آج بالکل ہمت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔“

”جی۔“ وہ بھی مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

تبھی۔ وارڈ بوائے ٹرے میں چائے کے برتن سجائے آ گیا۔

”اچھا۔ تم چائے پیو۔ میں چلتا ہوں۔“ اُس نے جانے کے لئے قدم

بڑھائے۔ "I'll see you soon Good night."

”گڈ نائٹ“۔ شندی نے کہا۔

وہ چل دیا۔ اور شندی ایک بار پھر ٹی وی پر نظریں جماتے ہوئے گرم گرم

چائے کے کھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔

دھیان گا ہے گا ہے بھلک کر ڈاکٹر خان کی جانب چلا جاتا۔ بیس تینتیس سال

کا خوش اخلاق اور باوقار آدمی تھا۔ بے تکلفی سے بات کرتا تھا جیسے عرصے کی جان

پہچان تھی۔ And ... he was so damned handsome۔

مانتا پڑا۔ لہذا قد، چھوڑے شانے، گندی رنگ پر بڑی بڑی جیٹ بلیک بولتی

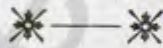
آنکھیں، پرکشش نقوش اور۔۔۔ دلچسپ باتیں!

سات بجے ہی ڈنر آ گیا۔

کھانے کے بعد اُس نے اپنی ضرورت کی چیزوں کی لسٹ بنائی۔ ساتھ

میں کچھ رقم رکھی۔ نو بجے ڈاکٹر خان آیا۔ اُس کے حوالے کی اور۔

دوائیاں لیکر، لایٹ آف کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔



شندی ناشتہ کر چکی تھی، صاف سترے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے لیٹی تھی۔
کل سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔
مگر ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی پچھلے واقعات نظروں
میں گھومتے۔ تو کبھی آئندہ کی فکر لاحق ہوتی۔ کبھی خوبصورت چہرے پر تشویش کے
سائے لہراتے۔ تو کبھی ماند چہرے کو اُمید کی کرنیں روشن کر جاتیں۔
دس بج رہے تھے۔ دھیان بنانے کو اُس نے ٹی وی آن کر لیا۔ بالکل مدہم
والیوم پر مختلف جھنڈو چیک کرنے لگی۔
تبھی ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ شاف بھی ساتھ تھا، ایک لیڈی ڈاکٹر
بھی تھی۔

”گڈ مورننگ مِم“۔ ہشاش بشاش یاور خان بولا۔ ”مورننگ“۔
ریموٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر محتاط سی ہو
بیٹھی۔

نرس نے یاور خان کو شندی کے بارے میں بریف کیا۔
رات کو نمبر سچر کافی اوپر چلا گیا تھا۔ صبح کو کم ہو گیا تھا۔ اُس کا بلڈ سیسل وغیرہ
بھی Investigation کے لئے لیا جا چکا تھا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا۔
”How do you feel now?“ اُس نے شندی سے پوچھا۔

”I'm much better“۔

”یہ۔ ڈاکٹر نادیا ہیں۔“ یاور خان نے اپنے ساتھ آئی ڈاکٹر کا اُس سے
تعارف کروایا۔ ”اور ڈاکٹر یہ میری پیسٹنٹ نیلوفر ہے۔ جس کا کل میں نے آپ
سے ذکر کیا تھا۔“

اُس نے اپنے کونٹیکٹ کو بھی بتایا تھا۔ کہ وہ اُسے روڈ سائیڈ پر زخمی پڑی ملی تھی۔
”ہیلو“۔ شندی خوش اخلاقی سے بولی۔
ڈاکٹر نادیا نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی۔
”ہیلو“ وہ لاپرواہی سے بولی۔ جیسے وہ اتنی اہم نہ تھی کہ ڈاکٹر خان اُس سے
اُس کا تعارف کرواتا۔

بہر حال۔

ڈاکٹر خان نرس کو شندی کے بارے میں کچھ ہدایات دیتا، سب کے ساتھ
باہر نکل گیا۔

شندی نے ایک بار پھر ٹی وی پر نظریں جمادیں۔ دیکھتے دیکھتے اُسے اچانک
خیال آیا۔

ڈاکٹر نادیا کے رویے سے اُس کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار جھلک رہا تھا۔
کیوں تھا ایسا؟

بستر پر لیٹ گئی۔

کپڑے بہت خوبصورت اور ڈینٹ تھے۔ پلین قمیض کے گلے اور سٹول کے بارڈر پر مردوں، مسٹرڈ اور بلیک شیڈز میں قمیض ایمر اینڈری ہوئی تھی، انہی رنگوں میں دھاری دار شلوار تھی اور سائز۔ اس قدر صحیح کہ اُسے حیرت ہونے لگی۔

بہر حال۔ صاف سترے کپڑے پہن کر اُس کی طبیعت بشاش ہو گئی۔ قدرے تازہ دم ہوئی۔ تو سر ہانے رکھی! پورنڈ چوکیٹ نکال کر کھاتے ہوئے ایک بار پھر ٹی وی دیکھنے لگی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ پہاڑیوں کے گھنے جنگلوں میں بادل تیر رہے تھے، شام وقت سے پہلے اندھیری ہو رہی تھی، اور۔ چار سو برکھارت چھا گئی تھی! کھڑکی سے ہٹ کر اس طرف آتے ہوئے اُس نے لائیٹ آن کی۔ اس وقت وہ کافی اچھا محسوس کر رہی تھی۔ کھانسی البتہ پریشان کر رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ فریج کے اوپر رکھی بوتل کھول کر گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

تبھی۔ دستک کے ساتھ ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔
”گڈ ایوننگ میم“۔ اُس نے بشاشت سے کہا۔
”ہائے“۔ اُس نے بوتل واپس رکھ دی۔

وہ اُس کے بیڈ کے قریب رک گیا۔
آج وہ اُسے پہلی بار بستر سے باہر نظر آئی تھی۔ سروقد، چھریا بدن، کمرنگ کھنے ڈارک براؤن بال، بیضوی چہرہ، سفید سفید رنگت پر گرے بلو بڑی بڑی آنکھیں، پیاری سی ناک۔ بے حد حسین پاؤں کی انگلی میں چمکتا نازک سا سنہری چھلا، مدھر پرفیوم کی اروما نکھیرتا گرلیں فل سراپا۔ اُسے وادی یمن کے

کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس نے کندھے جھٹکے اور ٹی وی دیکھنے میں محو ہو گئی۔
تھوڑی ہی دیر بعد نرس آئی۔ ہاتھوں میں چند بڑے بڑے شوپنگ بیگز تھے۔
”یہ ڈاکٹر خان کا ڈرائیور دے گیا ہے“۔ وہ خوش اخلاقی سے بولی۔
”اوہ“۔ تو یہ اُس کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ کتنا کیئرنگ، کتنا ہمدرد انسان تھا ڈاکٹر خان! وہ اُس کے احسانوں تلے دبی جا رہی تھی۔ ”سسر پلیز! انہیں الماری میں رکھ دیں۔“

سسر نے سب بیک الماری میں رکھ دیئے۔ پھر اُسے خوشگوار سی سائیل دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ احتیاط سے بیڈ سے اتر آئی۔ اب اُس کے زخموں کی ٹیسیں کافی کم ہو گئی تھیں۔ ٹیپر پیچ بھی کم ہو گیا تھا۔ کھانسی البتہ اُسی طرح تھی۔
اُس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے سب چیزیں بیگز سے نکال کر بیڈ پر رکھ دیں۔

چند بہت پیارے سوٹ، ٹائیٹ سوٹ، سویٹر، شال، شوڈ، سلیرز، ہینڈلرش۔ پھر کوئی، چوکیٹس، Marzipan، اور کئی چھوٹی موٹی چیزیں۔ اس کے علاوہ الیکٹرک کیبل، دو مگ، چمچ، ٹی بیگز، شوگر کیوبز، کنڈسنڈ ملک اور میگزینز! اُسے حیرت سی ہوئی۔ یہ چیزیں اُس نے نہیں منگوائی تھیں۔
پھر؟

ڈاکٹر خان نے خود سے شامل کی تھیں؟

اُسے بے اختیار وہ بہت Nice لگا۔ بہت چھینک فل نظر آنے لگی اُس کی۔
اُس نے چیزیں بیڈ کے دائیں جانب الماری میں سجا دیں۔ کیبل، کوئی اور چائے کا سامان دوسری طرف کھڑکی کے کونے والی چوٹ پر رکھ دیئے۔

پھر۔ کپڑوں میں سے ڈارک گرین سٹول نکال کر کپڑے تبدیل کئے۔ Straight خوبصورت بال برش کئے اور ویکٹس محسوس کی۔ تو دوبارہ

عطر سے مہکتیں بابل و نینوا کی شہزادیوں کا خیال آ گیا!
 ”کیسی طبیعت ہے اب؟“ وہ ڈیوٹی کی طرف آیا۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔
 وہ مسکرایا۔ خوبصورتی سے۔

”آؤ بستر پر لیٹو۔ دیکھتے ہیں کتنا سچ کہہ رہی ہو۔“

وہ خاموشی سے پاس آئی۔ اور آہستہ سے بستر پر لیٹ گئی۔

نرس نے اُس کے منہ میں تھرمامیٹر لگا دیا۔ یاور خان نے اُس کی نبض تھام

لی۔

بخار اب بھی تھا، گو ہلکا تھا۔ سسٹر نے اُس کا ٹمپریچر اور بی پی نوٹ کیا۔ چند
 لمحے کھڑی یاور خان کی کسی ہدایت کا انتظار کرتی رہی۔ مگر ایسا نہ ہوا تو آہستہ سے
 باہر چلی گئی۔

اس وقت پھر وہ آہستہ سے اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

”I hope I don't touch your wound.“

شہدی کو ہنسی آ گئی۔ وہ کل کے واقعے کے بعد خاص احتیاط ہو گیا تھا۔

”Don't you worry“ آپ جب بھی بیٹھتے ہیں۔ میں اپنے زخم پر ہاتھ
 رکھ لیتی ہوں۔“

اور۔ یاور خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

پھر۔ نظریں اُس کے سر آپے پر گئیں۔

”تمہارے ساتھ یہ کپڑے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ وہ تعریف کئے بنانہ

رہ سکا۔

”اوہ ہاں۔ تھینک یو ویری مچ۔ آپ نے اتنی زحمت اٹھائی۔۔۔“

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔ دلاویزی سے۔

”میں واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہیلپ کے لئے اپنی لینڈ لیڈی کو بھی ساتھ

لے کر گیا تھا۔ مجھے کیا پتہ لڑکیاں کیسی چیزیں پسند کرتی ہیں۔ پھر کچھ انہوں نے مدد
 کی۔ کچھ میں نے بھی تجویز دی۔ ویسے یہ ڈریس اور رنگ میں نے پسند کئے
 ہیں۔۔۔“

”اوہ۔ آپ کا ٹیسٹ بہت اچھا ہے۔“ وہ توصیفی نظریں اپنے کپڑوں پر
 ڈالتے ہوئی بولی۔

”ہوں؟“ اُس کی گھنی خوبصورت بھونکیں اوپر اٹھ گئیں۔

”سچ کہتی ہوں۔“

اچھا سنو۔ دو چار دن میں تمہارا ٹمپریچر نارمل ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں یہاں
 سے لے جاؤں گا۔۔۔“

”کہاں؟“ وہ آپ سیٹ سی نظر آنے لگی۔ یہاں تو پھر سکون تھا!

”کیوں یہیں رہنا ہے کیا؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”نہیں لیکن۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔“ وہ الجھی گئی۔

وہ اُسے کہاں لیکر جانا چاہتا تھا؟ کیا اپنے گھر؟ وہاں اور کون ہو گا؟ کوئی
 اُسے دیکھ کرے گا بھی یا نہیں؟ وہ پہلے کبھی کسی کے گھر میں نہیں رہی تھی۔

”پلیز! پریشان مت ہو۔ میں تمہیں اپنی لینڈ لیڈی کی ایجنسی میں لیکر جاؤں
 گا۔ وہ دونوں میاں بیوی میرے پرنس کے پرانے اور بہت کلوز فرینڈز ہیں۔

اُن کے دونوں بچے باہر ہوتے ہیں۔ خود اکیلے ہیں یہاں۔ بہت اچھے لوگ
 ہیں۔ انہوں نے تو ابھی سے تمہارا انتظار شروع کر دیا ہے۔ تمہیں اُن کا پہاڑی

گاؤں یقیناً پسند آئے گا۔۔۔“

”کیا آپ مجھے میرے ماموں کے گھر نہیں لے جاسکتے؟“ اتنا عرصہ وہ مکمل

طور پر قید و بند میں تھی ورنہ اتنے مصائب برداشت کرنے کے بجائے کبھی کی اُن
 کے گھر جا چکی ہوتی۔

وہ قدرے مسکرایا۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

”میں مختصر اتمہیں سب بتاتا ہوں۔ پھر تم خود فیصلہ کر لو۔ کہ کہاں جانا ہے۔ تمہارے قادر اکل عالمگیر میرے بابا کے دوست تھے۔ میرے پیرئیں کراچی میں ہوتے ہیں۔ بابا کو اُن کی ڈیجھ کا پتہ چلا تو مجھے فون کیا، تم لوگوں کا ایڈریس دیا اور کہا کہ اُن کی جگہ میں حویلی جا کر تمہارے چچا جہا نکیر حیدر سے تعزیت کر لوں، وہ وہیں ہوں گے۔

”مجھے اُنہی دنوں ضروری کام آ پڑا تھا اس لئے فوراً نہ جا سکا۔ کچھ دن لگ ہی گئے۔ یہ سوچ کر کہ تمہارے چچا نہ ہوئے تو کسی اور سے تعزیت کر آؤں گا میں تمہاری حویلی چلا گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا، سوائے گارڈز کے۔ میں نے اُن سے تمہارے چچا کے بارے میں دریافت کیا۔ تو وہ اندر سے ایک ملازم نواز کو بلا لائے۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میں اکل عالمگیر کے دوست کا بیٹا ہوں۔ تو رازداری سے جلدی جلدی بتانے لگا۔ کہ تم بہت مصیبت میں ہو۔ تمہارے چچا نے ایک طرف سے تمہیں باقی دنیا سے کٹ آف کر رکھا ہے۔ دوسری طرف سے عجیب و غریب طریقوں سے تمہیں خوفزدہ کر رہا ہے۔ وہ کسی میٹنگ پر نہیں گیا۔ مگر پر ہی ہے۔ مسز علی کے ساتھ فون پر سکیمنگ کرتا رہتا ہے۔ کبھی مسز علی کی بہن کو بدروح بنا کر کوریڈور میں پھراتا ہے۔ کبھی خود اپنے قد و قامت کی مشابہت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکل عالمگیر بن کر تمہیں جگہ جگہ خود کو دکھاتا ہے۔ تاکہ تم اس قدر خوفزدہ ہو جاؤ کہ اکیلے رہنے سے گھبرا کر اُن کے بیٹے سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ دوسری طرف تمہارے ماموں نے مسز علی کو بھاری رقم دے کر تمہیں تھوڑا تھوڑا کر کے زہر دینے پر آمادہ کیا ہے۔ تاکہ تم ختم ہو تو تمہاری والدہ کی جائیداد کا کوئی اور قریبی وارث نہ ہوتے ہوئے تمہاری تمام جائیداد اُنہیں مل جائے۔“ اُس نے قدرے توقف کیا۔

”جس وقت میں تمہیں Poison کے بارے میں وارن کرنے آیا تھا۔“

وہ پھر کہنے لگا۔ ”اُس وقت میں کلیر نہیں تھا۔ کہ کون تمہیں زہر دے رہا تھا؟ چچا،

ماموں یا مسز علی؟ کیونکہ نواز نے مجھے تھوڑی سی دیر میں بہت جلدی جلدی اور بہت ساری باتیں بتائی تھیں۔ سو میں ماموں میں کنفیوزڈ ہو رہا تھا۔ اس لئے بس تمہیں اتنا بتایا کہ تمہیں کوئی Poison دے رہا ہے۔ تاکہ تم احتیاط کر سکو۔ بعد میں میرے پوچھنے پر نواز سے کنفرم ہوا کہ یہ تمہارے ماموں کر رہے تھے۔ بہر حال۔

یہ سب جان کر میں سخت پریشان ہوا۔ میں نے نواز سے کہا کہ وہ یہ سب تمہیں بتا دے۔ مگر وہ تمہارے چچا سے ڈرتا تھا۔ پھر ظاہر ہے میں جانتے بوجھتے تمہیں موت کے منہ میں جاتے نہ دیکھ سکا۔ نواز کو اپنا سیل فون دیا تاکہ تمہارے بارے میں اور حویلی میں جو کچھ ہو رہا ہے مجھے انفارم کرنا رہے۔ تمہارے چچا نے بے شمار گارڈز ڈیوٹی پر لگائے تھے۔ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔

سو۔ پچھلی سے پچھلی رات جب نواز نے مجھے اطلاع دی۔ کہ کل وہ آ کر تمہارے نکاح کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو میں بھی پرسوں صبح صبح گارڈز کی ڈیوٹی بدلنے کے نام اُن میں شامل ہو گیا۔ موقع ملے ہی تمہیں Slow Poisoning سے خبردار کیا۔ اور پھر وہیں رہ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ پچھلی رات جب تم نے حویلی کے مین دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی میں دیکھ رہا تھا۔ بعد میں جب چچا آ کر تمہیں پیٹ رہا تھا، تمہاری وہ چٹیں بھی میں سن رہا تھا۔

اُسی وقت نواز نے آ کر مجھے بتایا کہ تمہیں خبر کئے بغیر تمہارا چچا صبح ہی تمہارا نکاح اپنے بیٹے سے کروانے والا ہے۔ میں نے سوچا اگر تمہیں بھنگ پڑ گئی ہوگی تو تم ضرور آج ہی رات دوبارہ نکلنے کی کوشش کرو گی۔ اور ظاہر ہے اب کے سامنے سے نہیں بچھلی طرف سے راستہ نکالو گی۔ سو میں گارڈز کی نظریں بچا کر وہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور خوش قسمتی سے تم وہیں آ گئیں۔

شدی جوں جوں بات سنتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو اٹھائیوں کی

پھر اُس کے پاس آکھڑا ہوا۔

اُس کے بیڈ کا سرہانا اوپر کیا۔ اُس کی پشت ٹکیوں سے لٹائی اور گلاس لاکر اُسے تھما دیا۔

”So nice of you, thank you.“ انگلیوں کی پوروں سے گال خشک کرتے ہوئے اُس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

”دیکھو کتنی تیز بارش ہو رہی ہے باہر۔“ یاور خان نے اُس کا دھیان کھڑکی کی طرف مبذول کرایا۔

واقعی باہر تاریکیوں میں جل تھل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر قبل بادل بھی تو کھڑے آئے تھے!

”کتنا اندھیرا ہے باہر۔“ شندی اب سنبھل چکی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

”ہاں۔“ دو قدم واپس چل کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

جنگل، گھپ اندھیرا اور تیز بارش! اُسے ساؤتھ ایسٹرن ایشیا کے جنگل یاد آ گئے۔ سیاہ تاریک راتوں میں موسلا دھار بارشوں میں بھٹکتے جنگل!

”جنگل کے اندھیروں میں زبردست بارش ہو رہی ہے۔“ کہتے کہتے وہ واپس مڑا۔

”اچھا ہے جنگل کے درختوں کو ڈر نہیں لگتا ورنہ...“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”ورنہ؟“

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”مر جاتے سب ڈر کے مارے۔“

یاور خان کا جاندار قبہ بلند ہوا۔

”اس کا مطلب ہے باہر کے اندھیرے اور بارش سے تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔ بہتر ہے میں پردے بند کر دوں۔“ اُسے یقین تھا ایسا ہی تھا۔

پوروں سے پونچھتی جا رہی تھی۔ پھر مزید یارا نہ رہا۔ چہرہ بازو سے ڈھکتے ہوئے بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چچا، ماموں۔ سب مطلب کے نکلے۔ وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟

”روؤ نہیں پلیز!“ اُس کے خوبصورت چہرے پر کھڑے آئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اُس نے نرمی سے کہا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پھر شندی روتی چلی گئی۔

”کم آن شاندا نہ۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تم ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے بچ گئیں۔ تمہیں زہر دیا جا رہا تھا وہ ٹل گیا...“

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی تھی مگر۔

آگے کیا کرے گی؟ اکیلی کیسے رہے گی؟

”میں... میں... اکیلی کیسے رہوں گی۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان بول پڑی۔

”تم اکیلی نہیں ہو گی۔ تمہاری اینکسی اور میرے گھر میں چند قدم کا ہی فاصلہ ہے۔ میں تمہارے لئے کسی آیا کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ چوکیدار بھی ہو گا۔ اور پھر۔ میں بھی تو ہوں گا۔“

اُس نے آنسو پونچھ لئے۔ ایک گونہ تسلی ہوئی۔ سرخ بیگی بیگی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”آپ... کتنے اچھے ہیں۔“

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

”تم بھی بہت اچھی ہو۔“ اُس نے ہولے سے اُس کا گال تھپتھپایا۔

پھر اٹھا۔ کھڑکی کے قریبی چوٹ پر رکھے جوس کے ٹن میں سے گلاس میں جوس ڈالا۔

کھڑکی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بہت ساری بجلی چمکی۔ یہاں سے وہاں تک پہاڑیوں کے جنگلوں کو روشن کر گئی اور پھر۔۔۔ زور کی کڑک ہوئی۔

”اوہ“۔ شندی سہی سی نظر آنے لگی۔

یاورخان نے پردے برابر کر دیئے۔ واپس اُس کے قریب آیا۔

”اب چلوں گا میڈم۔ ویسے تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا نا؟“

”لگے گا تو۔“ اُس نے صاف بات کی۔

”پھر؟“

”کیا ہو سکتا ہے۔“ اُس نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔ ”ہو سکتا ہے

رات تک بارش رک جائے۔“

”ہاں۔ I hope so۔ کیونکہ اب یہ بھی پریشانی لگی رہے گی۔ کہ مادام

شانہ اندہ کو ڈر لگ رہا ہوگا۔“

اُس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔“ پاپا کے دوست کا بیٹا تھا۔ اُسے اپنا اپنا

سائیکل لگا تھا۔

”Are you sure?“

”Yes, I'm damn sure.“

دونوں ہی خوشگوار سی ہنس دیئے۔

معاذ دروازہ کھلا اور۔۔۔ ڈاکٹر نادیا اندر آ گئی۔ بیڈ کے سرہانے سے وہ شندی

کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے۔“

وہیں دروازے کے پاس کھڑے کھڑے وہ جیسے بہت ضبط سے بولی۔ مگر طنز کا

غض پھر بھی نمایاں تھا۔

یاورخان نے ڈاکٹر نادیا کو کوئی جواب نہیں دیا۔

”اوکے۔ چلتا ہوں۔ نرس سے کہہ دوں گا۔ رات کو بھی بارش رہی تو تمہارا

خیال رکھے گی۔“ اُس نے شندی سے کہا۔

”تھینک یو سوچ۔ ویسے آپ فکر مت کریں۔ میں نرس کے بغیر بھی گزارا کر

لوں گی۔“

”گڈ ٹائمٹ“۔ خوشگوار سی مسکراتا وہ ڈاکٹر نادیا کے ساتھ کمرے سے

باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نادیا کا گھر یاورخان کے راستے میں پڑتا تھا۔ نادیا اکثر اُس سے لفٹ

لیتی تھی۔ اس وقت بھی دونوں اکٹھے گھر جا رہے تھے۔

ڈاکٹر نادیا چند ماہ قبل ہی اس ہسپتال میں آئی تھی۔ جلدی ہی یاورخان کی

مسمور کن شخصیت اور بے پناہ قابلیت سے متاثر ہو کر اُس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

شروع میں یاورخان اُسے یوں ہی ایک گلیمر گرل قسم کی چیز سمجھ کر ٹالتا رہا۔ وہ

اُس کے ٹائپ کی نہیں تھی۔ شوخ ادائیں، کھٹکتے قہقہے، ہر شخص سے بے باکی کی حد

تک بے تکلفی۔ مگر۔۔۔

وہ اُسے Avoid بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُس کی کوئی تھی، اُس کے

آپریشن ٹیم میں تھی، تقریباً روزانہ کا ساتھ تھا۔

وہ اُس کے ساتھ مریض اور اُن کے کیس ڈسکس کرتا تھا، ہم عمر اور ہم

عصر ہونے کے ناطے کپ شپ بھی کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔ بات جب نادیا کے من کے

تقاضوں پر آتی تو یاورخان آپ سیٹ سا ہو جاتا۔ وہ اُس کا دل بھی توڑنا

نہیں چاہتا تھا پر۔۔۔ وہی طور پر خود کو آمادہ بھی نہیں کر پاتا تھا۔

اور تو جو تھا سو تھا۔ مگر وہ مزاج کی بہت تیز تھی۔ کسی نے ذرا مرضی کے خلاف

بات کی، فوراً آتش پا ہو جاتی تھی۔ بدکلامی پر اُتر آتی تھی۔ دنوں وہ بندہ اُس کے

عتاب کا شکار رہتا تھا۔ غنودر گزرنام کی کوئی چیز اُس کی کتاب میں نہیں تھی!

اور۔۔۔ یہی شاید اصل وجہ تھی۔ جو یاورخان کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن

رہی تھی۔

پھر بھی۔ اس کے باوجود۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس کی ذہنی مزاحمت کم پڑتی گئی۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں اُس نے نادیہ کی شوخ اداؤں اور نفرتی تہمتوں کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ اُس کی چھیڑ چھاڑ اور مست آنکھوں کی دعوت قبول کر ہی لی!

”بڑی ہنسی آرہی تھی دونوں کو۔“

ڈاکٹر نادیہ کی چھٹی آواز ابھری تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

”کیا مطلب؟“

”تم اپنی پیشہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے؟“

”میری پیشہ ہے نا۔“ حسب عادت اُس نے اُسے چھیڑا۔

”اور بارش سے کیا اُسے ڈر لگتا ہے کہ رات کو بارش رہی تو نرس اُس کا خیال رکھے گی۔“ اُس کی اُن سنی کرتے ہوئے اُس نے یاور خان کی کچھ دیر قبل کی بات دہرائی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

”اُسے واقعی ڈر لگ رہا تھا۔“ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا۔

”بچی ہے؟“ وہ غصے سے بولی۔

”نہیں۔ ذرا سی بڑی ہے۔“ اُس نے شرارت سے کہا۔

اور۔ وہ کاٹ کھانے کر دوڑی۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اوہ۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ انسانی ہمدردی کے

تحت کر رہا ہوں۔“

”بس بس۔“ وہ اب بھی بھری ہوئی تھی۔

ہر سواندھیرا اچھا گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ پتلی سی وائینڈنگ سڑک پر

نظریں جمائے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں اسے روڈ سائیڈ سے اٹھا کر لایا تھا۔“ اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اُسے جانتا تھا۔ ورنہ کئی سوال منہ کھولتے۔ کون تھی؟ کس نے مارا تھا؟ کیوں مارا تھا؟ یہ سوال اُس کی بدنامی کا باعث بن سکتے تھے۔ ساتھ ہی اُس کے دشمنوں کو بھی اُس کے اس ہوسپتال میں ہونے کی خبر کا اندیشہ تھا۔ سو یہی کہا کہ کسی نے مار پیٹ کر سڑک کے کنارے ڈال دیا تھا۔ اور وہ انسانی ہمدردی اور ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے اُسے ہوسپتال لے آیا تھا۔ ”اب اُس کی دیکھ بھال کرنا میرا ہی فرض بنتا ہے نا۔“

”دیکھ بھال کے لئے کیا نرس نہیں ہے؟ ضروری ہے کہ تم ہی منڈلاتے رہو اُس کے بیڈ کے ارد گرد۔“

اُس کی بات پر ایک بار پھر اُس کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

”شت اپ۔“ وہ تندہی سے بولی۔

”یہ ایک میڈیکولیکل کیس ہے؟“ وہ اب بھی غصے سے کھول رہی تھی۔

”آف کورس ہے۔“

”تو سیدھا سیدھا پولیس کو انفارم کیوں نہیں کرتے؟“

وہ ایسا نہیں چاہتی۔ وہ مختصر اُبولا۔

”بہت اونچی چیز ہے نا۔“ وہ حقارت سے بولی۔ پھر جیسے اُسے خیال آیا۔

”اور... یہ تم نے اُسے V.V.I.P. Room میں کیوں رکھا ہے؟“

”میں نے نہیں رکھا۔ اسکی اپنی خواہش تھی۔“

ایسا ہی تھا۔ مگر نادیہ کو یقین نہیں آیا۔ قہر و غضب اور بڑھ گیا۔

”اب بکواس نہیں کرو۔“ وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

وہ منہ پھٹ تھی وہ جانتا تھا مگر۔ تذلیل کی حد تک جانا اُسے بھی گوارا نہیں

تھا۔ پھر بھی۔

اُسے وہی لینا پڑے گا جو وہ لے رہی تھی۔ ورنہ وہ سمجھے گی کہ وہ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ عجیب احمقانہ ضد تھی۔ اور جب وہ ایسا نہ کر سکا تو وہ سب چھوڑ چھاڑ ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئی۔ ریسٹورانٹ میں موجود لوگوں کے سامنے اُسے سخت خفت اٹھانا پڑی تھی۔ اور واپسی پر سارا راستہ جو وہ اُس کے ساتھ لڑتی آئی تھی وہ الگ۔ دونوں ناراضگی رہی تھی دونوں طرف پھر اُس کی ذہنی کوفت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر جو ادب نے صلح کرادی تھی دونوں کے بیچ۔

اور تو اور۔۔۔ آج صبح وہ اُسے خاص طور سے شاندار سے ملوانے اُس کے کمرے میں لے گیا تھا تو اس پر بھی برا مان گئی تھی۔ اُس کے 'ہیلو' کا جواب بہت روکھے پن سے دیا تھا۔ اور باہر نکلی تھی تو اُس سے خاصی بحث کی تھی کہ کیا وہ اتنی ہی اہم تھی کہ وہ اُسے اُس سے ملوانے لے گیا تھا۔ بہتیرا کہا اُس نے کہ خود نادیر چونکہ اُس کے لئے اہم تھی اس لئے اپنی پیسٹ سے تعارف کروانے لے گیا تھا مگر وہ صبح سے لے کر اب تک اُسی بات کو لئے بیٹھی تھی۔ جتنا وہ Violence سے دور بھاگتا تھا۔ اتنا ہی وہ لڑنے جھگڑنے کو تیار رہتی تھی!

گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے گاڑی دائیں جانب پرانیویٹ روڈ پر موڑ دی۔

ہمیشہ کی طرح غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ بڑھا اور۔۔۔ شیشہ نیچے کر دیا۔ بستی، کھیتوں اور باغوں میں سے ہوتے بارش کے پھیکے جھونکے اُسے چھو چھو کر گزرنے لگے۔ وہ ذہن سے ہر بات جھٹکتے ہوئے دھیرے دھیرے پہاڑی پر آگے بڑھنے لگا۔

دور اوپر سامنے ہی انکل ذوالفقار کا گھر تھا۔ اُن کے پیچھے دائیں طرف انہوں نے اپنے بچوں کے لئے تین تین بیڈروم کے دو مکان بنوائے تھے۔ اُن میں سے ایک میں یاور خان کرائے پر رہتا تھا۔ انکل کے مین گھر کے اوپر بالکل ہل ٹاپ پر اُن کی دو بیڈروم کی اسٹکی تھی۔ اور۔۔۔

"Control your self, please!" وہ بڑے ضبط سے بولا۔
 "Oh shut up." اب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کل ہی اُسے چلا کر دے۔
 "ٹھیک ٹھاک بھی نہیں ہے۔ اور کل ہی اُسے چلا بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بھی Firmly بولا۔

نادیر کا گھر قریب آ گیا تھا۔ بائیں جانب مڑتے ہوئے وہ اُس کے گھر کے پاس آنے لگا۔

"بس یہیں روک دو۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ چند میٹر پہلے ہی بولی۔
 وہ اُن سنی کرتے ہوئے گاڑی گیٹ تک لے گیا۔ موڈ اُس کا بھی خراب تھا۔
 پر کرسی اپنی جگہ تھی!

گھر کے لئے چلا۔ تو ذہن بوجھ سائلے تھا۔
 کیسی محبت تھی نادیر کی؟ اس قدر بدزبانی! یہی باتیں وہ نرمی اور خوش گفتاری سے بھی کر سکتی تھی۔ تب شاید اُس پر اثر بھی زیادہ پڑتا۔ اگر وہ بھی اسی لب و لہجہ میں بات کرنا شروع کر دیتا تو؟ پھر شاید گالی گلوچ پر اتر آتی!

چند روز قبل بھی خاصی تلخی ہوئی تھی۔ نادیر نے باہر ڈنر پر جانے کو کہا تھا۔ اور عین اُس وقت یاور خان کو ہسپتال سے کال آ گئی تھی۔ صبح جس پیسٹ کا اُس نے آپریشن کیا تھا، اُس کو پر اہم ہو گئی تھی۔ اپنے مریض کو دیکھنے اُسے بہر حال جانا تھا۔ مریض دیکھنے کے بعد جب اُس نے سیل فون پر نادیر کو اپنے دیر ہونے کا سبب بتایا۔ تو بجائے فراخ دلی سے معاف کرنے کے وہ برس پڑی اُس پر۔ جواب میں اُس نے صرف فون بند کر دیا تھا۔ اُس کے فون بند کر دینے پر بھی وہ دو دن موڈ آف کئے رہی۔ تب بھی یاور خان نے ہی بات کرنے میں پہل کی تھی۔

قریباً ڈیڑھ ماہ قبل بھی اُس نے خوفناک لڑائی کی تھی اُس سے۔ تب بھی قصور نادیر کا ہی تھا۔ ریسٹورانٹ میں ویٹر آرڈر لینے آیا۔ تو وہ دونوں کے لئے Hot & Sour soup منگوانے لگی۔ اُس نے کہا کہ وہ مرچیں نہیں کھا سکتا۔ تو وہ اصرار کرنے لگی۔ کہ

پہاڑی کے پیچھے ڈھلان اور ڈھلان سے نیچے ندی کنارے کھیتوں، پھولوں، پھلوں سے لدا اُن کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسکی اور یاور خان کے گھر کے اُس طرف پچھلی ڈھلان پر بنے اکل کے مزارعوں کے چھوٹے موٹے، کچے پکے گھروں دے تھے۔

اکل کے اور اُس کے گھر میں روشن بتیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

تھکا ہارا جب بھی وہ اس سڑک پر ہو لیتا۔ وادی بھر کی خوشبوئیں لئے شبنی ریشی شام اُس کا استقبال کرتی۔

وہ چاہتا تو اُسے ہسپتال میں بھی رہنے کے لئے فلیٹ مل سکتا تھا۔ مگر جب امی نے کراچی سے آنٹی نور جہاں کو اُس کی اُن کے علاقے میں تعیناتی کا بتایا۔ تو انہوں نے اُسے اپنے ہی یہاں ٹھہرانے پر زور دیا۔ پھر جب اُس نے جگہ دیکھی تو قدرتی حسن سے مالا مال اس وادی نے خود بخود اُس کے قدم روک لئے۔

بہت خوش تھا وہ یہاں۔ امیریکہ جیسی مشینی دنیا میں کسی روپوت کی طرح زندگی گزارنے کے بعد وہ اس بستی میں آیا۔ تو جسم کے ساتھ ساتھ جیسے روح تک آسودہ ہو گئی۔ منہ اندھیرے جب وہ اپنے گھر سے پگڈنڈی پر نیچے اترتے ہوئے ندی کنارے سیب اور خوبانی کے باغات کے ساتھ ساتھ چلتا واک کرتا۔ تو سیب اور خوبانی کے شگوفے، ندی کی سرمدی موسیقی، اور ہوا کے دوش پر دور پار سے آئیں قدیم جنگلوں کی خوشبوئیں، اُس سے عجیب پر اسرار سی سرگوشیاں کرتیں!

واپسی پر ڈھلان کی پگڈنڈی چڑھتا۔ تو یہاں وہاں بکھرے مزارعوں کے گھروں میں صبح کی پکوان کے اُٹھتے دھوئیں۔ بہت پُر فریب لگتے۔ ادھر ادھر چرتی بھیڑ بکریاں بہت معصوم لکٹیں، رنج سفر باندھتیں بندروں کی ٹولیاں بہت شریر لکٹیں!

صبح بستی شام میں باہر نکلتا۔ تو شبنی ہوائیں چھیڑ خانیاں کرتیں، پھولوں باغوں جھرنوں کی خوشبوئیں مستی جگاتیں اور۔۔۔ چاندوں پرندوں کی بولیوں میں قدرت

بولتی نظر آتی!

خوابوں کا دیس تھی یہ پہاڑی بستی! لازوال حسن تھا اس وادی کا!

احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے اُس نے پہلا موڑ کاٹا تو۔۔۔ ڈھلان پر بکھرے مزارعوں کے گھروں نے اپنے جلو میں لئے جھلمل جھلمل روشنیوں کے پت وا کر دیئے۔

ایک گہری سانس میں تمام مسح سمیٹتے ہوئے وہ محرزوہ سادھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

آخری موڑ کاٹا۔ تو سحر ٹوٹا۔ سامنے ہی چند گز پر گیٹ کھولے اُس کا چوکیدار میوہ خان اُس کا منتظر کھڑا تھا۔

اُس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور سیدھا اوپر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ انگلیشی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کوزی کمرہ اچھا لگ رہا تھا۔

واش روم جا کر اُس نے ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کئے اور اپنے نرم و گرم بستر میں گھستے ہوئے ٹی وی آن کر لی۔

تنبھی حب معمول حمید، اُس کا کک، اُس کے لئے کافی لے آیا۔
”تھینک یو“۔ وہ خوش کر بولا۔

اس وقت گرم سڑ ونگ کوئی پی لیتا تھا۔ تو جیسے ساری جھکن جاتی رہتی تھی۔ وہ مزیدار کوئی کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ ساتھ میں ٹی وی پر بھی نظریں جمائے تھا مگر۔۔۔ بھلانے کی کوشش کے باوجود نادیدہ کی کڑوی کیلی باتیں ذہن میں در آتیں۔ اور وہ پریشان ہو جاتا۔
معا۔۔۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

”ڈاکٹر صاحب۔ میں ہوں۔“ یہ میوہ خان تھا۔ یاور خان کا فیورٹ!
چالیس سالہ میوہ خان بہت ہی سادہ لوح اور مخلص تھا۔ اسی بستی کا باسی تھا۔ یاور خان کے گھر کا ہر کام خوشی خوشی کرتا رہتا تھا۔ ڈرائیونگ، باغبانی،

چوکیداری سب کچھ۔ اپنے بھانجے حمید کو بھی وہ ہی یاور خان کے یہاں کھانا پکانے لایا تھا۔ میوہ خان نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ بقول اُس کے پرانی لڑکی آکر اُسے اپنی ماں سے جدا کر دیتی اور یہ اُسے کسی طور منظور نہیں تھا۔ ماں ہی اُس کی دنیا تھی اور ماں ہی اُس کی جنت تھی۔ یہ تلخ تجربہ اُس کے اپنے گھر ہی میں ہوا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کو بیوی الگ کر کے دوسرے گاؤں لے گئی تھی۔ اور بقول میوہ خان اُس کی ماں رو رو کر اندھی ہونے کو تھی۔

پچھلے دنوں میوہ خان کی ماں کو بخار ہو گیا تھا۔ یاور خان کو پتہ چلا تو اُسے دیکھنے چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ میوہ خان چھکوں پھکوں رو رہا ہے۔
”میوہ خان! حوصلہ کرو بھی۔ بخار ہے اُتر جائے گا۔“ یاور خان کو ہنسی بھی آرہی تھی۔

”صاحب۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا۔ تو میں بھی زہر کھالوں گا۔۔۔“
”او تو زہر نہ کھا۔ بس شادی کر لے۔ میں خود بخو دھیک ہو جاؤں گی۔“ ماں نے میوہ خان کو ڈانٹا۔ پھر یاور خان کی طرف دیکھا۔
”ڈاکٹر صاحب۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس اس کو نصیحت کریں کہ میری زندگی میں شادی کر لے۔ ورنہ یہ ارمان میں دل میں ہی لے کر چلی جاؤں گی۔ اکیلا بیٹھا روتا رہے پھر۔۔۔“

”خدا نہ کرے۔“ میوہ خان نے ماں کے منہ پر گس کر ہاتھ رکھا۔
”میوہ خان۔ بس اب سنجیدہ ہو جاؤ۔ شادی کر لو۔ ماں ٹھیک کہتی ہیں۔“ یاور خان نے بھی اُسے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا تھا۔ ”بس میری ماں ٹھیک ہو جائے۔“

”ابھی ٹھیک ہو جاتی ہیں تم فکر مت کرو۔“

اُس کی ماں کو ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ یاور خان نے دوائیاں دیں۔ اور گھر واپس

آ گیا۔ صبح تک وہ واقعی ٹھیک ٹھاک تھی!

میوہ خان بہت خاص چیز تھا۔ بے حد مزے کی گپ شپ کرتا تھا، اور ہر ایک کی ragging کرتا تھا۔ کبھی کبھی یاور خان کے کمرے میں بھی آ جاتا تھا۔ بلکہ خود یاور خان نے ہی اُسے اجازت دی تھی کہ وہ اُس کے پاس آیا کرے۔ اپنے ساتھ وہ پوری بستی کی خبریں لاتا تھا۔ اور یوں یاور خان اُن کے رہن بہن، رسم و رواج، کس کی منگنی ہوئی، کس کے یہاں بچہ پیدا ہوا، کون کیا بیمار تھا، ہر بات سے باخبر رہتا تھا۔ یاور خان حتی الامکان اُن کی مدد کرتا تھا۔ اُن کا علاج کرتا تھا۔ اور اُن کے دکھ سکھ بانٹتا تھا!

”آؤ میوہ خان۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میوہ خان اندر آ گیا۔

”بیٹھو۔ اس وقت واقعی مجھے تمہاری ضرورت تھی۔“ اُس نے کوئی کا خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا، ساتھ ہی انٹرکوم پر اُس کے لئے کچن سے چائے منگوائی۔
”صاحب۔ میرا گزردہ بھی حاضر ہے۔ بتائیں میری ضرورت کیسے پیش آئی؟“ اُس کے قریب نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے وہ اپنے دیہاتی لب و لہجہ میں بولا۔

اور۔ یاور خان اپنے حلق سے اُلٹے کئی قہقہے پی گیا۔

”میرا سر بھی حاضر ہے۔ تو سنا تھا۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ شاید یہ نیا محاورہ بنا تھا۔ یا پھر میوہ خان کی اپنی ایجاد تھی کہ سر کی جگہ گردے نے لے لی تھی۔ بہر حال۔“

”گپ شپ کے لئے اور کیا۔“ اُس نے کہا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ مزید تلی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

حمید چائے لا کر جا چکا تو میوہ خان نے گردن اٹھا کر دور تک دیکھا۔ کہ وہ سن تو نہیں رہا تھا۔

”صاحب۔ میں بھی ایک ضروریات سے آیا تھا آپ کے پاس۔ گرم چائے کی زوردار چسکی لیتا میوہ خان گویا ہوا۔ اُس کے لب و لہجہ میں بہت راز داری تھی۔

”بولو۔“ یاور خان کروٹ اُس کی طرف لیتے ہوئے بولا۔

صاحب۔ اُس دن ماں نے کہا تھا تا کہ میں شادی کر لوں ورنہ وہ یہ ارمان دل میں لیکر چلی جائے گی خدا نخواستہ ...

”ہاں کہا تو تھا۔“ یاور خان کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ وہ ضرور کوئی خاص شکوہ چھوڑنے والا تھا۔

”بس اُسی وقت میں نے بھی دل میں قسم کھالی تھی کہ خدا میری ماں کو ٹھیک کرے۔ پھر میں ہر حال میں شادی کروں گا ...“

”اوہ۔“ یاور خان Excited نظر آنے لگا۔

”تو بس صاحب۔ میں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔“

یہ ہوئی نا بات۔

”اب پوچھیں کہ کس طرح پسند کی ہے؟“

”کس طرح پسند کی ہے؟“ یاور خان اُس کے سائل کا عادی تھا، بالکل اُسی

طرح بولا۔

”صاحب۔ دو چار روز پہلے حمید نے بتایا کہ بچن میں آنا اور چینی ختم ہے۔ لانا

ضروری ہے۔ وہ جانے لگا۔ تو میں بھی ساتھ چلا گیا ...“

”پھر۔ گھر خالی چھوڑ کر گئے تھے؟“ یاور خان نے بچ میں ہی ٹوک دیا۔

کہ حمید جب بھی نیچے پاس کے گاؤں میں کوئی خریداری کرنے جاتا، میوہ خان کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ساتھ چل پڑتا۔ جبکہ یاور خان نے سختی سے منع کیا تھا کہ گھر خالی نہ چھوڑے۔

”نہیں صاحب ...“ اُس نے یہ لمبی زبان نکالی۔ اُس کے منہ سے بات نکل

گئی تھی ورنہ اُس نے تو حمید کو بھی منع کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہ چلے۔
”تو کس پر چھوڑ کر گئے تھے۔“

اور۔ میوہ خان نے حسب معمول انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔
”اللہ پر۔“

اور۔ یاور خان سے اس وقت پھر کچھ بن نہ پڑا۔

”اچھا۔ آگے سناؤ۔“

”ہاں۔“ وہ یوں گویا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ”تو صاحب! بازار سے پہلے جب ہم گاؤں میں سے گزر رہے تھے۔ حمید آگے اور میں پیچھے تھا۔ تو اچانک ایک بڑا سرخ گلاب میرے سر پر آ کر گرا۔ میں نے جبک کراٹھا لیا۔ اور اُس رخ دیکھا جہاں سے گلاب آیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ چشمہ لگائے ایک بچی عمر کی لڑکی گھر کی دیوار پر سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ میں گھبرا گیا۔ گلاب اُس نے یقیناً حمید پر پھینکا ہو گا جو غلطی سے مجھے آ کر لگا۔ لیکن میں حیران رہ گیا کہ اُس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ گلاب میرے لئے ہی تھا۔ میں نے شرم کر چہرہ کوٹ میں چھپا لیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا ...“ اُس نے قدرے توقف کیا۔

”پھر؟“ یاور خان اپنی ہنسی بمشکل روکے تھا۔

”اب اگلے دن کیا دیکھتا ہوں کہ میں یہاں بنگلے میں باہر کیاری میں گوڈی کر رہا تھا کہ اُس کی چھوٹی بہن مجھ سے ملنے آ گئی۔ وہ بڑی بہن کا پیغام لے کر آئی تھی۔ کہ اُس نے مجھے مہینہ بھر پہلے فلاں فلاں کی شادی میں دیکھا تھا اور اُسے پسند آ گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے ...“

”واؤ۔“ یاور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خیر۔ اُسی گاؤں میں میری پھوپھی کی بیٹی بیاہی ہے۔ ہماری آپس میں اچھی کپ شپ ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ تحقیق کرے۔ میں نے کہا کہ لڑکی

بہت فیشی لگتی ہے۔ کالا چشمہ لگاتی ہے۔ لیکن خیر ہے اب جبکہ میں اُس کو پسند آ رہی گیا ہوں تو مجھے منظور ہے۔ دو دن بعد پھوپھی زاد بہن نے مجھے بلا لیا۔ اُس نے ساری تفتیش کر لی تھی۔ بولی۔ لڑکی ایک آنکھ سے چوچی ہے۔ اس لئے کہیں آتے جاتے کالا چشمہ لگالیتی ہے۔ زبان میں بھی تھوڑی سی لکنت ہے اور سنتی بھی ذرا اونچا ہے۔ اسی لئے اب تک شادی بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے نہراری مرضی ...

”پھر۔ تم نے کیا کہا؟“

”صاحب۔ ذرا نسوار سوگٹھ لوں؟“

”سوگٹھ لو۔“ کہ بڑی مشکل سے تو اُس نے اُس کی منہ والی نسوار چھڑوائی تھی۔ اب یہ بھی سوگٹھنے نہ دیتا تو میوہ خان ت مر جاتا۔ اُس نے جیب سے خوشبودار نسوار کی چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ ذرا ذرا سی دونوں نتھنوں میں سوگٹھی۔ ڈبیہ بند کر کے واپس جیب میں رکھی۔

”میں نے کہا کہ بس مجھے یہی لڑکی چاہئے۔ نہ ٹھیک سے سنے گی، نہ ٹھیک سے بولے گی۔ نہ ماں سے جھگڑا ہوگا، نہ مجھ کو ماں سے جدا کرے گی۔“

”یار تم تو بہت عقلمند نکلتے۔ میں خواہ مخواہ تمہیں سادہ سا سمجھتا رہا۔“ یاور خان بولا۔

”اور پھر صاحب۔ ثواب کا کام بھی ہے۔ تیس سے عمر اوپر ہے کوئی اور اُس سے شادی بھی نہیں کر رہا۔“

یاور خان کو اُس کے خیالات اچھے لگے۔ پھر بھی۔

”یہ کہو۔ کہ گلاب کا کمال ہے سب۔“ یاور خان نے اُسے چھیڑا۔

وہ شرما کر سرخ ہو گیا۔

”سچ بتاؤں صاحب۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

”ہاں۔“

”آپ کی بات ٹھیک ہے۔ ساری بات گلاب کی ہے۔“

یاور خان نے ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میوہ خان نے بھی گرجبوشی سے ہاتھ ملایا۔

اور۔ دونوں ہی بٹاشت سے ہنس دیئے۔

دیر تک دونوں ہنستے مسکراتے کپ شپ کرتے رہے۔

نوبے حمید نے آکر ٹیبل پر ڈنر لگ جانے کی اطلاع دی۔

”ماموں ٹو بھی آ۔ کھانا تیار ہے۔“ اُس نے میوہ خان سے کہا۔

میوہ خان اٹھ کر حمید کے ساتھ چلا گیا۔ اور یاور خان ہاتھ دھونے واش روم چلا گیا۔



اٹھتے ہوئے کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

سامنے کے جنگل میں بگلہ سے سفید بادل تیر رہے تھے۔ نیچے ہسپتال کے احاطے میں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سائیڈ واکس پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں لائز میں بیٹھے تھے۔ گاڑیوں میں سائیڈ واکس پر اور لان میں بیٹھے لوگ۔ شاید مریضوں کے لواحقین تھے یا پھر ساتھ میں کچھ مریض بھی تھے۔ بہر حال۔

دروازے پر دستک سے اُس کی محویت ٹوٹی۔ مڑ کر دیکھا۔

سسٹرنز گئی۔ ان چند دنوں میں ہی وہ اُس کی دوست بن گئی تھی۔ بقول نرگس کے وہ اُن کی سب سے پیاری اور خوش اخلاق پیشہ تھی۔
”سسٹر۔ ڈاکٹر خان نہیں آئے؟“ اسے دیکھتے ہی وہ بول اٹھی۔ صبح سے وہ تیسری بار یاور خان کا پوچھ رہی تھی۔

وہ مسکرا دی۔

”آجائیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔ کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہوگی۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔
”اوہ۔“

سسٹر نے واش روم کے قریب والی الماری کھول لی۔

”ساتھ والے کمرے میں کبل اور تکیہ چاہئے۔“ وہ الماری میں سے فالٹو کبل اور تکیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ میں لیکر جا رہی ہوں۔“
”لے جائیں۔ ویسے ہی پڑے ہیں۔“

”اور... آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا۔“ وہ کبل اور تکیہ اُس کے بیڈ کے پاؤں کی طرف رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سسٹر میرے سچر کب کھلیں گے؟“ وہ جیسے جلد سے جلد سچر سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے آج شندی کا چھٹا دن تھا۔ وہ اب بہت بہتر تھی۔
نمبر پچھ بھی نارمل ہو چکا تھا۔ کھانسی بھی بس تقریباً ختم تھی۔

ناشتے کے بعد اُس نے مسٹر ڈرنگ کے پلین کپڑے اور بیچ کرتی پھولدار شال لی۔ بالوں پر برش کیا۔ اور تیار ہو کر کھڑکی کے دائیں لگے صوفے پر آ بیٹھی۔
دس بجے کے بج چکے تھے۔ یاور خان ابھی تک راؤنڈ پر نہیں آیا تھا۔ قریبی میز پر سے میگزین اٹھاتے ہوئے وہ اوراق پلٹنے لگی مگر کچھ۔

ابھی ابھی سی تھی، بے کل سی تھی!

پورے میگزین کے تمام صفحوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اُس نے اُسے

واپس میز پر رکھ دیا۔

”یہ تو ڈاکٹر خان ہی بتائیں گے۔“
 ”وہ آئیں گے تو بتائیں گے نا۔“ شندی کے لہجے میں جھنجلاہٹ سی تھی۔
 نرگس مسکرا دی۔

”ویسے... ڈاکٹر خان آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں...“
 ”ہوں۔“ وہ مانتی تھی۔

”میں نے پہلی بار ڈاکٹر خان کو کسی پشٹ کے ساتھ ایسے فری ہو کر باتیں کرتے دیکھا ہے ورنہ تو...“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرا دی۔
 ”ورنہ تو؟“ شندی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر خان بہت سو بر قسم کے ہیں۔ شاف کی تو جان نکلتی ہے اُن سے۔ ڈیوٹی میں کوتاہی بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔ خود بھی کام کرتے ہیں، دوسروں سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ رات کو بے شک کوئی اور سرجن آن کال ہو، اپنے مریض کے لئے ڈاکٹر خان کہتے ہیں اُنہیں خود بلا یا جائے، رات کا چاہے کوئی بھی پہر ہو...“

”اچھا...“ وہ امپریس سی نظر آ رہی تھی۔

”لیکن ہیں بہت اچھے دل کے۔ سب کا خیال بھی بہت رکھتے ہیں۔“
 ”خیال بھی رکھتے ہیں۔ پھر بھی شاف کی جان نکلتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

نرگس خوشگوار سی ہنس دی۔

”بہت، بہت، بہت سڑکٹ ہیں ڈاکٹر خان۔“ وہ ہنستے ہنستے ہی بولی۔ ”اور اب میں چلتی ہوں۔ ورنہ بیکار کھڑے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی میری۔“
 کبل تکیہ اٹھاتے ہوئے وہ واقعی چلدی۔ اور شندی دیر تک یادِ خان کے بارے میں سوچتی رہی۔

اُس کے ساتھ وہ واقعی اچھی کپ شپ کرتا تھا۔ مگر — انداز میں اتھارٹی

ور آ نکھوں میں کما ہوا اپنی جگہ تھا!
 اور پھر — ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے۔ سڑکٹ تو ہوتا چاہیے۔ انسانی زندگیوں کا معاملہ ہوتا ہے!

ویسے — اُس کی باتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ مختصر، ذومعنی اور دلچسپ!
 اُس نے گہری سی سانس لی۔ سامنے وال کلاک پر نگاہ کی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔ چسٹ پر رکھے کینل میں ایک کپ پانی ڈالا۔ اور ابالنے کو رکھ دیا۔

کپ میں کوئی اچھی طرح پھینٹی اور دودھ اور چینی ملا تے ہوئے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا۔

کپ میں چمچ چلاتی وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔
 کوئی کی سحر انگیز خوشبو من میں اتارتی وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔
 حویلی میں اتنا عرصہ کسی نے اُسے کوئی کو پوچھا تک نہیں تھا۔ کتنا اُس کا دل کرتا تھا بسا اوقات!

دوسرے ہی لمحے اُس نے خیال جھٹکا۔ اُسے اُن منحوس گھڑیوں کو یاد نہیں کرنا چاہئے تھا!

بارہ بجتے ہی لہج آ گیا۔ یہاں پر کھانا بہت early سرو ہوتا تھا۔ وہ بھی پڑا ہی رہنے دیتی تھی۔ اتنی جلدی تھوڑی دل کرتا تھا کھانے کو۔

اُسی وقت سسٹر نرگس بھی آ گئی۔ بریک پر جانے سے پہلے وہ ضرور اُسے جھانک لیتی تھی۔

”آج شام کو بھی میری ڈیوٹی لگ گئی ہے۔“ اُس کا حال احوال پوچھنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”کیوں؟“

”سسٹر نا درہ نہیں آرہی۔ کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے۔“

”اوہ۔“

”کھانا پھر نہیں کھایا؟“ نرمس کی نظر ٹرائی پر پڑی۔

”دل نہیں کر رہا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بڑیک کے بعد گرم کر کے لا دوں گی۔“ وہ اکثر اُس کا کھانا گرم کر دیتی تھی۔

”you are so sweet sister.“ وہ ممنون سی بولی۔

”ویسے کسی دن ڈاکٹر خان نے دیکھ لیا نا۔ تو میری خیر نہیں۔“ وہ مسکراتے

ہوئے بولی۔ ”اچھا۔ چلوں اب۔“

”تھینک یوسسٹر۔“ شندی نے کہا۔

اور۔۔۔ سسٹر نرمس دروازے کی طرف بڑھی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ شندی کھڑکی میں کھڑی اُس پار دیکھ رہی تھی۔

نم بوجھل گھنائیں آج پھر جنگل کو نظروں سے اوجھل کئے تھیں۔ تاریکیاں وقت سے پہلے گھر آئی تھیں۔ جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں البتہ راستوں کا تعین کر رہی تھیں۔

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی وہ پلٹی۔

یاور خان تھا۔ اوور کوٹ کا کالر اوپر کئے، دونوں جیبوں میں ہاتھ دیئے اندر داخل ہوا تھا۔

جانے کیوں؟ اُس کا دل یکبارگی دھڑکا، آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھے۔

”ہیلو میم صاحب۔“ وہ پاس آ گیا۔

”ہائے۔“ اُس کی لمبی خیدہ پلکیں اُس کی خوبصورت آنکھوں پر سائباں بنا گئیں۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ وہ اُس کی جھکی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

”I'm fine.“ اُس نے خود کو سنبھالا۔

”Good۔۔۔ بیٹھو۔“

وہ کھڑکی کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

یاور خان بھی دیوار کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تبھی۔۔۔ نرمس اُس کا فائل لئے اندر آ گئی۔ یاور خان نے مانگی تھی اُس کی

فائل۔ اُس نے اُسے پکڑادی۔

”صبح سے آپ کے لئے پریشان ہو رہی تھیں۔ بار بار آپ کا پوچھ رہی

تھیں۔“ نرمس نے یاور خان کو بتایا۔

کھلے فائل پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے اُس نے شندی کی طرف دیکھا۔

بلش ہوتی وہ اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

آج کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

سسٹر کو چند ہدایات دیں، فائل پکڑائی، اور تھکی تھکی ٹانگیں سیدھی پھیلا

دیں۔

نرمس سمجھ گئی اُس کا ارادہ بیٹھنے کا تھا۔ مؤدب طریق سے باہر نکل گئی۔

”کتنی بار پوچھا تھا میرا، ہاں؟“ چپ چپ سی شندی پر نظریں جمائے وہ

شرارت سے بولا۔

اُس نے جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ خود کو سنبھالا۔ گو حسین چہرے پر اب بھی

قوس و قزح کے سارے رنگ موجود تھے۔

”یا نہیں۔“ وہ صاف مگر گئی۔

وہ دلا دیزی سے مسکرایا۔

”پریشان تو ہوئی تھیں نا؟“ وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔

”یا نہیں۔“ اُس نے پھر دہرایا۔

”میڈم۔ کوئی کمپلیٹ تو نہیں؟“ اُس نے حسب سابق پوچھا۔
 ”ام م۔“ وہ جیسے کچھ سوچنے لگی۔ ”ہے۔ آج ڈائیکٹرنے میرا لچ کسی
 اور روم میں اور اُس روم کا لچ مجھے بھیج دیا تھا۔۔۔“
 انٹرنی جلدی جلدی اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگا۔
 باہر دیکھتے دیکھتے ہی یاور خان کے کان کھڑے ہوئے۔
 ”اور؟“ سٹوڈنٹ نے پوچھا۔
 ”اور یہ کہ۔۔۔ باہر کاؤنٹر پر نرسیں رات کو زور زور سے بول کر سونے نہیں
 دیتیں۔۔۔“

”اور؟“ انٹرنی کو جیسے اچھا لگ رہا تھا۔ آج تو خاصی شکایتیں تھیں!
 ”اور۔۔۔ اور یہ کہ آج ڈاکٹر خان نے اپنا صبح کا راولڈ نہیں لیا۔“
 اور۔۔۔ یاور خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔
 سٹوڈنٹ سمجھ گیا بات میں کچھ گڑبڑ تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر آخری بات
 نوٹ کئے بغیر ہی خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔
 اور۔۔۔ شندی آرام سے کیٹل کی طرف متوجہ ہو گئی۔
 ”Shandana you are naughty.“ یاور خان بولا۔
 اور۔۔۔ کیٹل کی طرف ہی رخ کئے وہ چپکے سے مسکرا دی۔
 پانی ابل چکا تھا۔ وہ کپس میں ڈالنے لگی۔
 ”آپ۔۔۔ یہاں اس طرح بیٹھے ہیں۔ کوئی اعتراض تو نہیں کرے گا۔ کہ
 آپ پشٹ کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔“ اُسے ویسے ہی خیال آ گیا۔
 ”نہیں۔ اس وقت میں تمہارا وزٹرن کرتا ہوں۔“
 ”اوہ۔۔۔ ہائے داوے۔۔۔ آج آپ صبح ڈاکٹر بن کر کیوں نہیں آئے؟“
 ایک بار پھر اُس کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔ آخر اُس نے پوچھ ہی لیا تھا!
 ”ایک ایمر جنسی کیس آ گیا تھا۔ خاصا کومپلیکسڈ کیس تھا۔ چار بجے تک میں

وہ خوشگوار۔۔۔ سے ہنس دیا۔
 ”اچھا کوئی پیتے ہیں۔ پھر تمہیں یاد آ جائے گا سب۔“ سامنے چوٹ پر کوئی
 کاٹن دیکھ کر اُسے اچانک کوئی کی طلب ہوئی۔ اُنھنے لگا۔
 ”پلیز! آپ بیٹھیں۔ میں بناتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”آتی بھی ہے بنانا یا۔۔۔“
 پتہ نہیں اتنے سارے ملازموں، ماماؤں میں اُس نے کبھی کوئی کام اپنے
 ہاتھ سے کیا بھی تھا یا نہیں؟
 ”کوئی بنا لیتی ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”لنڈن میں اکیلی تھی، تو کوئی بنانا سیکھ لیا
 تھا۔“

شندی نے کیٹل میں پانی ڈال کر اُبالنے کے لئے رکھ دیا۔
 ”میرے لئے بلیک کوئی۔ اینڈ تو شوگر۔“ اُس نے بتانا ضروری سمجھا۔
 ”مجھے اندازہ تھا۔“
 ”کیسے؟“
 ”پتہ نہیں۔“
 ”یاد نہیں، پتہ نہیں۔ کبھی ہاں بھی کہہ دیا کرو۔“ وہ اُسے کام کرتے دلچسپی
 سے دیکھ رہا تھا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔
 تبھی۔۔۔ ہاتھ میں نوٹ بک لئے اُس دن وانا انٹرنی آ گیا۔ یہ ایک سکول
 سٹوڈنٹ تھا، انٹرن شپ کر رہا تھا یہاں، مریضوں کی شکایات نوٹ کرتا تھا۔ اپنے
 پاس!
 ”میڈم اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اُس نے خوش خلقی سے پوچھا۔
 ”اچھی ہوں، تھینک۔ یو۔“
 یاور خان اس دوران کھڑکی سے اُس پار دیکھنے لگا تھا۔

آپریشن تھیٹر میں رہا۔ اُس کے بعد آفس گیا۔ اب چھ بجے چھٹی ہوئی ہے، تو تمہارے سامنے ہوں۔“ اُس نے تفصیل سے بتایا۔
 ”اور... اگر وہ... ڈاکٹر نادیہ آگئیں؟“ وہ کپ میں جھج چلاتے ہوئے بولی۔

اُسے ہنسی آگئی۔

”اُس سے میں ڈرتا ہوں کیا؟“

شاید... کچھ کچھ۔“ اُس کا کپ اُسے تھماتے ہوئے اُس نے بھی اُسے چھیڑا۔

پہلی ملاقات میں نادیہ نے اُس کی ’ہیلو‘ کا جواب لا پرواہی سے دیا تھا۔ جیسے وہ اتنی اہم نہ تھی کہ یاور خان اُس سے اُس کا تعارف کرواتا۔ دوسری بار گو وہ اُس کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ مگر اُس کی بات میں طنز صاف محسوس کیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ شندی ہی کی وجہ سے ایسا کر رہی تھی۔

وہ خاصی دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ ایک بار پھر وہ دلآویزی سے ہنسا۔
 ”نہیں۔ کچھ کچھ بھی نہیں۔“

”ایک بات کہوں؟“ اپنا کپ لیکر وہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
 ”ہاں۔ کہو۔“

”اُن کو میں اچھی نہیں لگتی۔“

اچھی ابزرویشن تھی اُس کی!

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”تمہیں کیسی لگتی ہے؟“

شندی نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔

”وہ ایک ڈاکٹر ہیں اور میں ایک پشٹ۔ بس!“

”ہوں...“

”اُن کو میں کیوں اچھی نہیں لگتی؟“ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔
 جانے کیا جاننا چاہتی تھی وہ؟

”اُم م۔ پوائنٹ ہے۔ تم کیوں اُسے اچھی نہیں لگتیں۔ سوچنا پڑے گا...“

”وہ آپ کو Like کرتی ہیں؟“ اُس نے اچانک پوچھا۔

وہ مسکرا دیا۔ سوال خاصا ذاتی تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اُسے اچھا لگا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”I'm sure about it.“ وہ وثوق سے بولی۔

اُس کی گھنی پرکشش بھونیں اوپر اٹھ گئیں۔

”آپ بھی اُن میں Interested ہیں؟“

یاور خان چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

گوڈ! خود اُس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں اُس کے لئے دلچسپی بہت واضح تھی!

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو اُس کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھے

تھے۔ جب اُس نے اُسے ’ہیلو‘ کہا تھا تو جواب دیتے ہوئے اُس کی لمبی خمیدہ

پلکیں اُس کی خوبصورت آنکھوں پر سائبان بنا گئی تھیں۔ جب سسڑنے اُسے بتایا

تھا کہ وہ بار بار اُس کا پوچھ رہی تھی۔ تو بلبش ہوتی۔ وہ اپنے ناخنوں سے کھینے لگی

تھی۔ اُس وقت بھی اُس نے محسوس کیا تھا آج وہ کچھ بدلی بدلی سے لگ رہی تھی۔

بہر حال۔

”چھوڑو، کام کی بات کرتے ہیں۔“ وہ بات کا رخ بدلنے کی خاطر بولا۔

کل صبح تمہارے سچر کل جائیں گے۔ بارہ بجے تک میں تمہیں یہاں سے لے

جاؤں گا۔ you are perfectly fine now دوائیاں تم گھر پر بھی

لے سکتی ہو۔“ اُس نے خالی کپ میز پر رکھا۔

وہ سمجھ گئی وہ بات کو ٹال گیا تھا۔ شندی نے بھی کمال ضبط سے اپنی

feelings پر قابو پا لیا۔ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

باہر پھر آسمان میں آتش بازیاں ہونے لگی تھیں۔ بجلیاں کڑک مرج رہی تھیں۔ اور موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔
”یہاں بہت frequently بارش ہوتی ہے۔“ شندی نے بھی بات بدل لی۔

”رات ڈرتو نہیں لگے گا؟“

”لگے گا تو“۔ وہ بالکل دو چار روز پہلے کی طرح یوں بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

”پھر؟“ وہ بھی پہلے ہی کی طرح بولا۔

”کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”میں سسٹر سے کہوں گا وہ رات کو تمہارا خیال رکھے گی۔“

”نہیں۔ میں کچھ کر لوں گی۔“

”کیا کرو گی؟“

”جو اُس رات کیا تھا۔“ وہ خوبصورتی سے مسکرائی۔

”اُس رات کیا کیا تھا؟“ شندی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے اُسے

ڈھیر ساری خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

”آپ ہنسیں مگر تو نہیں؟“

”نہیں ہنسوں گا۔“

”پرومس؟“

”پرومس۔“

”میں نے لائیت آن رکھی تھی۔ اور کبل میں سر تک چھپا لیا تھا۔ پھر نیچے چمٹا

کر آ نکھیں زور سے بند کر لی تھیں۔“

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے اُس پر ترس سا آیا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے شفقت

سے اُس کا ہاتھ سہلایا۔

”بس آج کی رات اور۔ کل انشاء اللہ تم گھر پر ہو گی۔ انکل ذوالفقار کا گھر تمہاری اسٹکی کے بالکل دامن میں ہے۔ اور میرا گھر تمہارے بالکل قریب۔ چوکیدار نے آج سے ہی تمہارے یہاں ڈیوٹی شروع کر دی ہے۔ اور ماما الفت کل شام کوٹرین سے پہنچنے والی ہیں۔“

”ماما الفت آ رہی ہیں؟“ مارے خوشی کے اُس کی بہت حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”اُن کا پتہ آپ نے کیسے لگایا؟“ آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔

یاور خان نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو خشک کئے۔

”میں نے سب کا پتہ لگالیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں فارغ بیٹھا ہوں۔ اکرم بابا کا بھی پتہ چلا لیا ہے۔ وہ اپنے گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ نواز مجھے سب بتاتا رہتا ہے۔ مسز علی تو تمہارے چچا کے حویلی پہنچنے سے قبل ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ تمہارے چچا کسی گاڑی کے ساتھ تمہارے فرار پر بہت پریشان ہیں۔ نواز کو بھی نوکری سے نکال دیا ہے۔ تمام گاڑی کی بھی چھٹی کر دی گئی ہے۔ نئے دو گاڑی رکھ لئے گئے ہیں۔ اور کوئی نہیں ہے اب حویلی میں۔ میں نے تمہارے بارے میں سب انکل ذوالفقار کو بتا دیا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ تمام قانونی باریکیوں سے واقف ہیں۔ خاصی تسلی دی ہے مجھے اس سلسلے میں۔ سو۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اپنے سب دکھ سب پریشانیاں مجھے دیدو۔ تم بس خوش رہا کرو۔ ہنسی رہا کرو۔ تمہیں پتہ ہے تم ہنسی ہو تو کتنی اچھی لگتی ہو۔“

شندی کوروتے میں ہنسی آ گئی۔

دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج بہت حسین تھا۔ اُس نے شرارت سے آنکھیں جھپکیں۔

”لڑکی تم تو بہت خوبصورت ہو۔ کیا بنے گا؟“

وہ مزید ہنس دی۔

اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پردے بند کر دیئے۔

”پردے بند ہی رکھو تو اچھا ہے۔ اتنی خوبصورتی لڑکی کو دیکھ کر کسی کا دل بے ایمان ہو گیا تو؟“

اب کے وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”اور یہ جلتی رنگ بھی کسی اور کے سامنے مت بجانا۔“ اُس کا اشارہ اُس کی مترنم ہنسی کی طرف تھا۔

”آپ کے سامنے خیر ہے؟“ وہ یوں ہی بولی۔ مگر۔

جانے کیوں؟ یا درخان چونک سا گیا۔

”آں۔ ہاں۔“ وہ خوشگوار سی ہنس دیا۔

شندی بھی اُس کی بے سرو پا باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

”اب چلوں گا میم شاندانہ۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”کل تیار رہنا۔ گھر چلیں

گے، ہاں۔“

”جی۔“

”Take care of your self.“ اُس نے اپنائیت سے اُس کا

گال تھپتھپایا۔ ”Good night“ اُس نے مزید کہا۔ اور۔

قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

”گڈ نائٹ۔“ شندی آہستہ سے بولی۔

باہر نکلتے ہوئے وہ نرسز کاؤنٹر پر آ گیا، سسر نرسز کو کل شندی کا ڈسچارج

سلیپ تیار رکھنے کو کہا اور۔

لفٹ سے نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

شہر سے مضافات میں آیا ہی تھا کہ برف کے Flakes گرنا شروع

ہوئے۔ دائیں، بائیں پہاڑیوں کے نیچے پتلی چکر دار سڑک پر وہ احتیاط سے

ڈرائیور کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

بائیں جانب نادیاہ کے گھر کو راستہ جاتا تھا۔ اُس نے ایک نظر اُس طرف

ڈالی اور آگے نکل گیا۔

آج بھی نادیاہ نے اُسے گھر ڈراپ کرنے کو فون یا کوئی میسج نہیں دیا تھا۔

شاندانہ کی وجہ سے جو دونوں میں ٹکرا رہی تھی۔ اُس کے بعد سے نادیاہ پھر اُس

سے بات نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ Expect کر رہی تھی کہ حسب معمول وہ

اُسے فون کرے گا، منائے گا۔ مگر اس بار اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ معمولی سی بات

پر اُسے ’شٹ اپ‘ اور ’یکواس‘ نہیں کر دے کہنے کا حق وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ آج

آپریشن تھیر میں وہ پھر اُسے Ignore کر رہی تھی۔ مگر اُس نے بھی کوئی پرواہ

نہیں کی تھی۔ مگر Tense ضرور تھا۔ مگر۔

شام کو شندی سے ملا۔ تو ساری کوفت جاتی رہی۔

کتنی ڈینٹ تھی۔ کتنی پیاری باتیں کرتی تھی۔ کوالٹی لائف کی عادی ہونے

کے باوجود کتنی modest تھی!

’آپ بھی اُن میں Interested ہیں؟‘ شندی نے اُس سے نادیاہ کے

بارے میں پوچھا تھا۔

یا درخان چونک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں

اپنے لئے دلچسپی دیکھ کر جانے کیوں وہ گھٹی سا محسوس کرنے لگا تھا۔

’چھوڑو، کام کی بات کرتے ہیں۔‘ وہ بات کو ٹال گیا تھا مگر۔

وہ صاف سمجھ گئی تھی۔ کہ وہ نادیاہ میں Interested تھا۔ کتنے ضبط سے

اُس نے اپنی feelings پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ اُس وقت پتہ نہیں

کیوں اُسے اپنا آپ بہت بے حس سا لگا تھا!

اُس کے بعد۔ وہ بالکل یوں بول رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اتنی سی عمر میں کتنے ٹھنڈے مزاج کی، اور باوقاری تھی!

دائیں جانب گھر کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ تو شیشہ ڈر اساکھول دیا۔

حب معمول باغوں، دریاؤں اور جنگلوں سے آتی خوشبوؤں نے اُسے موہ لیا۔ برف خاصی تیز پڑنے لگی تھی۔ اُس نے شیشہ دوبارہ بند کیا۔ اور موسم کے سحر سے مسحور دھیرے دھیرے اوپر بڑھنے لگا۔

ڈنر پر آج حمید نے دستکھیل سوپ اور چکن منچورین کے ساتھ چاول بنائے تھے۔ یہ سب وہ یاور خان کے کہنے پر اکل ڈوالفقار کی بیگم، آنٹی نور جہاں سے سیکھتا رہتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آیا۔ رین کوٹ پہنا، ہڈ سر پر درست کیا، اور جیبوں میں ہاتھ دیتے ہوئے بالکنی میں آکھڑا ہوا۔

برفباری اب بھی جاری تھی۔ کیا بستی کی چھتیں، کیا قد آور درخت، کیا کھائی کیا ڈھلان، سبھی برف سے ڈھک گئے تھے۔ ایسے میں اوپر تلے بکھرے مدھم سے روشن گھروندے کسی ماہر فنکار کا شاہکار لگ رہے تھے۔

یہاں قدرت اپنے سحر و افسوں کے سارے رنگ لئے تھی! کچھ دیر وہ وہیں کھڑا اطراف پر نظریں جمائے رہا۔

پھر۔ اندر آ گیا۔ کپڑے تبدیل کئے، ٹائمٹ سوٹ پہنا، اور نرم و گداز بستر میں پشت تکیوں سے ٹکاتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ نیوز سنتے سنتے ہی اُس نے حب معمول ہو سٹیل فون کیا۔ آج جس مریض کا آپریشن کیا تھا، اُس کا حال دریافت کیا، اپنی تسلی کی۔ پھر ٹی وی اور لائیٹ آف کی اور بستر میں لیٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

تبھی اُسے نادیہ کا خیال آ گیا۔ کر لے اُس سے بات؟ کچھ قصور اُس کا بھی تو ہوگا۔ تنگی بڑھانے سے فائدہ؟ ہاتھ بڑھا تے ہوئے اُس نے ریسور اٹھالیا۔

لیکن۔ بجائے صلح کرنے کے وہ الٹی پڑ گئی تو؟ رات بھی پریشانی میں

گزرے گی۔ اُس نے ارادہ بدل دیا۔ ریسور واپس کریدل پر رکھ دیا۔
’میں نے لائیٹ آن رکھی تھی۔ اور کبل میں سر تک چھپا لیا تھا۔ پھر تکیہ چٹا کر آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں۔‘

جانے کہاں سے شندی کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔
غیر ارادی طور پر ایک بار پھر اُس کا ہاتھ بڑھا۔ ریسور اٹھایا۔ اور شندی کے کمرے کا نمبر ڈائل کر دیا۔

’Who is this?’ شندی کی سہی سہی سی آواز آئی۔ کہ رات کے گیارہ بجے اُسے کون فون کر سکتا تھا؟

’This is Yaawar speaking.’ اُس کا ڈر دور کرنے کو وہ خوشگوار سے بولا۔

’اوہ۔‘ نجات کے ساتھ ساتھ اُس کی آواز میں خوشی کا عنصر بھی تھا۔

’بارش اب بھی ہو رہی ہے؟‘ اُس نے پوچھا۔

’ہاں۔‘

’تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟‘

’نہیں۔‘ وہ مسکرا دی۔

’بڑی بولڈ ہو گئی ہو۔‘

’وہ مسکرا دی۔ چپکے سے۔‘

’سسڑا آتی رہتی ہے؟‘ اُس نے مزید پوچھا۔

’ابھی ابھی ہو کر گئی ہے۔‘

’اسی لئے ڈر نہیں لگ رہا۔ میں سمجھا واقعی بولڈ ہو گئی ہو۔‘

’مجھے صرف آسمان گرجنے سے ڈر لگتا ہے۔‘ وہ سادگی سے بولی۔

’اس وقت تو نہیں گرج رہا؟‘ اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

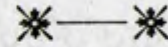
’نہیں۔‘ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”او کے۔ بس یہی پتہ کرنا تھا۔“

”جھینک پوسوچ۔“

”گڈ ٹائیٹ۔“ یاور خان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے گہرے سکون کا احساس ہوا۔ ایک بار پھر آنکھیں بند کیں۔ اور دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اُترنے لگا۔



دو پہر کا ایک بج رہا تھا جب یاور خان شندی کو انکل ذوالفقار کی اینٹکی میں لے آیا۔ چوکیدار اُس کا مختصر سا سامان اندر لایا۔ یاور خان نے اُسے اینٹکی اندر سے دکھائی۔ دو بیڈرومز، بونگ روم، جدید طرز پر بنایا راسا کچن اور مین روڈ کے رخ کھلتا ٹیریس!

وہ ٹیریس پر سے سامنے دیکھنے لگی۔ اینٹکی کے بالکل نیچے انکل ذوالفقار کا گھر تھا۔ ان کے بائیں قدرے اوپر یاور خان مقیم تھا۔ سب سے اوپر ٹاپ پر اینٹکی تھی۔ سبھی گھروں کے ٹیریس نیچے مل کھاتی مین روڈ کے رخ پر تھے۔ تمام بیڈرومز کی بالکنیاں پیچھے بستی کی طرف ڈھلانوں، بھیتوں اور باغوں کے رخ کھلتی تھیں۔ اور گہری سبز ہریالیوں میں سے جھانکتیں گھروں کی سرخ کھیریل کی

ڈھلانی چھتیں بہت دلکش لگ رہی تھیں!

”Every thing is so enchanting here.“ وہ مبہوت سی

بولی۔

”میں نے کہا تھا تا تم سے کہ تمہیں یہ جگہ پسند آئے گی۔“

”لیکن... میں... کب تک یہاں رہوں گی؟... آگے کیا کروں گی؟“

کتنے مسائل تھے اُس کے آگے۔ زبان پر آ ہی گئے۔

”پلیز! اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں۔ تم کب تک یہاں رہو گی؟ آگے کیا

کرو گی؟ یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تمہارا نہیں۔“

”مگر...“

”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟“

شندی نے اُس کی طرف دیکھا۔

خلوص ہی خلوص تھا اُس کی آنکھوں میں!

”آپ... بہت اچھے ہیں۔“ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

آج سے اُس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا تھا۔ انجانے راستوں سے

نا آشنا گھبراتا تو تھا ہی اُس نے!

”آؤ تمہیں بالکنی سے پچھلی سائڈ دکھاؤں۔“ وہ اُس کی پریشانی سمجھ رہا تھا۔

اُس کا دھیان بٹانے کو اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لاتے ہوئے ماسٹر بیڈ میں سے

گزار کر بالکنی میں لے آیا۔

دائیں بائیں اور سامنے دور تک پچھلی ڈھلان پر ٹین کی چھتوں والے

گھروندے، چھوٹی چھوٹی ہری ہری ٹیرسڈ کھیتیاں، پرلی طرف بہتی ندی، ندی

کنارے دور تاحد نگاہ سیب اور خوبانی کے باغ، اور بالکل پاس ایک جھاڑی

اپنی ٹہنیوں پر سرخی مائل کاسنی پھولوں کے چھوٹے چھوٹے لالٹین روشن کئے

انہیں تک رہی تھی!

وہ مسحوری ہو گئی۔

”یوں لگتا ہے جنت زمین پر اتر آئی ہے۔“ وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

”اور تم نے اس جنت کی ناشکری کی تا تو...“ اُس نے زور سے اُس کا کان

پکڑا۔

”نہیں کروں گی۔ بالکل نہیں کروں گی پلیز!“ اُسے تکلیف ہونے لگی تھی۔

اور اُس نے اُس کا کان چھوڑ دیا۔

”اچھا میں اب جاتا ہوں۔ تمہارے لئے کھانا بھجواتا ہوں۔ پھر تم ریٹ کر

لینا۔ رات آٹھ بجے آنٹی اور انکل نے ہم دونوں کو ڈنر پر بلایا ہے۔ وہاں جائیں

گے۔ اور وہاں سے میں سیدھا سٹی جا کر ریلوے سٹیشن سے تمہاری ماما کو لیکر

آؤں گا۔“

”وہ... آپ کا ڈرائیور لینے نہیں جا سکتا؟“ اُس کے اتنے سارے

احسانوں کے بعد اب تو اُسے شرمندگی سی ہونے لگی تھی۔

اور میوہ خان کا خیال آتے ہی وہ زور سے ہنس دیا۔

”میرا ڈرائیور تمہاری ماما کی جگہ کسی اور کو اٹھالائے گا۔“

وہ بھی ہنس دی۔

”رات آٹھ بجے تیار رہنا، ہاں۔“

”جی۔“

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ کل سے وہ واقعی کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ جھکی جھکی پلکیں

لئے کچھ مودب طریق سے ’جی‘ کہتی وہ اُسے بہت اچھی لگی!

”اوکے۔“

وہ بالکنی سے بیڈ روم میں اور پھر مختصر سے کوریڈر میں سے ہوتا پچھلے

دروازے سے اینٹنسی سے باہر آ گیا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ چند قدم آگے جا کر

وہ ڈھلان اترتے ہوئے اپنے کچن کے گرد گھومتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شدی واپس پٹی۔ کوریڈور کے دائیں طرف کچن تھا۔ سامنے لوگ روم تھا۔ لوگ روم میں دائیں طرف دونوں بیڈرومز کے دروازے کھلتے تھے۔ بائیں جانب مین دروازہ تھا، جو باہر ٹیریس میں کھلتا تھا۔ جدید طرز پھر بنی آرام دہ اینٹکی فلی فرنشڈ تھی۔ اُسے حیرت بھی ہوئی، دونوں بیڈرومز میں چوڑے آرام دہ بیڈز پر صاف سترے بستر بھی لگے تھے۔ کچن میں کچھ ضروری برتن اور چائے وغیرہ کا سامان بھی رکھا تھا۔ یہ اہتمام بھی یقیناً یاور خان نے کیا تھا۔ بہر حال۔

اُس نے اپنا مختصر سا سامان اپنی اپنی جگہ پر رکھا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے کپڑے تبدیل کئے۔ اور بستر میں لیٹ گئی۔ تھک گئی تھی، کمزوری ابھی بھی باقی تھی۔ انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کی آگ نظروں کو بھلی لگ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چوکیدار نور محمد نے کوریڈور کی طرف پچھلے دروازے پر دستک دی۔ حمید اُسے شدی کے لئے کھانا دے گیا تھا۔

شدی نے دروازہ کھولا۔ نور محمد نے بہت ادب سے اُسے سلام کیا۔ ”بی بی۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر سے کھانا آیا ہے۔“ وہ ٹرے ہاتھوں میں لئے تھا۔

شدی اُس سے ٹرے لیکر لوگ روم کے دائیں کونے میں لگی خوبصورت گول ڈائینگ ٹیبل پر آگئی۔

یاور خان نے تو پوری دعوت کر دی تھی اُس کی۔ کئی کھانے، فروٹ وغیرہ۔ پایا کے دوست کا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اتنا کچھ کر رہا تھا۔ کہ وہ اُس کے احسانوں تلے دبتی اب تو Embarrassed محسوس کرنے لگی تھی۔

کھانا کھاتی، فل لینتھ کھڑکیوں سے باہر جنت نظیر نظاروں پر نظریں جمائے وہ اُسی کے ہی بارے میں سوچتی رہی۔

کھانے کے بعد وہ برتن سمیٹنے لگی۔

’اتنے سارے ملازم موجود ہیں۔ تم کیوں خواہ مخواہ خود کو جھنجٹ میں ڈالتی

ہو۔‘ جانے کہاں سے پاپا کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

ایک بار پاپا کی سٹڈی میں کوئی پینے کے بعد وہ برتن ٹرے میں رکھتے ہوئے ٹرے اٹھا کر کوریڈور میں نکلنے لگی۔ تو پاپا نے یہی کہا تھا اُسے۔

ادہ پاپا۔ کہاں ہیں آج آپ؟ آپ کی لاڈلی بیٹی کتنی در بدر ہوئی ہے۔ اُس کی حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔ اپنی پلیٹ اور چمچ دھو لئے۔ پچھلے چند ماہ لنڈن میں رہ کر اُس نے چھوٹے چھوٹے کام سیکھ لئے تھے۔ ورنہ حویلی میں تو اُسے پانی کا گلاس تک بھرنے نہیں دیا جاتا تھا۔ آج پہلی بار اُس نے سوچا۔ اتنا لاڈ پیار، اتنا ناز و نعم اچھا نہیں ہوتا۔ کل کا کیا پتہ اس آئے نہ آئے!

ماما الفت نے شدی کو گلے لگایا۔ تو اُسے لگا پاپا کی ڈیجھ آج ہی ہوئی تھی۔ اتنا تڑپ تڑپ کر روئی، اتنا چیخ چیخ کر روئی کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔ ماما الفت تو صاحب کے علاوہ اپنی بیگم صاحبہ کو بھی یاد کر کر کے روتی رہیں۔ کیا وقت تھا اور کیا دور تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔

شدی کچھ حواسوں میں آئی۔ تو خیال آیا۔ ماما اتنی دور سے تھکی تھکائی آئی تھیں۔ اُن کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہئے تھا۔

آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن میں گئی۔ دوپہر کا ڈھیر سا کھانا اب بھی پڑا تھا۔ گرم کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے ماما آ گئیں۔

”اے بیٹی کیا کر رہی ہو؟“ وہ کچھ حیرت سے بولیں۔

”آپ کے لئے کھانا گرم کر رہی ہوں۔“

”ہٹو۔“ اُنہوں نے اُسے پرے کیا۔ ”کام کریں تمہارے دشمن۔ میرے کیا ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں کہ تم گرم کرو گی۔“

تجی پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ ماما سب چھوڑ چھاڑ اُس طرف لپکیں۔

شندی ساتھ آگئی کہ ماما تو کسی سے بھی واقف نہیں تھیں۔

ماما نے دروازہ کھول دیا۔ میوہ خان ٹرے میں کھانا لئے کھڑا تھا۔

”چھوٹی بی بی۔ میں ہوں میوہ خان، ڈاکٹر صاحب کا ملازم خاص۔ آپ کی ماما کے لئے کھانا لایا ہوں۔“ وہ نظریں نیچی کئے بولا۔

وہ واقعی بہت خاص تھا۔ سرخ ادنی ٹوپی، گہرا سبز پاؤں تک لمبا کوٹ، بلیک لونگ شوز، دیہاتی لب ولہجہ اور۔۔۔ بے شمار سرمہ لئے آنکھیں اتنی نیچی کئے کہ سر بھی ساتھ جھک گیا تھا۔

شندی کو وہ بہت سیدھا سادا اور اچھا لگا۔

”بہت شکریہ میوہ خان۔ مگر یہاں تو دو پہر کا بھی سارا کھانا اسی طرح پڑا ہے۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ بھی رکھ لیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔“ اُس نے ٹرے آگے بڑھائی۔ نظریں پہلے سے بھی نیچے چلی گئیں۔

ماما نے ٹرے لے لی۔ دروازہ بند کیا۔ اور دونوں واپس آگئیں۔

ماما نے کچن میں ہی کھانا کھایا۔ اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی۔ اور شندی کے کمرے میں آتے ہوئے جیسے مدتوں بعد اپنے گودوں پالی شندی کے ساتھ پاؤں کی طرف بستر میں بیٹھ گئیں۔

شندی نے نم آنکھوں اور گلوگیر آواز میں انہیں سب بتا دیا۔ کیسے انکل جہانگیر نے اُسے حویلی میں بند کر رکھا تھا، کیسے طرح طرح سے ڈراتا تھا، کیسے سرفراز سے اُس کے نکاح کا منصوبہ بنایا تھا، کیسے وہ وہاں سے نکل بھاگی تھی، اور کیسے ڈاکٹر یاور خان نے اُسے وہاں سے نکلنے میں اُس کی مدد کی تھی۔

شندی نے ماما کو ماموں جان کے بارے میں بھی بتایا۔ جو بہت مکاری سے مسز علی کے ساتھ ساز باز کر کے اُسے زہر دلوار ہے تھے، اور اب اُسے یقین ہو گیا تھا زہر اُس دودھ میں ہوتا تھا جو مسز علی ہر رات اُس کو دینا نہیں بھولتی تھی۔ وہ بھی حیران تھی کہ اور تو کسی چیز کے لئے کبھی پوچھا نہیں تھا دودھ اپنے ہاتھ سے بلاناغہ

لے آیا کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ سخت کمزوری محسوس کرتی۔ پھر یاور خان نے ہی اُسے خبردار کیا۔ اُس کے Investigations کے رپورٹس میں بھی زہر کے Traces پائے گئے تھے۔

ماما ہکا بکا سب سن رہی تھیں۔ پھر شندی کا سراپنی گود میں رکھتے ہوئے بے اختیار رو دیں۔ شندی بھی رونے لگی۔ دونوں دیر تک روتی رہیں۔

شندی روئی تھی، بے گھر ہوئی تھی مگر۔

آج ماما کو اپنے پاس پا کر جیسے دل کو بہت ڈھارس ملی تھی، بڑا حوصلہ ملا تھا۔ وہ جواستے دن اجنبی اجنبی سے ماحول میں خود کو تنہا محسوس کرتی تھی، وہ احساس جاتا رہا تھا۔ اب اُس کی اپنی ماما اُس کے پاس تھی۔ امی اور پاپا کے بعد وہ ہی تو تھیں اُس کی سب کچھ۔ اپنا علاقہ نہ سہی کوئی اور سہی۔ اب وہ اکیلی تو نہیں تھی۔ پھر۔ علاقہ لاکھ اپنا ہو، اپنے بندے نہ ہوں تو وہ اجنبی ہی لگتا ہے۔ علاقہ لاکھ اجنبی ہو، اپنے لوگ ساتھ ہوں تو وہ اجنبی نہیں لگتا۔

”بس میرا بچہ۔“ ماما خود آنسو پونچھتے ہوئے اُس کے بھی آنسو پونچھنے لگیں۔ ”اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ سب ٹھیک کرے گا۔ وہی کارساز ہے، مسبب الاسباب ہے۔۔۔“ ”ہاں ماما۔ مجھے اپنے خدا پر بہت بھروسہ ہے۔ وہی سب ٹھیک کرے گا۔ مجھے یقین ہے۔“ وہ سر اٹھاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

ماما نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”ماما آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ اچانک اُس کی نظر نیچے بیڈ کے پاس رکھی چائے کے کپ پر پڑی۔

”جاتی ہوں۔ گرم کرتی ہوں اسے۔“ انہوں نے کپ اٹھایا اور کچن چل دیں۔

رات کا ایک بجنے کو تھا۔ شندی ماما کی مختصر بستر کی پشت سے ٹکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آج تو ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ اُس نے سونے کو بہت

وقت پڑا تھا۔

ماما جلدی ہی آگئیں۔ پھر سے اُس کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے پیر اُس کے نرم و گرم بستر میں چھپائے۔ کچھ سوچتی بھی جارہی تھیں، چائے بھی پیتی جارہی تھیں، اور باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ چائے پی کر انہوں نے خالی کپ نیچے رکھا۔

”بیٹی“۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے تسلی کرنا چاہتی تھیں کہ اُن کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا تھا۔ ”تمہارے پاپا کو تمہارے بچانے کو لی ماری ہے۔“

”کیا؟“ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”ہاں بیٹی۔ اکرم بھیانے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ صاحب اپنی لائبریری میں اپنا اسلحہ نکالے قالین پر بیٹھے صاف کرنے میں مشغول تھے۔ تمہارے چچا ساتھ ویسے ہی نیچے بیٹھے تھے۔ اسی دوران اکرم بھی انہیں چائے دینے اوپر گیا۔ دروازہ اُدھ کھلا تھا۔ کوریڈور میں سے سب نظر آ رہا تھا۔ اکرم بھیا بتا رہا تھا اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے جہانگیر صاحب نے پستول اٹھایا اور اُن پر گولی چلا دی۔ اکرم بھی گھبرا کر اٹھے قدموں واپس چل پڑا۔ راستے میں، مین مل گئی۔ اُس نے ساری بات مجھے بتادی۔ میں نے کہا۔ ”نچپ۔ منہ سے ایک لفظ بھی اور نہ نکال۔“ پھر کھرام مچ گیا۔ جہانگیر صاحب نے سب کو یہی بتایا کہ صفائی کرتے کرتے غلطی سے پستول چل گیا اور گولی خود اُن کو لگ گئی۔“

شندی پہلے ہی کمزور اور پریشان تھی۔ اوپر سے اس قدر بھیانک انکشاف۔ وہ آہستہ سے تکیوں پر لڑھک گئی۔

”شندی بی بی۔ شندی بی بی۔“ ماما نے اُسے پکارا۔ پھر جھنجھوڑا۔ مگر کوئی جواب نہ ارد۔

”ہائے میری بچی“۔ وہ بستر سے نکلیں۔ ”ہائے کیا ہوا میری بچی کو“۔ انہیں

کچھ سوچھ نہیں رہا تھا۔

پھر وہ بھاگیں کچھلی طرف۔ حید جب انہیں شاندا نہ کے پاس لا رہا تھا تو اینٹکی کے بالکل قریب ڈھلان پر پہلا گھر دکھایا تھا۔ جس میں نور محمد رہتا تھا۔ اور جس کو یاور خان نے اینٹکی کی چوکیداری سونپی تھی۔

”اے بھیا...“ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگیں۔ افراتفری میں نور محمد کا نام یاد نہیں رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اُس نے فوراً دروازہ کھولا۔

”میں چھوٹی بی بی کی کی ماما ہوں۔ اُن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ بھاگا یاور خان کے گھر کی طرف۔

تھوڑی ہی دیر میں یاور خان آ گیا۔ نور محمد فرسٹ ایڈ بکس لئے ساتھ تھا۔ شندی کے بیڈروم پر دستک دیتا یاور خان اندر آ گیا۔

”اوسان خطا ماما پائینی بیٹھیں شندی کے پیر مل رہی تھیں۔ شندی تکیوں پر بے سدھ پڑی تھی۔

وہ فوراً پاس چلا آیا۔

”شاندا نہ۔ شاندا نہ...“ اُس نے اُس کا کندھا ہلایا۔ مگر اُسے ہوش ہوتا تو کچھ رسپانس دیتی نا!

وہ اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

”شاندا نہ۔ شاندا نہ...“ وہ اُس کا چہرہ ہلا جلا رہا تھا، کان Pinch کر رہا تھا۔

اور شندی کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ آنکھیں کھول دیں۔ ارد گرد دیکھا۔

”شاندانہ“۔ یاور خان اب بھی اُس پر جھکا ہوا تھا۔
اُس کی آواز پر اُس نے یاور خان کی طرف دیکھا۔ اور پھر۔ اُس کی
خوبصورت آنکھوں میں قدیلیں سی جل اٹھیں۔

یاور خان آج بھی چونکا۔ ان قدیلوں میں وہی روشنی تھی جو کل ہوسپتال میں
اُس کی آنکھوں کے جلنے دیپوں میں تھی۔ مگر۔
دوسرے ہی لمحے قدیل بجھ گئے۔

”آپ...؟“ وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”لیٹی رہو پلیز!“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”اما۔ شاندانہ کے لئے گرم دودھ میں چینی ملا کر لائیں۔“ وہ ماما سے بولا۔

”جی اچھا“۔ ماما شندی کی طرف سے مطمئن ہو کر کچن چل دیں۔

”کیسی ہوا ب؟“ وہ پھر سے شندی کی طرف متوجہ ہوا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اُس کی آواز میں نقاہت تھی۔

ماما سے مل کر یقیناً وہ بہت زیادہ روئی تھی۔ اُس کی سرخ متورم آنکھوں سے
لگ رہا تھا۔ دنوں بعد وہ اپنے فادر کی ڈیٹھ کے بعد کسی اپنے سے ملی تھی۔ ماما نے
ضرور آنکھوں دیکھا حال بتایا ہوگا۔ کنزور تو پہلے ہی تھی، برداشت نہ کرتے ہوئے
بے مدیش ہو گئی تھی۔

”آپ نے کیوں تکلیف کی۔“ وہ اُس کے بہت قریب بیٹھا تھا۔ وہ نظریں
اٹھائے بغیر ہی پھر بولی۔

اور۔ اُس کا خوشگوار قبضہ بلند ہوا۔

”تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ماما نے آدی بھیجا۔ تو میں کیسے تکلیف نہ کرتا۔“

”اوہ... ہاں۔“ اُسے دھیرے دھیرے ماما کی بات یاد آتی گئی۔ دو

آنسو لڑھک کر گالوں پر آرہے۔

”حوصلہ کرو شاندانہ۔“ اُس نے انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو

پونچھے۔ ”دکھ سکھ تو آتے رہتے ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔“ اُس کے دکھ میں وہ
بھی دکھی نظر آنے لگا تھا۔

”اتنی رات گئے آپ کو میری وجہ سے جاگنا پڑا۔“ وہ پھر نادم سی لگ رہی
تھی۔

”نومیم۔ میں تمہاری وجہ سے نہیں جاگا۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔ ”کل
رات سے آن کال ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہوسپتال سے لوٹا ہوں۔ کل رات بھی
دوبجے گیا تھا۔ میرا یہ پورا ہفتہ اسی طرح رہے گا...“ اُس نے اپنی ڈیوٹی کے
طریقہ کار سے اُسے آگاہ کیا۔

”کل رات بھی دو بج گئے تھے؟“

”ہاں۔“

”میرے کمرے میں کیوں نہیں آئے؟“ وہ شاکی لہجے میں بولی۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”دوبجے آ کر میں تمہیں کیسے ڈسٹرب کرتا۔“

”میں ڈسٹرب نہیں ہوتی۔“ جھکی نظریں لئے وہ ہولے سے بونی۔

وہ پھر چونک سا گیا۔ انجانے میں وہ اپنے معصوم سے جذبوں کا اقرار کئے جا
رہی تھی!

”اچھا اس وقت تو تمہارے پاس ہوں نا۔“

شندی نے ہنسکی جھالریں پلکیں اوپر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

شندی کی پلکیں تیز کر کر گئیں۔ مگر۔

اسکی بڑی بڑی خوبصورت گمرے بلو آنکھیں اُسے لمبے بھر میں ہی بہت کچھ کہہ

گئیں!

تجھی۔ ماما شندی کے لئے گلاس میں دودھ لئے آ گئیں۔

”شندی بی بی۔ اٹھو بیٹا۔ دودھ پی لو۔“ ماما اب بھی گلاس تھامے کھڑی

تھیں۔

”میں رکھ دیں ماما۔ بیٹی ہوں۔“ بستر میں سیدھی بیٹھتے ہوئے اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

ماما نے گلاس وہیں رکھ دیا۔ خود دوسرے کمرے میں اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کرنے چلی گئیں۔

”شندی بی بی۔“ گلاس اٹھاتے ہوئے یاور خان نے شرارت سے ماما کا ”شندی بی بی“ دہرایا۔ ”دودھ پیو۔ ختم کرو سارا۔“

اُسے اُس کا شانہ نام تو ویسے بھی بہت اچھا لگا تھا۔ اب شندی اور بھی اچھا لگنے لگا۔

شندی کوہنی آگئی۔ گلاس اُس سے تھامتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا۔

”ویسے۔ تم نے مجھے ڈرا دیا تھا۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ ماما کچھ بتا رہی تھیں اور میں سن رہی تھی۔ پھر... پتہ نہیں چلا...“ اُس کی آواز اب بھی کمزور تھی۔

”ماما نے کوئی خاص بات بتائی تھی کیا؟“

”اُم م... ہاں...“

”مجھے بتاؤ گی؟“

”کیوں نہیں۔ لیکن کل پلیز! اس وقت دہرانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“

”ہاں، ہاں۔ رپلیکس۔ کل بتا دیتا۔“

”آپ آئیں گے کل؟“ اُس کی نظروں میں Longing تھی۔

”کیوں نہیں آؤں گا۔“

”میرا خیال تھا کہ آپ بس ہسپتال تک ہی...“

”کیا مطلب ہسپتال تک؟“

”میں اب آپ کی پیشہ نہیں رہی تا۔“ وہ خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے

ہوئے بولی۔ اُس کا واقعی یہی خیال تھا کہ شاید اب ایسا ہو۔

اُس نے گہری سانس لی۔

”تم میری صرف پیشہ نہیں ہو۔ تم میرے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی بھی ہو۔“

اور میں رشتوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔ تم میرے لئے بہت Important

ہو... سمجھیں۔“

”جی۔“

اُسے پھر بہت اچھا لگا۔ شفقت سے اُس کا گال تپتہ پایا۔

”اب لیٹ جاؤ۔“ وہ بیڈ کے کنارے سے اُٹھ گیا۔

وہ لیٹ گئی۔ تو یاور خان نے اُس پر لحاف درست کیا۔ اور انگیٹھی میں جلتی

آگ کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ کچھ لیں گے؟ چائے؟ کوئی؟“

”کوئی نہیں۔ بس تھوڑی دیر تمہیں اور دیکھتا ہوں۔ پھر چلوں گا۔“

اور۔۔۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

”تم دوائیاں لے رہی ہونا؟“

”جی۔“

”میں میوہ خان کے ہاتھ ایک اور دوائی بھیجتا ہوں۔ اب بھی لو، اور لیتی رہو

ایک مہینہ۔ پھر بے ہوش نہیں ہوگی۔“

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”اب ٹھیک ہو تم۔ خدا نخواستہ کوئی بات ہو بھی تو فون کر دینا مجھے۔ میرا سیل

نمبر تو ہے نا تمہارے پاس۔“

”جی۔“

”اوکے۔ گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ۔“ شندی نے کہا۔

اور وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا کوریڈور میں نکل آیا۔

ماما نے اُس کا فرسٹ ایڈ بکس نور محمد کو پکڑایا۔ اور یاد خان کو ڈھیر ساری دعائیں دیتیں دروازہ بند کر کے شندی کے کمرے میں آگئیں۔

وہ اور ماما پھر سے باتیں کرنے لگیں۔ بلکہ اُسے یہ کہہ کر کہ وہ کمزور ہے خاموش کرایا اور خود شروع ہو گئیں۔ اُن کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ دنیا جہان کی خبریں ہوتی تھیں اُن کے پاس۔ جو وہ بقول اُن کے یا تو شندی کو سناتیں یا اکرم بھیا کو اور یا پھر جب اُن کی بیگم صاحبہ حیات تھیں اُن کو!

بے شمار باتیں ہوئیں۔ اُس کے لنڈن جانے کے بعد سے لیکر جہانگیر صاحب کے حویلی کے تمام پرانے ملازموں کو برطرف کرنے کے بعد اور پھر اُس کے بعد جو ماما پر گزری، سب شندی کے گوش گزار کر دیا۔ شندی کے ساتھ جو بچا اور ماموں نے کیا تھا۔ اُس پر بھی بے شمار روئیں۔ جھولی بھر بھر بد دعائیں دیتی رہیں ظالموں کو۔ اور یہ لمبی لمبی دعائیں دیتی رہیں ڈاکٹر یاد خان کو!

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ماما اُنھیں۔ شندی پر لحاف درست کیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے دودھ کا خالی گلاس اٹھایا اور۔ اُسے 'شب بخیر' کہتے ہوئے سونے کے لئے پاس والے بیڈروم میں چل دیں۔

شندی نے بھی لیپ آف کر دیا۔ بالکنی کی طرف کروٹ لی۔ آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ یاد خان در آیا۔ پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ یاد خان دور چلا گیا۔ بہت دور! اُس نے بے بس سی سانس لی۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔



دن آہستہ آہستہ مرک رہے تھے۔ نادیہ بدستور اپنی ضد پر قائم تھی۔ یاد خان بھی خاموش تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اُس نے نادیہ کی چپ میں چپ اختیار کر لی تھی۔ مگر ایک فرق تھا دونوں کی چپ میں۔ نادیہ اپنا وقت اچھا گزار رہی تھی۔ وہی تہقہ وہی شوخیاں۔ جبکہ یاد خان Tense تھا، اُپ سیٹ تھا۔ نادیہ اُسے اذیت دیکر خوش ہو رہی تھی۔ اور۔ وہ امن کا خواہاں تھا، سکون کا متنی تھا! صبح صبح نیچے ندی کنارے جو گنگ کرنے کے بعد وہ پگڈنڈی پر اوپر آ رہا تھا۔ شندی کی اینکسی کے پاس سے گزرنے لگا۔ تو بالکنی میں شندی کھڑی نظر آئی۔ وہ پاس چلا آیا۔ شندی کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر صبح کی پاکیزگی کا نکھار تھا۔ شبنم میں تر پھولوں کی تازگی تھی۔

”گلد مورنگ مہم۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”ہائے۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

”اتنی صبح صبح باہر کیوں کھڑی ہو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

”آپ بھی تو صبح صبح باہر نکلے ہیں۔“

وہ ہنس دیا۔ دلاویزی سے۔

”واقعی۔“ مجھے ٹھنڈ لگ گئی تو؟“ اُس نے شرارت سے کہا۔

”آپ کو زکام ہو جائے گا۔ ٹپیر پچر الگ ہوگا۔“

”پھر؟“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”پھر آپ ہوسپتال سے چھٹی کر لیں گے۔ بیڈ پر لیٹ جائیں گے۔“ وہ بھی

اپنی رو میں بولتی جا رہی تھی۔

”اور تم میری بیمار داری کرو گی۔“

”ہاں۔“ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

اور۔۔۔ یادِ خان کو لگا۔ دور کہیں پائیل بج اٹھے تھے۔

”اچھا۔ اب چلوں۔ ہوسپتال جانے کی تیاری کرنی ہے۔“

ساتھ ہی اُسے نادیدہ کا خیال آ گیا۔ چند پل جو بے فکری کے میسر آئے

تھے۔ کافور ہو گئے۔

اُس نے گہری سانس لی۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے۔

”کیا بات ہے؟ آپ فکر مند نظر آ رہے ہیں۔“ شندی نے اچھے دوستوں کی

طرح پوچھا۔

چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر اُس کی طرف دیکھا۔

”وہ۔۔۔ نادیدہ خفا ہے مجھ سے۔“ اُس نے بھی بہت اچھے دوست کی طرح

بتایا۔

”ادہ۔“ باوجود کوشش ضبط کے اُس کا رنگ پلج ہو گیا۔

”کئی دنوں سے کولڈ وار چل رہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے مزید بولا۔

”تو... آپ متالیں اُن کو؟“

ایک بار پھر اُس نے گہری سانس لی۔

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ حالانکہ غلطی اُس کی تھی۔ لیکن ماحول Tense ہو تو

میرا دم کھٹنے لگتا ہے۔“

”آج انہیں ضرور متالیں۔ آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

اُس نے نظر بھر کر شندی کو دیکھا۔ چھوٹی سی یہ اتخبل اُسے پسند کرتی تھی۔ مگر

ہمدردی اور ایثار ا وہ متاثر ہوئے بنانہ رہ سکا۔

”اچھا۔ ہائے۔“ اُس نے کہا۔

”ہائے۔“

اور۔۔۔ وہ اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

آخر کار۔۔۔ یادِ خان نے نادیدہ کو منا ہی لیا۔ سب ٹارٹل ہو گیا۔ اور یادِ خان

کے ذہن پر کا گراں بار ہلکا ہو گیا۔

اس وقت پھر نادیدہ اُس کے ساتھ کار میں بیٹھی گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ پہاڑیوں کے جنگلوں میں سیاہیاں اتر آئی تھیں اور۔۔۔ یہ

بڑا چاند چہار سو دو دھیا چاندنی بکھیر رہا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ یہ چاند کچھ کہہ رہا ہے۔“ یادِ خان نے خاموشی توڑی۔

”نہیں۔ چاند باتیں نہیں کرتا۔“ نادیدہ بولی۔

”غور سے سنو تو ضرور سنائی دے گا۔“ یادِ خان محرزہ سا بولا۔

”ادہ کم آن یاد۔ تم ڈاکٹر کم شاعر زیادہ لگتے ہو۔“

”پتہ ہے یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ اُس نے اُس کی اُن سنی کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بتاؤ۔ کیا کہہ رہا ہے۔“ وہ کچھ اکتائے سے لہجہ میں بولی۔

”یہ کہہ رہا ہے۔ کہ امن اور شانتی سے رہو۔ سکون سے ...“

”اچھا چھوڑ دو“۔ اُس نے اُس کی بات کاٹی۔ ”پتہ ہے ڈاکٹر کوثر کی کسی بزنس مین سے منگنی ہو گئی ہے۔ Millionaire ہے۔ یہ بڑے ڈائمنڈ کی انگوٹھی دی ہے منگنی میں۔“

”ہوں“۔ سڑک پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

پتہ نہیں کیوں اُس کے لب و لہجہ میں اُسے ملینئر کے لئے کچھ Greed سامحوس ہوا۔

”تم کیا دو گے مجھے منگنی پر؟“

”سوچوں گا“۔ اُس نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔

”بتاؤ نا۔“ وہ مچل گئی۔

”اور اگر میں غریب ہوا ڈائمنڈ نہ دے سکا تو؟“

یاور خان ایک ویل آف فیملی سے تھا۔ بہت مضبوط بیک گراؤڈ تھا اُس کا۔ مگر اُس کو یہ موضوع ہی اچھا نہیں لگا تھا۔

”اتنے غریب سے تو میں شادی کروں گی بھی نہیں۔“

”محبت غریبی تو نہیں دیکھتی ...“

”پھر شاعری۔“

معا۔ وہ مسکریں پر ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

یاور خان مسکرا دیا۔ واپس زآن کر دیئے۔ عجیب آنکھ چمکی تھی۔ فرلانگ بھر

پیچھے آسمان صاف اور یہاں بارش!

”ویسے۔ رات کو جب ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے پڑتے ہیں تو کتنا

Enchanting لگتا ہے نا۔“

”اور مجھے اُس شور پر سخت غصہ آتا ہے۔“

یاور خان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

”واقعی؟“

”ہاں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ جبکہ یہاں عام طور پر ٹین کی ہی چھتیں ہیں۔“

وہ چند پل خاموشی سے ڈرائیور کرتا رہا۔

”مجھے بادل، بارش، برفباری بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”ڈاکٹر خان۔ لفٹ پر موڑیں۔ موسم کے عشق میں آپ مجھے گھراتا رہتا بھول رہے ہیں۔“

اور۔ اُس نے گاڑی بائیں موڑ لی۔

نادیہ کو گھر پر چھوڑتے ہوئے وہ اپنی راہ پر ہولیا۔

تھوڑا سا سی آگے گیا تھا کہ بوندیں پڑنا بند ہو گئیں۔

آسمان اب پھر شفاف تھا۔ ان گنت تاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا پورا چاند جگمگا رہا تھا۔

اُس نے دائیں طرف اپنے روڈ پر گاڑی موڑ لی۔

تاروں کی بارات، چاندنی کا سحر، شبنمی ہوائیں اور۔ بہتی کی ہریالیوں کی مد بھری خوشبوئیں!

سحرزدہ سا آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اوپر اپنے بیڈ روم میں آیا۔ نرم و گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور اوور کوٹ پہنتے ہوئے بالکنی میں آکھڑا ہوا۔

نیچے تاحد نگاہ بہتی کے دیئے، اوپر تاحد نگاہ تاروں کے چراغ روشن تھے!

چھتی سردی جیسے ہڈیوں کے آر پار ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود حمید اُس کے لئے کوئی لایا۔ تو اُس نے بالکنی میں ہی لانے کو کہہ دیا۔

کوئی کی خوشبو من میں اتار تا وہ گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

تبھی اُسے بائیں جانب نور محمد کو پکارتیں ماما الفت سنائی دیں۔

”اچھا۔ بارش سے جب ٹین کی چھت بجے لگتی ہے تو تمہیں اچھا لگتا ہے؟“
 ”بہت۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں کتنی کتنی دیر یہ میوزک انجوائے کرتی رہتی ہوں۔ کیوں آپ کو اچھا نہیں لگتا؟“
 ”مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“
 ”آپ... نے کیسے فون کیا؟“
 ”نمبر ملایا۔ اور کر لیا۔“
 ”بتائیں نا“
 ”کوئی پیو گی؟“
 ”نہیں۔ آپ کی کوئی بہت کڑوی ہوتی ہے۔“
 اُس کا فلک شکاف تہقہ بلند ہوا۔
 ”اور تمہاری کوئی بالکل بیکار ہوتی ہے۔“ اُس نے اُس کی دودھ ملی کوئی پر چوٹ کی۔
 ”آپ میری کوئی کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔“
 ”سوری، سوری۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”سنا ہے آج تم آنٹی نور جہاں کے گھر گئی تھیں۔“ اُس نے موضوع بدلا۔
 ”صبح آنٹی نور جہاں نے اُسے ہسپتال فون پر باتوں کے دوران شندی کے آنے کا بتایا تھا۔“
 ”ہاں۔ بہت ہی اچھی ہیں آنٹی۔“
 ”اچھا سنو۔“ اُسے اچانک خیال آیا۔ ”میوہ خان کی شادی ہے آئیو الے ایوار کو۔“
 ”اوہ کتنا اچھا لگے گا۔ اُسے یہ سادہ لوح دیہاتی بہت اچھے لگتے تھے۔“
 ”تمہیں بھی بلا یا ہے۔“
 ”جی؟“ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

اُسے شندی کا خیال آ گیا۔ کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے اُس کا نمبر ڈائل کیا۔
 ”Yes, Shandi here.“
 ”اے لڑکی۔ تم سے کہا نہیں۔ کسی کو اپنی شناخت نہیں بتانی۔“ وہ خوشگواہی سے بولا۔
 اُس نے اُسے بہت احتیاط برتنے کو کہا تھا۔ اپنا نام، پتہ، فون نمبر وغیرہ سب چھپا کر رکھنا تھا۔ شہر کی طرف جانے پر سختی سے پابندی لگائی تھی۔ بستی میں بھی محتاط رہنا تھا۔
 ”آپ... کسی تو نہیں ہیں نا۔ اور پھر آپ کا نمبر بھی سکرین پر آ رہا تھا۔“
 ”ہاں۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دراصل چاند اور چاندنی نے بدحواس کر دیا ہے۔“ وہ اب بھی چاند پر نظریں جمائے تھا۔
 ”آپ بھی چاند کو دیکھ رہے ہیں؟“ اپنی بالکنی میں کھڑی وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔
 ”ہاں۔ میں اپنی بالکنی میں کھڑا ہوں۔“
 ”اور میں بھی...“
 ”کسی دن تمہیں نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت بلانا۔“
 وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
 ”سوری۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔“
 ”سنو۔“
 ”جی۔“
 ”چاند کو دیکھ کر تمہیں کس بات کا خیال آتا ہے؟“ جانے کیوں پوچھ رہا تھا وہ؟
 ”Peace، امن، سکون...“
 اُس نے گہری سانس لی۔ یہی خیال نا دیہ کو کیوں نہیں آتا تھا؟

”لیکن تم نہیں جاؤ گی۔“

”کیوں؟“ وہ بھڑکی گئی۔

”وہی پہچانے جانے کی پرابلم۔“

”اوہ۔ ٹھیک ہے۔“

”اوکے۔ اب میں ذرا اپنے پیشمنس کی خبر لوں۔ اور تم پلیز اندر چلو۔“

”جاتی ہوں لیکن ...“

”کیا؟“

”آپ بھی پلیز اندر چلیں۔“ اُس کی آواز میں Concern نمایاں تھی۔

اُسے بہت اچھا لگا۔

”بس یہ ایک فون کرتا ہوں۔ پھر جاتا ہوں۔“

کسی دن آپ کو مونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت کہیں۔“ وہ بالکل اُسی کے انداز

زمین بولی۔

ایک بار پھر اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

”سوری۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔“ اُس نے بھی اُسی کا جواب اُسی کے لب

و لہجے میں دہرایا۔ اور۔

فون بند کرتے ہوئے اندر کمرے میں چلا آیا۔ دن کو جن مردوں کا

آپریشن کیا تھا۔ اُن کا حال احوال دریافت کیا۔ اور۔

انگلیٹھی میں جلتی لکڑیوں کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے میز پر سے ریڈرز

ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔



آج ڈاکٹر ظافر کے یہاں ڈنر تھا۔ سبھی کو لیکز انوائیٹڈ تھے۔ یاد خان نے تیار ہونے سے پہلے ناد یہ کوفون کیا کہ جاتے ہوئے وہ اُسے پک کر لیگا۔ مگر اُس نے کہا کہ اُسے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اور چونکہ وہ چوتھا ہے ٹائم کی پابندی نہ ہونے پر۔ لہذا وہ چلا جائے۔ ڈاکٹر کوثر سے اُس کی بات ہوئی ہے۔ وہ آکر اُسے ساتھ لے جائے گی۔

سو۔ یاد خان ٹھیک ٹائم پر ڈاکٹر ظافر کے یہاں پہنچ گیا۔

آہستہ آہستہ سبھی مہمان پہنچ گئے۔ ہاں ناد یہ اور ڈاکٹر کوثر کا انتظار ہو رہا تھا۔

تبھی۔ ڈاکٹر کوثر کے منگیترا نور کی نئے سوڈل کی بی ایم ڈیو سرسراتی ہوئی

پورچ میں آکر رکی۔ اور ڈاکٹر کوثر اور ناد یہ کو ڈراپ کرتے ہوئے واپس

جلدی۔

دونوں اندر آ گئیں۔ پتہ نہیں کیوں یا ورخان کو لگا۔ کوثر سے زیادہ نادیہ ایکساٹنڈ تھی!

بہر حال۔ سخت سردی میں بھی نادیہ سکیٹی سٹریپ بلاؤز پہنے تھی۔ گہرا میک اپ، سٹرونگ پرفیوم لگائے تھی اور۔ اس وقت پھر۔ سب کی نگاہوں کا مرکز تھی!

”زبردست۔“ ڈاکٹر سلمان نے انگوٹھے کے اشارے سے نادیہ کی تعریف کی۔

”واؤ۔“ ڈاکٹر چنگیز بھی بول اٹھا۔

کولنگز تھے۔ بے تکلفی تھی آپس میں۔ لیکن ڈاکٹر چنگیز کی نظروں میں کچھ تھا ایسا کہ یا ورخان کو اچھا نہیں لگا۔ خیر۔

سب اپنی اپنی سیٹس پر بیٹھ گئے۔ نادیہ اور ڈاکٹر کوثر بھی ڈاکٹر نشاط اور ڈاکٹر سمیعہ کے ساتھ والی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

”تمہیں سردی نہیں لگتی؟“ ڈاکٹر نشاط نے سادگی سے نادیہ سے کہا۔

”نہیں۔ ڈرائمنگ روم کوڑی ہے۔ اور پھر آج کل سب چلتا ہے۔ شادیوں میں نہیں دیکھتی شفون اور نیٹ کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں سب نے۔“

”مجھے تو انہیں بھی دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر نشاط خوب شال لپیٹے بیٹھی تھی۔

”تم تو ہو ہی بڑھی روح۔“ نادیہ کا کھٹکتا قہقہہ بلند ہوا۔

”اچھا تم سناؤ۔“ ڈاکٹر سمیعہ، کوثر سے مخاطب ہوئی۔ ”شادی کب ہو رہی ہے؟“

”ایک مہینہ بعد۔“

”مہنی مون کے لئے کہاں کا ارادہ ہے؟“

”سوئزر لینڈ۔“

”عیش کرو بھی۔“

”عیش جیسے عیش۔“ نادیہ بیچ میں ہی بول پڑی۔ ”ابھی بی ایم ڈبلیو دیکھی

ہے انور صاحب کی۔ لیٹٹ موڈل ہے۔۔۔“

یا ورخان کے کانوں میں نادیہ کی آواز پڑی۔

اُس نے نوٹ کیا۔ چند روز قبل راستے میں جب وہ کوثر کی منگنی کی انگوٹھی کا ذکر کر رہی تھی۔ تو بھی جیسے لپٹائی سی تھی۔ اور اس وقت بھی اُس کی آواز میں Greed نمایاں تھی۔

کیوں تھا ایسا؟ کیوں وہ اتنی کومپلیکسڈ تھی؟

خود گانا کولو جسٹ تھی۔ باپ کا میڈیکل سنور تھا۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی پھر کیوں...؟

اُس کی نظریں نادیہ کی طرف اٹھیں۔ اُس کی ساڑھی کا پلو ڈھلک کر اُس کی گود میں آ رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت جسم ساڑھی کے پلو نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بھی نکا ہو رہا تھا۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ننگے گلے اور ٹاپ لیس بلاؤز پہنا کرتی تھی۔ اگر کبھی وہ اعتراض کرتا تو۔

’ساری عمر امریکہ میں گزاری۔ اس کے باوجود دقیا نوسی کے دقیا نوسی رہے۔ نادیہ کا جواب یہی ہوتا!

کیا واقعی ایسا تھا؟ کیا وہ واقعی دقیا نوسی تھا؟ لیکن وہ تو صرف عورت کو اُس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا تھا اور بس!

اُس کی نظر میں عورت حیا، وفا اور ایثار کا پیکر تھی۔ کیا اُس کی سوچ غلط تھی؟ نادیہ چونکہ اُس سے محبت کا دعویٰ کرتی تھی۔ اور اُس نے بھی اُسی کے اصرار پر ہی خود کو اُس کی محبت کا جواب محبت سے دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

کیا پھر اُس کا حق نہیں بننا تھا کہ اُسے اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کرتا؟
اُس نے گہری سانس لی۔

مہمان ڈائننگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ساتھ ہولیا۔
پلیٹ میں کھانا لیکر ایک طرف کھڑا ہوا ہی تھا۔ کہ ناد یہ آگئی۔

”اتنے ہینڈسم کیوں ہو ہاں۔“ وہ اپنی پلیٹ میں سے چمچ بھرتے ہوئے
بولی۔ ”لیڈی ڈاکٹر تمہاری تعریف کرتی ہیں۔ تو میں جیلس فیل کرتی ہوں۔“

اُس کا بھی دل چاہا کہہ دے۔ کہ میل ڈاکٹر کی نظریں جب اُس کے ننھے
کندھوں پر پڑتی ہیں تو اُسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن۔ آج اُس نے ایسا نہیں کہا۔
جانے کیوں؟

”کیا کہتی ہیں؟“ اُس نے یوں ہی کہا۔

”سب کہہ رہی تھیں۔ کہ اتنا ہینڈسم بندہ کم ہی بنایا ہو گا اللہ میاں نے۔“

”اچھا۔“ وہ آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔

”بائے داوے۔ تمہاری پیسٹ کا کیا حال ہے؟“

وہ سمجھ گیا۔ اُس کا اشارہ شادی کی طرف تھا۔

”اب وہ میری پیسٹ نہیں ہے۔“

”چلو جو بھی ہے۔۔۔“

”وہ ذوالفقار اکل و آئی کی تحویل میں ہوتی ہے۔ بس خیر خبر مل جاتی ہے۔
”لڑائی جھگڑے کے امکان سے بچنے کے لئے وہ دانستہ اُسے شادی کے بارے
میں زیادہ نہیں بتاتا تھا۔

”چمچ۔ یاد تو آتی ہوگی۔“ ناد یہ نے چھیڑا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ بولا کچھ نہیں۔

اور یہی ناد یہ کو اچھا نہیں لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ انکار کرے گا۔ کچھ کہے گا۔۔۔

”ویسے اگر میں غلطی پر نہیں تو اُس کی ایٹکسی جج صاحب سے کم اور تمہارے

زیادہ نزدیک ہے۔ ہے نا؟“ وہ اُسے دور سے ساری جگہ دکھا چکا تھا۔

وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔

”اب یہ تو بنوانے والوں کی کوئی مصلحت ہوگی نا۔“

وہ چوس گئی۔

”مصلحت یہی ہوگی کہ تم آتے جاتے اُسے جھانکتے رہو۔“

اُس کا جاندار قبضہ بلند ہوا۔

”بس بس۔ سنو۔ ٹیکسٹ سنڈے ڈاکٹر اور مسز ریاض کی ویڈنگ اینورسری

ہے۔ کل ڈاکٹر ریاض سب کو انوائٹ کریں گے۔“ اُس نے اطلاع دی۔

”میں تو نہیں آسکوں گا۔“

”کیوں؟“

”اُس دن میرے چوکیدار میوہ خان کی شادی ہے۔“

”What a name!“ اُس کے لہجے میں تضحیک نمایاں تھی۔

”اُس کے ماں باپ نے بہت پیار سے رکھا ہو گا یہ نام۔“

”اچھا صحت چھوڑو۔ بتاؤ کیوں نہیں جاؤ گے؟“

”بتایا نا میوہ خان کی شادی ہے وہاں جاؤں گا۔“

”اوہ کم آں۔ تم اپنے چوکیدار کی شادی پر جاؤ گے؟“ وہ یوں بولی جیسے اُس

نے کوئی انہونی بات کہہ دی تھی۔

”کیوں نہیں جاؤں گا۔ اُس نے اتنے خلوص سے بلایا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر ریاض بھی تو بلائیں گے۔“

”اول تو یہ کہ میوہ خان نے پہلے بلاوا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں جاؤں

گا تو اُسے مایوسی ہوگی۔ اپنی کم مانگی کا احساس ہوگا۔۔۔“

”تم بھی نا۔۔۔“ وہ جھنجھلا اٹھی۔ ”بعض وقت تو۔۔۔ مجھے Suffocation

ہونے لگتی ہے تمہارے ساتھ۔“

”اوہ“۔ یاور خان کا چہرہ تہمتا اٹھا۔
 ”Then you better find a man you can breathe with.“
 نے کہا اور۔

پلیٹ ہاتھ میں لئے دوسری طرف چلا گیا۔
 اُس کا ذہن بھنار ہاتھا۔ آج پہلی بار دل چاہا کھری کھری سائے اُسے۔ مگر
 باقی ڈاکٹر کی موجودگی میں ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اُس کی نرمی اور
 ڈیسنی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی۔

ڈنر ختم ہوا۔ وہ باہر آیا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔
 آج پہلی بار اُس نے نادیا کو گھر ڈراپ کرنے کی آفر نہیں کی۔ اور آج پہلی
 ہی بار اُسے اُس کی بات کا سختی سے جواب دیا تھا۔

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بات بے بات خفا ہونا۔ لڑنا جھگڑنا، بدکلامی پر
 اُتر آنا۔ ایک بات اچھی تو دوسری ضرورتی ہوتی تھی۔ اور انجام۔ لڑنا!
 No way۔ اب وہ اور ذہنی پریشانی مول نہیں لے سکتا تھا۔

جوں توں کر کے وہ گھر پہنچا۔ اوپر بیڈ روم میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ سبز
 چائے منگوائی۔ اور آگ کے قریب صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے ٹی وی آن کر
 دی۔

تھوڑی ہی دیر میں حمید گرم خوش ذائقہ چائے لے آیا۔
 گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ ٹی وی پر نظریں جمائے رہا۔ ذہن اب بھی پیچھے
 پلٹ پلٹ جاتا۔ نادیا کی ساڑھی کا ڈھلکا پلو، نیم عریاں جسم، بلند ققم، ڈاکٹر کوڑ
 کے منگیتر کے پیسے سے مرعوب باتیں۔ اوچھی حرکتیں لگیں اُسے سب
 سر جھٹکتے ہوئے وہ پھر سے ٹی وی میں محو ہو گیا۔ اچھا پروگرام تھا۔ ”دیکھتا چلا
 گیا۔

معا اُس کے سیل فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ نمبر دیکھا۔ نادیا کا تھا۔ بند کر دیا اُس
 نے۔

ایک بار پھر بجنے لگا۔ اور پھر بار بار بجتا گیا۔ اُس نے اٹھا ہی لیا۔

”خفا ہو۔“ نادیا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ کوئی کمزوری نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

”پھر فون ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے۔“

”یوی تھا۔“

”اچھا سوری یاور۔ اب مان جاؤ۔“

اتنے عرصے میں آج پہلی بار اُس نے اُسے منانے میں پہل کی تھی۔ سوری
 کہا تھا اُسے۔ شاید اس لئے کہ آج اُس نے بھی پہلی بار رد عمل دکھایا تھا!
 ”چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”اور بات یہ کہ ڈنر کے بعد انور صاحب مجھے اور کوڑ کو آئیں کریم کھلانے
 لے گئے۔ Kouser is really lucky yaavar...“

تیمبی۔ اُس کے سر ہانے رکھا فون بج اٹھا۔

اُس نے نجات کی سانس لی۔ پتہ نہیں کیوں انور کے نام سے ہی اُسے
 چوس ہو گئی تھی۔

”اچھا میں بند کرتا ہوں۔ میرے لینڈ لائن پر رنگ آ رہی ہے۔ شاید
 ہسپتال سے ہو۔“ اُس نے کہا۔ اور سیل فون بند کر دیا۔

اُٹھتے ہوئے وہ اپنے بیڈ کے کنارے پر جا بیٹھا۔ ریسور اٹھایا۔

”یاور خان سپینک۔“ اُس نے ماؤ تھ پیس میں کہا۔

”میں... میں... شندی بول رہی ہوں۔“

یاور خان کے کانوں میں جیسے کوئی رس گھول گیا۔ ساتھ ہی اُس کی جھجکتی
 سی آواز اور بے ترتیب ہوتی سانسوں پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”میں تم۔ کیا حال چال ہیں؟“

”وہ... ماما کے پاؤں میں موج آ گئی ہے۔ سینکے کو کہہ رہی ہیں۔ سینک

ٹھیک ہے یا مساج کر دوں؟“

”سینک ٹھیک ہے۔ ریٹ بھی کریں۔“

”بس یہی کہتا تھا... آپ تو ٹھیک ہیں نا؟“ آج پہلی بار خود سے یاور خان کو فون کیا تھا۔ خواہ مخواہ کنفیوزڈ ہو رہی تھی۔

”بڑی جلدی خیال آیا۔“

وہ مسکرا دی۔ آہستہ سے۔

”در اصل ماما کو تکلیف ہے نا...“ اُس سے بات نہ بنی۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم مجھ سے باتیں کرو۔“ ٹکیوں سے پشت

ٹکاتے ہوئے اُس نے ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔

اور پھر۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

”پاپا کو مجھے میڈیکل کرانے کی بہت خواہش تھی۔“

باتوں باتوں میں یہ بات بھی آگئی۔

”پھر؟“ وہ دلچسپی سے اُس کی ہر بات سن رہا تھا۔

”لیکن میری جان جاتی تھی میڈیکل کے نام سے ہی...“

”کیوں؟“

”Dead bodies کی ڈائیکشن کا تصور کرتے ہی میں لرز جاتی تھی۔“

یاور خان کا فلک شکاف قہقہہ بلند ہوا۔

”حیرت ہے۔ تم تو بادل کی گرج تک سے نہیں ڈرتیں۔ Dead body

سے کیوں ڈر لگتا تھا۔“ اُس نے اُس کی بادل کے گرج سے ڈرنے پر لطیف چوٹ کی۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح ناراض لگنے لگی۔

”سوری۔ سوری۔ اچھا آگے بتاؤ۔“

”اس کے باوجود پاپا نے مجھے میڈیکل کالج میں ایڈمٹ کروا دیا...“

”اچھا؟“

”ہاں۔ اور جب پہلے ہی دن سب سٹوڈنٹس ڈائے سیکشن ہال میں جانے لگے۔ میں نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ تب مجھے ڈاکٹر ہاتھ سے پکڑ کر تسلیاں دیتا اندر لے گیا۔ جوں ہی میری نظر ٹیبل پر ڈیڈ بوڈی پر پڑی۔ میں Faint ہو گئی...“

یاور خان قہقہے پر قہقہے لگا رہا۔

”اچھا پھر کیا ہوا؟“ قہقہے ذرا تھے تو اُس نے پوچھا۔

”پھر کیا ہونا تھا۔ پاپا مجھے واپس لے آئے۔ اور میں لنڈن سکول آف آرٹس میں داخلہ کروا کے وہاں چلی گئی۔“

”چیچ۔ بہت دکھ ہوا تمہاری رام کہانی سن کر...“

”آپ اڑائیں میرا مذاق...“

”اچھا اب نہیں۔ بالکل نہیں۔“

”اچھا۔ آپ بتائیں۔ ڈاکٹر نا دیہ سے پھر صلح ہو گئی آپ کی؟“

وہ اچانک چپ سا ہو گیا۔ جیسے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے کوئی گرم تپتی دھوپ میں گھسیٹ لایا تھا اُسے۔

”ہاں۔“ اُس نے مختصر کہا۔ ”میوہ خان بہت خوش ہے۔ شادی

ہونے والی ہے نا۔“ دروازے کے درز میں سے میوہ خان کی جھلک دیکھتے ہی اُس نے بات بدل دی۔

”He is a nice guy. بہت ہی اچھا انسان ہے۔“

”اوہ کم آن۔ تم اپنے چوکیدار کی شادی پر جاؤ گے؟... تم بھی نا...“

بعض وقت تو مجھے سفوکیشن ہونے لگتی ہے تمہارے ساتھ...“

میوہ خان ہی کے بارے میں کہی نا دیہ کی باتیں اُس کے کانوں میں

گونجیں۔

کل سے ہی یادِ خان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ناسلو بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ پروہلم اُسے بہت عرصے سے تھی۔ مگر جتنا وہ اپنے مریضوں کے لئے فکر مند رہتا تھا۔ اتنا ہی خود سے غافل تھا۔

آج اُسے تیز بخار نے آیا تھا۔ ہسپتال میں بھی طبیعت خراب رہی۔ شام کی شفٹ کی اپنے میں ہمت نہیں پارہا تھا۔ لُنج بریک میں ہی گھر آ گیا۔

اُسے کھانا دینے کے بعد حمید گھر چلا گیا۔ میوہ خان صبح سے ہی چھٹی پر تھا۔ دراصل شادی کے بعد آج میوہ خان کے سسرال والوں نے میوہ خان کے رشتہ داروں کی دعوت کی تھی۔ اُس کی حالت دیکھتے ہوئے حمید نے رک جانے کو کہا بھی مگر۔ یادِ خان نے منع کر دیا۔ یہی چھوٹی چھوٹی تو اُن کی خوشیاں ہوتی تھیں۔

اُس نے گہری سانس لی۔ دوبارہ اُس سے باتوں میں لگ گیا۔ کہ اُس کی معصوم اور پیاری باتیں اُس کے ذہنی کوفت پر مرہم کا کام کر رہی تھیں جیسے!

آئی نور جہاں واکل چند روز کے لئے کہیں باہر گئے تھے۔ اُس کے چوکیدار نور محمد کی بیوی اُسے ملنے آئی تھی۔ پوری بستی میوہ خان کی شادی کے دن کا انتظار کر رہی تھی وغیرہ۔ شندی نے اُسے تمام نیوز دیں۔

”اب... بند کروں۔ ماما کے پاؤں پر سینک کرنا ہے۔“ اُس نے کہا۔

”تمہاری ماما کی تو...“

”گڈ ٹائیٹ“۔ شندی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے جاگیر کی واحد وارث تھی۔ اتنی humble تھی، اتنی منکسر المزاج!

ماما کی خدمت، غریبوں کی قدر۔ قانع اتنی کے عرش سے فرش پر آئی تھی پر اُن تک نہیں کیا تھا!

چند پل وہیں بستر پر لیٹا وہ اُسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر چونکا۔ آج جن دو مریضوں کا آپریشن کیا تھا۔ اُن کا حال احوال لینا تھا۔

اُس نے ہسپتال فون کیا۔ نرس سے دونوں مریضوں کا حال دریافت کیا۔ اُن کا بی بی، یورین آؤٹ پٹ وغیرہ۔

اپنی تسلی کر کے اُس نے لائیٹ آف کی۔ اور بستر میں گھستے ہوئے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔



شام چھ بجے اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ٹمپریچر 104°C تک چلا گیا تھا۔ سہجنگ کرنے کا سوچ رہا تھا۔ مگر اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی اُسے ایک کپ چائے ہی دے دیتا!

مگر گھر میں کوئی ہوتا تو یہ سب کرتا! تبھی اُس نے ناد یہ کوفون کر دیا۔ میل بھر پر تو تھی۔ پھر اُسے ہسپتال میں بھی معلوم تھا۔ اُسے ٹمپریچر تھا۔

”ناد یہ میری طبیعت بہت خراب ہے۔ تم آ جاؤ پلیز!“
”اوہ یاور۔“ وہ کچھ پریشان سی لگنے لگی۔ ”تم... خود کیوں دوائی نہیں لے لیتے...“

اُس نے اُسے ڈاکٹر ہونے کے ناطے نہیں، کمپنی دیئے کوفون کیا تھا۔
”دوائی تو لے لوں مگر۔ چائے کون بنا کر دے گا؟“ اُس نے اچھے دوستوں کی طرح کہا۔

”ایکسیکو زمی! تم مجھے چائے بنانے کے لئے بلارہے ہو؟“ وہ یوں بولی جیسے یاور خان نے چائے بنانے کا کہہ کر اُس کی انسلٹ کی تھی۔
”نہیں۔ سہجنگ کے لئے بھی۔“ وہ بہت آرام سے بولا۔
ناد یہ جھنجلا اُٹھی۔

”نو کر نہیں ہیں کیا؟“

”نہیں۔ دونوں چھٹی پر ہیں۔“

”دراصل انور صاحب نے مجھے اور کوثر کو ڈنر پر بلایا ہے۔ اب میں انکار کروں گی تو برا لگے گا۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ کسی نرس کو...“

”جھینک یو ویری میچ۔ نرس کو میں بھی بلا سکتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

پھر جانے جی میں کیا سائی؟ شندی کا نمبر ملا لیا۔

”شندی میری طبیعت خراب ہے۔ میوہ خان اور حمید بھی چھٹی پر ہیں۔ تم آ سکو گی پلیز!“

”ہاں کل آ جاؤں گی۔ لیکن...“

”لیکن کیا؟“ کیا وہ ابھی ناد یہ کی طرح کوئی بہانہ بنانے لگی تھی؟
”اصل میں ماما نیچے کسی سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ میں اکیلی...“

آ جاؤں۔“

”ہاں۔ آ جاؤ۔“

”کوئی کچھ کہے گا تو نہیں؟“ پتہ نہیں کیوں اکیلے آتے ہوئے وہ گھبرا رہی تھی۔

”کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“ وہ نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ ”تم بس جلدی آ جاؤ۔“ اُس نے فون بند کر دیا۔

لحوں میں ہی شندی اُس کے لاؤنج میں تھی۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اُس کا بیڈ روم یقیناً اوپر تھا۔ اندازے سے اُس نے ایک دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ یاور خان ہی تھا۔

وہ کچھ جھجکتی سی اندر داخل ہوئی۔ آخر تو وہ ایک جوان آدمی تھا اور اکیلا بھی۔ پر۔۔۔ بیمار بھی تو تھا!

یاور خان کی دلشیں آنکھوں میں دیئے سے جل اُٹھے۔

”شندی پلیز جلدی سے ذرا میری سہجنگ کرو۔ مجھے 104°C ٹمپریچر ہے۔ ٹمپلٹس لی ہیں مگر ٹمپریچر کم کرنا ضروری ہے۔“

شندی جلدی سے نیچے گئی۔ کچن میں سے برتن میں ٹھنڈا پانی لائی۔ یاور خان نے اُسے ڈریسنگ روم میں الماری میں رکھے ناول ٹیپکن دکھائے۔ وہ نکال لائی۔ اور بھگو بھگو کر اُس کے ماتھے پر رکھنے لگی۔

یاور خان کی آنکھیں بند تھیں۔ شندی پریشان تھی۔ جلدی جلدی پانی اور نینکین بدل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹپر پچر نیچے آنے لگا۔ شندی اب بھی لگی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے تک یاور خان کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔

”بس شندی۔ تھینک یو سوچ“۔ ممنونیت سے کہتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ روک دیا۔ ”یہ تھرمامیٹر مجھے دو۔ میں ٹپر پچر چیک کرتا ہوں۔“ اُس نے اپنے سائیڈ ٹیبل پر رکھے تھرمامیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

شندی نے تھرمامیٹر جھٹکتے ہوئے اُسے دیا۔ اور نینکین اور برتن نیچے لے گئی۔ واپس آئی۔ تو یاور خان بہتر اور مطمئن لگ رہا تھا۔

”اب بیٹھو“۔ اُس نے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اپنے بیڈ پر بٹھا لیا۔ ”اور مجھ سے باتیں کرو“۔

پتہ نہیں کیوں وہ کچھ گھبرا اسی گئی۔

”اب واپس نہ جاؤں؟“

”کیوں؟“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اُس نے خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

”کس سے؟“

”آپ کے نوکروں سے۔“

”وہ چھٹی پر ہیں۔“

اوہ۔ لیکن ماما گھر آ گئیں تو؟“

”کچھ نہیں کہیں گی ماما۔“

”لیکن...“

”اب یہ مت کہنا کہ مجھ سے ڈر لگتا ہے۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”آپ سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔“ وہ بہت وثوق سے بولی۔

”Sure؟“ اُس کے انداز میں شرارت تھی۔

”ہاں۔“ وہ بھی اُسی لب و لہجہ میں بولی۔

”اچھا ایک منٹ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اُس کا بستر درست کیا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی دوائیاں، الارم کلاک

وغیرہ ٹھیک سے رکھے۔ صوفے پر دھرے اخبار و میگزین ترتیب سے میز پر رکھے۔ وہیں پڑا بریف کیس اٹھا کر اُس کے بستر کے پرپی طرف سائیڈ ٹیبل کے قریب رکھا۔

پھر۔ آتش دان میں بکھری آدھ جلی لکڑیاں اکٹھی کر کے ترتیب سے رکھنے لگی۔

کروٹ کے بل لیٹا یاور خان اُسے دلچسپی سے تکتا رہا۔ منع نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں؟

سب ٹھیک ٹھاک کر کے وہ نیچے چل دی۔ کچن میں جلدی جلدی یاور خان کے لئے کوئی بنائی اور چھوٹی سی ٹرے میں کپ سجاتی اُس کے کمرے میں آ گئی۔

اُسے حیرت سی ہوئی۔ شدید طلب ہو رہی تھی اُسے کوئی کی اس وقت! شندی نے ٹرے اُس کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ پھر اُس کے نیچے بستر کی پشت سے لگائے۔ اور۔ یاور خان نے آہستہ سے اوپر کھٹکتے ہوئے ٹیک ٹکیوں سے لگالی۔

شندی نے کپ اٹھا کر اُسے تھما دیا۔

یاور خان ممنونیت سے اُسے دیکھتا رہا۔ ”شکریہ“ کا لفظ اُسے بہت کم لگ رہا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو شندی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”آپ بھی بہت اچھے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

وہ مسکرا دیا۔ وہ بدلہ ضرور لیتی تھی!

ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ جو گنگ سے واپس آ رہا

تھا۔ تو شندی بالکٹی میں کھڑی نظر آئی۔
 ”اتنی صبح باہر کیوں کھڑی ہو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ اُس نے کہا تھا۔
 ”آپ بھی تو صبح صبح باہر نکلے ہیں۔“ اُس نے اُسی کے لب و لہجے میں کہا تھا۔

اور پھر۔ ایک رات اپنی بالکٹی سے کھڑے کھڑے اُس نے شندی کو فون کیا تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ وہ بھی اپنی بالکٹی میں کھڑی تھی تو:
 ”کسی دن تمہیں نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت بلانا۔“ اُس نے کہا تھا۔
 ”کسی دن آپ کو نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت کہیں۔“ شندی نے اُس کے ہی الفاظ اُسے لوٹا دیئے تھے!

”بیٹھو نا۔ جب تک حمید نہیں آتا۔ تم نے مجھے اینڈ تو کرنا ہی ہے۔...“ وہ بالکل یوں بولا جیسے اُس پر اُس کا حق بنتا۔
 ”ہاں۔ میں آپ کو ایسے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک کام کرتی ہوں۔ نیچے جا کر ماما کو آواز دیتی ہوں۔ وہ بھی آجائیں گی تو...“
 ”پھر تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگے گا۔“

”آپ سے نہیں... لیکن پتہ نہیں کیوں اُن ایزی سافیل کر رہی ہوں۔“
 وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔

اُس نے نوٹ کیا تھا۔ شروع شروع میں شندی اُس کے ساتھ بہت اعتماد سے باتیں کرتی تھی۔ بلکہ کچھ اتھارٹی سی ہوتی تھی اُس کے انداز میں۔ وہ اُس کی Ragging بھی کرتی تھی۔ سیس آف ہیوہر تھا اُس میں۔ لیکن۔ جوں ہی یاور خان کے لئے اپنی دلچسپی کا احساس ہوا تھا بھٹا سی ہو گئی تھی۔ اُن کا رڈ سی!
 ”اچھا جاؤ۔ لیکن جلدی آؤ۔ میں انتظار کروں گا۔“
 ”اوکے۔“ اور وہ نیچے چل دی۔

تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئی۔ اُس کی ناسازی طبیعت کا سن کر ماما کو ہول اٹھنے لگے تھے۔ بدحواسی میں ایک جوتا نہیں مل رہا تھا۔ بس آنے ہی والی تھیں۔
 اب وہ مطمئن تھی۔ یاور خان نے اُسے بیڈ کے کنارے پر بٹھایا تو تسلی پہ بیٹھ گئی۔

یاور خان نے کوئی کا آخری گھونٹ لیا۔ تو شندی نے کپ تھام لیا۔
 ”اب اسے کچن میں مت لیکر جاؤ۔ یہیں رکھ دو۔“
 کہ بار بار آنے جانے میں اُسے زحمت بھی ہو رہی تھی اور پھر۔ جانے کیا تھا؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے پاس سے کہیں جائے!
 شندی نے کپ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”میں لیتا ہوں۔“ وہ تھکا تھکا سا تھا۔ ”اور تم باتیں کرو مجھ سے۔ ریمیٹ؟“
 وہ واقعی لینے لگا۔ شندی نے اُسے لینے میں مدد دی۔ نیکیے درست کئے۔
 اور بستر بھی ٹھیک کر دیا۔ پھر آہستہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔
 ”باتیں کرو نا۔“ آنکھیں موندے وہ دیر سے بولا۔
 ”آپ سو جائیں، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“

وہ۔ اُس کے قریب بیٹھی تو تھی مگر۔ جانے کیوں تنہائی میں اُس کی قربت سے کنفیوزڈ ہوئی جا رہی تھی۔
 ”تمہاری باتوں سے ہی تو مجھے آرام ملتا ہے۔“ اُس نے دلنشین آنکھیں کھولتے ہوئے شندی پر جمادیں۔
 اُس کی ہر دم بولتی آنکھیں وہ سہار نہ سکی۔ پلکوں کی چلن کرنے اٹھنے لگی۔

”ہوں۔ بولونا۔“ اُس نے اصرار کیا۔
 ”آپ آنکھیں بند کریں۔ پھر میں باتیں کروں گی۔“ خود کو سنبھالتے

ہوئے اُس نے سادگی سے کہا۔

اور اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

”آنکھیں بند کروں گا۔ تو تم کیسے نظر آؤ گی؟“ وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

اور غیر ارادی طور پر شندی کا ہاتھ آگے بڑھا۔ اور اُس کی آنکھوں کو چھپالیا۔

وہ ہنستا چلا گیا۔ دلاؤ دیزی سے۔

”اتنا مت نہیں۔ پھر ٹیپر بچ ہو جائے گا۔“ اُس کا ہاتھ اب بھی اُس کی آنکھوں پر تھا۔

”اچھا ہاتھ ہٹاؤ۔ اب نہیں ہنسون گا۔“

شندی نے ہاتھ ہٹالیا۔ پھر دیرے دیرے اُس سے باتیں کرنے لگی۔

اپنی آنکھوں پر تھوڑے کے بارے میں، اپنے پاپا کے بارے میں، اور انکل ذوالفقار اور یاور خان کے مشورے پر اُس نے جو انکل جہانگیر پر پاپا کے قتل کی دعویداری کر دی تھی۔ اُس کے بارے میں!

”تمہارے چچا نے اپنی ضمانت کرائی ہے۔ بقول نواز وہ سخت پریشان ہے۔ کہ تم کہاں اور کس کے پاس ہو؟ پولیس تمہارے ملازموں کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ کیونکہ اکرم بابا بھی کہیں چھپ گئے ہیں۔ اور مسز علی ابھی بھی کہیں روپوش ہے۔“

”مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔ ماما بھی کہتی ہیں اکرم بابا اور نواز نے گواہی دی تو انکل اُن دونوں کو جان سے مار ڈالیں گے۔“

”کمال کرتی ہو۔ اس طرح ڈرتی رہو گی تو زندگی کیسے گزارو گی اور پھر مجرموں کو سزا تو بہر حال ملنی چاہئے۔“

”لیکن آپ سچ میں مت پڑیں۔ وہ اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو آپ کو بھی

نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

”اب تو پڑ گیا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”آپ کو کچھ ہو گیا تو؟“

”مجھے کچھ نہیں ہو گا۔“ اُس کے خوبصورت نازک ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے اُسے تسلی دی۔

تجبی نیچے لاؤنج میں آہٹ ہوئی۔

”شندی بی بی۔ شندی بی بی۔ کہاں ہو بیٹا؟“ ماما کی گھبرائی گھبرائی سی آواز ابھری۔

شندی اٹھتے ہوئے میز میوں کی لینڈنگ پر مٹی۔ نیچے دیکھا۔

ماما ہاتھ میں مٹی کے برتن میں ہرل سلکائے کھڑی تھیں۔ اُسے ہنسی آ گئی۔ حویلی کے طور طریقے ماما بھولی نہیں تھیں۔

”ماما اوپر آ جائیں۔“ وہ وہیں سے بولی۔

شندی کے ساتھ ساتھ ماما بھی یاور خان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

یاور خان کے قریب آ کر ایک ہاتھ میں برتن دوسرے سے ہرل کا دھواں اُڑا رہی تھیں۔ ساتھ میں کونکوں کو جلانے رکھنے کے لئے پھونکیں بھی مار رہی تھیں۔

”نظر لگی ہے نظر۔“ وہ ڈھیر سارا دھواں یاور خان کے چہرے پر اُڑاتے ہوئے بولیں۔

یاور خان بالکل سیریس تھا۔ وہ پرانے طور طریقوں، بزرگوں کی برکت اور رشتوں کا پیا ساق تھا۔ اُسے اچھا لگ رہا تھا یہ سب!

پھر ماما نے پورے کمرے میں دھواں دیا۔ اور سائیز ٹیبل پر سے خالی برتن اٹھاتے ہوئے نیچے کچن میں چلی گئیں۔

”حویلی میں ماما روزانہ ہرل کا دھواں دیا کرتی تھیں۔“ انگیٹھی کے

قریب صوفے پر بیٹھی شادی بولی۔

”اچھا۔ اس کو ہرل کہتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے میں زندگی میں پہلی بار اپنے وطن آیا ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ایسی باتوں کے بارے میں میں اپنی مندر سے سنا کرتا تھا۔“

”حالات بہتر ہوئے تو میں آپ کو اپنے علاقے میں لے کر جاؤں گی۔ وہاں آپ ہمارے حجرے، حویلی، فارمز وغیرہ میں گھومیں گے پھر میں گے۔ تو آپ کو صحیح لطف آئے گا۔“

”ہکی بات ہے؟“ وہ پھر شرارت پر اتر آیا۔

”ہاں۔“ وہ بھی ہنس دی۔

”نظمراؤ کی کہاں مجھے؟“

”اپنی حویلی میں۔“

”ڈر تو نہیں لگے گا؟“

”کس سے؟“

”مجھ سے۔“

”میں آپ سے نہیں ڈرتی۔“

”کتنا اچھا ہوں نا میں؟“

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

اور۔۔۔ یادور خان کو لگا۔ دور کہیں پر یوں کے دیس میں جہاں نجران اٹھے

تھے!

”تم ہنستی بہت اچھا ہو۔“

”آپ سے کم۔“ اُس کے جاندار قبچہہ اکثر اُسے مسکراتے رہتے۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ اُس نے پھر بدلہ لیا تھا!

تبھی۔۔۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ماما تھیں۔

”بیٹا۔ حمید آ گیا ہے۔ مگر چلو گی؟“ انہوں نے وہیں سے کہا۔

”جی ماما۔“

ماما واپس پلٹ گئیں۔

”اب چلوں؟“ وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ and thank you for such lovely company.“

”اپنا خیال رکھیں۔ اور پلیز! کوئی پروہلم ہو تو رنگ ضرور کریں۔“

”اچھا۔“

”گڈ نائٹ۔“ وہ بولی۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

”گڈ نائٹ۔“ یادور خان اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

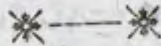
کتی calm کتنا دھیرج لئے تھی شادی۔ کتی مدھر، پرسکون کہنی تھی

اُس کی!

نادیہ نہیں آئی اسی میں شاید بہتری تھی۔ بات کسی بھی موضوع سے شروع

ہوتی ختم یقیناً لڑائی پر ہی ہوتی تھی یا پھر آج کل۔ انور صاحب پر!

گہری سانس لیتے ہوئے۔ اُس نے ایک بار پھر تھکی آنکھیں موند لیں۔



دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ یاور خان نے حسب عادت نادیا سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے ہی وہ آکر اُسے دیکھ جاتی۔ اچھے دوستوں کی طرح اُس سے اُسی طرح بات کرتا رہا۔ ضرورت پڑھنے پر پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا۔ پر۔

اُس نے نوٹ کیا۔ نادیا کی اُس کے لئے وہ والی گرجوٹی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ عرصہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور۔ خود اُس نے اپنا جائزہ لیا۔ تو وہاں بھی خاموشی سی ہی پائی!

ایسا کیوں ہوا تھا؟

نادیا کی گرجوٹی شاید اس لئے کم ہوئی تھی۔ کہ یاور خان اُس کے معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ اُس نے اُس کی بے باکی پر اُسے سمجھ کی تھی۔ اُس کی بد

زبانی پر اُسے ٹوکا تھا۔ اور۔ ایف اے فیل انور کی طرح اُس کے سامنے اپنی دولت کی نمائش نہیں کی تھی!

خود اُس کے من میں خاموشی سی شاید اس لئے چھا گئی تھی۔ کہ قدرے فاصلہ آ جانے کی وجہ سے اُس کی روز روز کی بے اطمینانی اور پریشانی خاصی کم ہو گئی تھی۔ سکون جیسے لوٹنے لگا تھا۔ سو بہتر تھا۔ من میں خاموشی ہی رہتی!

صبح سے وہ دو آپریشن کر چکا تھا۔ خاصے پیچیدہ تھے دونوں ہی آپریشنز۔ ابھی تیسرا آپریشن بھی کرنا تھا۔ تھکا تھکا سادہ سرجن لائونج میں آیا۔ کیپ، ماسک، گلووز وغیرہ اتارے۔ واش بیسن میں ہاتھ دھوئے۔ پھر پرلے سرے پر کچٹ میں آ گیا۔ الیکٹرک کٹیل میں پانی ڈالا، سوچ آ ن کیا۔ کپ میں ٹی بیک اور شوگر ڈالا، اوپر سے کھولتا ہوا پانی انڈیلا اور تھوڑا سا دودھ ڈال کر چھج چلاتے ہوئے سامنے دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر آ بیٹھا۔

ٹائلیں میز کے نیچے سیدھی پھیلاتے ہوئے وہ چائے کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

نادیا بھی اپنی چائے کا کپ ہاتھ میں لئے وہیں آ گئی۔

”کل میں چھٹی کے وقت تمہیں ڈھونڈتی رہی۔ تم نظر ہی نہیں آئے۔“

نادیا اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”تم نے مسیج ہی نہیں دیا تھا۔“ اُس نے ساتھ جانا ہوتا تھا تو سیل فون پر مسیج دے دیتی تھی۔

”کل میں اپنا سیل گھر بھول آئی تھی۔“

”ہوں۔ ویسے کل میں بھی ذرا جلدی میں تھا۔ فوراً ہی نکل گیا تھا۔“

”خیریت تھی؟“

”ہاں۔ بس ایک دوست نے ٹائم دیا ہوا تھا۔ گھر آنا تھا اُس نے۔“

چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے، سر صوفے کی پشت سے نکا کر اُس

نے آنکھیں موند لیں۔

”تھک گئے ہو؟“ نادیا نے پوچھا۔

”ہاں۔ اور ابھی تیسرا آپریشن بھی کرنا ہے۔“ اُس کی آنکھیں اب بھی

بند تھیں۔

”ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ ڈاکٹر زین کرہم نے بیوقوفی کی ہے۔“ نادیا نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ اس سے توجہ چھٹا کوئی بزنس ہی کر لیتے۔۔۔“

اُسے ہنسی آگئی۔ جب سے انور سے ملی تھی۔ حواسوں پر بزنس ہی چھا گئی تھی۔

”نہیں مجھے نہیں لگتا ایرا۔“ اُس نے سیاہ دلنشین آنکھیں کھول دیں۔

”بزنس میں بہت پیسہ ہے۔“

”ڈاکٹر، ڈاکٹر ہے۔“ اُس نے Firmly کہا۔ اور چائے کا کپ

اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”تم تو میرے الٹ کوئی بات نہ کرو۔ تو تمہیں چین نہیں آتا۔“ وہ بُرا

مان گئی۔

وہ مسکرا دیا۔ وہ شاید لڑنے کی تمہید باندھ رہی تھی۔ مگر۔۔۔ پتہ نہیں کیوں

اب اُس کی لڑائی سے اُسے وہ پریشانی نہیں ہوتی تھی جو کچھ عرصہ پہلے ہوا کرتی

تھی۔

تبھی ڈاکٹر نادر بھی وہاں آ گیا۔ نادیا دل کی بھڑاس نکال نہیں پائی۔ سو

جلدی جلدی چائے ختم کی۔ اور ایکسکے زکرتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کر دوسری

سمت چلی گئی۔

”سُرکل میرے آفس میں زور دار لڑائی ہوئی ہے مِم نادیا کی ڈاکٹر کوثر

کے ساتھ۔“ نادر نے اُس کے جاتے ہی قدرے نیچی آواز میں یادِ خان کو خبر

دی۔

ڈاکٹر نادر لڑائی کی خبر سے زیادہ اُسے احتیاط برتنے کے خیال سے یہ

بات کہنا چاہتا تھا۔ جو نیر تھا اُس سے۔ مگر بے تکلف اور خیر خواہ دوست بھی تھا۔

”باپ رہے۔“ آنکھیں پوری کھولتے ہوئے وہ خوبصورتی سے ہنس

دیا۔

نادیا اُس کے علاوہ بھی لوگوں سے لڑتی تھی۔ خاصی دلچسپ خبر تھی۔

”سُر پتہ ہے لڑائی کس بات پر ہوئی ہے؟“

یادِ خان خاموشی سے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”ڈاکٹر کوثر نے مِم نادیا کو اپنے منگیتر کے ساتھ کسی ہوٹل میں ڈنر کرتے

دیکھ لیا تھا۔“

ملی بھر کو یادِ خان کے پرکشش چہرے پر سایہ سالرز گیا۔ گو نادیا سے

اُس کا تعلق کبھی اتنا مضبوط اور ہموار نہیں رہا تھا لیکن۔۔۔ جیسا بھی تھا۔ تعلق تھا تو!

بہر حال۔۔۔ وہ جلدی ہی سنبھل گیا۔

”خوب ٹوٹو میں میں ہوئی۔ کوثر نے صرف اتنا کہا کہ سنا ہے کل انور

کے ساتھ ڈنر پر گئی تھیں۔ جبکہ وہ خود اُسی ہوٹل میں اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھی۔

سننے ہی آتش پا ہو گئیں۔ جو منہ میں آیا کہہ گئیں۔ بجائے رگٹی فیل کرنے کے الٹا

اُس پر برس پڑیں۔ بالکل چابلوں کی طرح لڑ رہی تھیں۔ وہ نہیں ہوتیں گاؤں کی

عورتیں جو دیوار پر سر اٹھا کر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی ہیں۔۔۔“

”اوہ نو۔“ یادِ خان کا بے اختیار فلک شکاف قبضہ بلند ہوا۔

”ہاں سُر۔ بالکل ایسا ہوتا ہے ہمارے دیہاتوں میں۔“ نادر بولا۔

اُسے معلوم تھا یادِ خان ملک سے باہر پلا بڑھا تھا۔ دیہاتی زندگی سے واقف

نہیں تھا۔ ”عورت دیوار سے چار پائی لگا کر اُس پر چڑھتے ہوئے ہمسائی کی خوب

خبر لیتی ہے۔ ہمسائی بھی جی بھر کر کوٹنے دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایک آدمی برتن بھی

ایک دوسری کو دے مارتی ہیں۔۔۔“

”یہاں ہمسائی نے کیا کیا؟“ یاور خان اب بالکل نارمل تھا، دلچسپی سے

پوچھا۔

اب کے نادر زور سے ہنس پڑا۔

”سر۔ ڈاکٹر کوثر بہت ڈینٹ لڑکی ہے۔ وہ خاموش تھی۔ ڈاکٹر نادیہ

ہی بولے جارہی تھیں۔“

”End result کیا ہوا؟“

”کیا ہونا تھا۔ بس نیم نادیہ اُسے خوب سنا کر چائے چھوڑ چھاڑ کھٹ

پٹ کرتی وہاں سے چل دیں۔“

یاور خان کے ساتھ نادر بھی اس واقعہ پر دیر تک ہنستا رہا۔

شام چھ بجتے ہی یاور خان ہوسپتال سے نکل آیا۔ اکیلا ہی تھا۔ نادیہ نے
پک کرنے کو کوئی میسج نہیں دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات البتہ اور تھی۔ اگر اُسے
میسج یا رنگ کرنے میں دیر ہو جاتی تو وہ خود ہی پوچھ لیتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو زور دیتا
تھا ساتھ جانے پر۔ مگر۔ کچھ دنوں سے واقعی فاصلے آ گئے تھے دونوں کے بیچ!
گھر کے بجائے اُس نے گاڑی کا رخ بازار کی طرف کر لیا۔ کچھ ضروری
شوپنگ کرنا تھی۔

سردی اب بھی جو بن پر تھی۔ بادل اب بھی آسمان پر منڈلا رہے تھے
اور۔ لوگ اب بھی گرم کپڑوں کا بوجھ اٹھائے زندگی کا کاروبار جاری رکھے
تھے۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ اُس نے نئے بنے شوپنگ مال کی پارکنگ میں
گاڑی پارک کر لی۔

اندراجا کو وہ اپنی مطلوبہ چیزیں خریدنے لگا۔ کافی دیر تک خریداری کرتا
رہا۔ پھر ایک ویڈیو شاپ پر آ گیا۔ اچھی سی دو چار موویز اٹھائیں۔ دکان سے

نکل ہی رہا تھا۔ کہ نظر مقابل کے چیلر کی دکان پر پڑی۔

وہیں نادیہ اور انور کھڑے تھے۔ انور نادیہ کی کلائی میں بریسٹ
پہنا رہا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ پھر۔ اُس کی آنکھوں میں
دیکھتے دیکھتے انور نے اُس کا وہی ہاتھ تھامتے ہوئے اُس پر اپنے ہونٹ رکھ
دیئے۔

تو۔ ڈاکٹر کوثر کا شبہ درست تھا!

مووی کی دکان سے وہ سیدھا بیکری کی دکان پر گیا۔

غیر ارادی طور پر شندی کا نمبر ملا یا۔

”میں مال میں کھڑا ہوں۔ تمہیں کچھ چاہئے تو بتاؤ۔“ اُس نے شندی

سے کہا۔

شندی نے کچھ چیزیں منگوا لیں۔

”بس؟“ یاور خان نے پوچھا۔

”اور کوئی اور...“

”اور چو کلٹس اور مارزی پان۔ یہی نا؟“

وہ خاموشی سے مسکرا دی۔ کہ یہی چیزیں وہ اکثر اُس سے منگواتی رہتی

تھی!

اپنے گھر کے لئے بھی اُس نے بیکری کی چیزیں لیں۔ اور سٹور سے باہر

نکل آیا۔

رات کی سیاہیاں گہر آئی تھیں۔ شہر کی روشنیاں جگمگ جگمگ کر رہی

تھیں اور۔ ہڈیوں کو چیرتی سردی در آئی تھی!

مختلف موڈ موڈ تا وہ آبادی سے باہر نکل آیا۔ کوئٹہ کی پتلی وائینڈنگ

سڑک پر نظریں جمائے وہ اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

گاہے گاہے اُس کے ذہن میں ڈاکٹر کوثر اور نادیہ کی لڑائی کی بات

ابھرتی۔ پھر۔۔۔ کچھ دیر قبل نادیدہ اور انور کی شہیدہ دکھائی دیتی۔

اُس نے خود کو ٹٹولا۔ وہاں کوئی واضح پریشانی نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر کوثر کا خیال آیا۔ یہاں نادیدہ نے ضرور پیچھے سے وار کیا تھا!

ڈاکٹر کوثر نے اُس پر اعتماد کیا تھا۔ انور سے ملوایا تھا۔ ساتھ لیکر گھومی

پھری تھی۔ اُس کا نادیدہ نے جو جواب دیا تھا۔ وہ حیران کن ضرور تھا!

بہر حال۔ اُس نے خیال جھٹکا۔ اور گاڑی دائیں طرف بستی کی

جانب موڑ لی۔

آسمان یہاں بھی ابر آلود تھا۔ بڑا سا چاند یہاں وہاں سے جھانکتا

دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا اور۔۔۔ اوپر اُن کے گھروں میں کسی لائمیٹ

ہاؤس کا کام دیتیں بتیاں جھلجھل کر رہی تھیں۔

اُس نے حسب سابق شیشہ ذرا سا نیچے کر لیا اور۔۔۔ دور پار کے

جزیروں، جنگلوں اور جھروں کی خوشبوؤں میں سب کچھ بھول گیا۔

لاؤنج میں سے ہوتا میزھیوں پر چڑھنے ہی لگا تھا۔ کہ بچن سے حمید برآمد

ہوا۔

”صاحب۔۔۔ بچ صاحب کا فون آیا تھا۔ ڈنر کی یاد دہانی کر رہے تھے۔“

وہ بولا۔

”گوڈ!“ وہ تو بالکل بھول گیا تھا۔

وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

بہت تھکا ہوا تھا آج۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ لیکن جانا

ضروری تھا۔ کہ عرصہ بعد آئی ڈاکٹر کوثر کا بیٹا ابراہیم پڑھائی ختم کر کے انگلینڈ سے

لوٹا تھا۔ اور یہ ڈنر اُسی خوشی میں دیا گیا تھا۔

اُس نے کوئی بھی نہیں پی۔ تیار ہوا۔ اور انکل ڈو الفکار کے گھر کی

طرف چل دیا۔

چیدہ چیدہ انوائٹڈ مہمان تقریباً سب آ گئے تھے۔ کوزی ڈرائنگ روم

تینتی سیکرٹس، پرفیومز سے مہک اور روشنیوں سے دمک رہا تھا۔

یادور خان اندر داخل ہوا۔ تو انکل ڈو الفکار اور ابراہیم نے گرم جوشی

سے اُسے رسیو کیا۔ پھر مہمانوں سے ملوایا۔ اور ابراہیم نے اپنی قریبی سیٹ آفر

کی۔

سبھی مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مرد حضرات سیاست اور

حالات حاضرہ پر بحث کر رہے تھے تو خواتین شادی بیاہ، کپڑوں اور جیولری کی

جدید ترین ڈیزائنز پر روشنی ڈال رہی تھیں۔

تبھی۔۔۔ شندی اندر داخل ہوئی۔

ایمرلڈ گرین شلوار قمیض، کندھے پر بیچ کرتی بیش قیمت شال، کانوں

میں ایمرلڈ کے بڑے بڑے دیدہ زیب آویزے، کمر کو چھوتے گھنے ڈارک

براؤن بال، حسین چہرہ، حسین آنکھیں۔ بلاشبہ حسنِ جسم تھی!

جانے کیوں یادور خان کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

ابراہیم جلدی سے اُٹھتے ہوئے اُس کے پاس گیا۔ اور اُسے گائیڈ کرتا

آئی نور جہان کے پاس لے آیا۔ اُنہوں نے اُسے وہیں اپنے پاس بٹھالیا۔

سب خواتین اُسے تو صمیمی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ آئی نے بڑی

محبت اور خلوص سے اُس کا تعارف سب سے کروایا۔ آئی واحد ہستی تھیں جنہیں

یادور خان نے شندی کے بارے میں سب کچھ صحیح صحیح بتایا تھا۔ اور اُسی ہی کے کہنے

پر اُنہوں نے آج تک شندی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اُس کی اصلیت کے بارے

میں کچھ جانتی تھیں۔ اس وقت اپنی دوستوں سے بھی اُنہوں نے صرف اتنا کہا کہ

وہ ان کے عزیزوں میں سے تھی اور پڑھائی کے سلسلے میں اُن کے یہاں اسٹنسی

میں مقیم تھی۔

سبھی باتوں میں مصروف تھے۔ یادور خان کی نظر ایک بار پھر شندی کی

کھڑے ہوتے گئے۔ ابراہیم تمام وقت شندی کو ہی سرو کرتا رہا۔ یاور خان کو اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

سب ایک بار پھر۔ کھانا کھاتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔

تبھی۔ یاور خان شندی کے پاس چلا آیا۔

”گڈ ایوننگ میم“۔ وہ اپنے مخصوص مدھرا انداز میں بولا۔

نظریں اٹھا کر شندی نے دیکھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس، مقناطیسی شخصیت میں سپریم خود اعتمادی، دلنشین آنکھوں میں اٹل اتھارٹی لئے، جیسے کوئی گریک گوڈ اُس کے سامنے ایستادہ تھا!

وہ۔ ڈول سی گئی۔

”ہائے“۔ اُس نے بے مشکل کہا۔

یاور خان کے پرکشش ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ ابھری۔ وہ بسا اوقات اُس کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔

گرے بلو بہت خوبصورت آنکھیں۔ چہرے پر گھر گھر آتے بال، لمبا قد، بسلم فکر اور۔ حسین پاؤں کی انگلی میں ایرلڈز سے مزین پیارا سانا زک چھلا۔ اپنے مخصوص پرفیوم کی مدھرتا لئے۔ لجائی سی، پر بہت گریس فل!

آج اُسے پھر بابل اور نینوا کی شہزادیوں کا خیال آ گیا۔ بابل اور نینوا کی شہزادیاں۔ جن کے قیمتی ریشمی ملبوسات وادی یمن کے عطر سے مہکتے تھے!

”you look gorgeous.“ وہ دھیرے سے بولا۔

شندی نے کچھ چوکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

ایک بار پھر وہ ہولے سے مسکرایا۔ شندی کو اُس کا لب و لہجہ شاید بدلا سا لگا تھا۔

”تھینک یو“۔ اُس نے بہر حال شکریہ ادا کیا۔

طرف اٹھی۔

چہرے پر گھر آئے خوبصورت بال پیچھے ہٹاتی، پرکشش ہونٹوں پر حسین ترین سائل سجائے وہ شرمیلے سے انداز میں کسی خاتون کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

اچانک ہی وہ اُسے اپنے بہت قریب لگی۔ بہت اپنی لگی۔

اُسے لگا وہ صدیوں سے اُسے جانتا تھا۔ ملا صرف آج تھا۔

لیکن نہیں۔ وہ اُسے آج نہیں ملا تھا۔ بہت دن پہلے ملا تھا۔

اُس دن۔ جس دن حویلی میں اُس کے پاس جا کر اُس نے اُسے

Slow poisoning سے محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی!

وہ اُس کے غیر معمولی حسن، باوقار سراپے اور میجک ناز و انداز سے

اُسی وقت ہی! پریس ہوا تھا۔ اور باقی کا تمام وقت جو وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان

بیچان کے ناطے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا، اچھی دوست سمجھ کر گپ شپ کرتا

تھا۔ یہ بھی اُس میں دلچسپی کا ہی پہلو تھا!

اُس نے سوچا۔ منزل تو اُس کی یہاں تھی۔ وہ کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا؟

تبھی۔ کھانے لگنے کا اعلان ہوا۔ سبھی ڈائننگ روم کی طرف جانے

لگے۔

بونے ڈنر تھا۔ خواتین ایک بار پھر ایک طرف سٹ آئیں۔ کچھ لوگ

خود پلیٹ اٹھا رہے تھے۔ کچھ کو آئی وائلڈ دے رہے تھے۔ خواتین کو ابراہیم ہی

سرو کر رہا تھا۔

یاور خان نے دیکھا۔ شندی کو پلیٹ پکڑاتے ہوئے ابراہیم نے غور سے

اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ بے کل سا ہو گیا۔ شندی میں اپنی دلچسپی ایک

طرف، اُس کے ساتھ اُس کا دوسرا رشتہ بھی تو تھا!

بہر حال۔ مہمان میز پر لگی ڈشز میں سے کھانا لے لیکر ایک طرف

یاور خان نے توجہ اپنی پلیٹ پر مرکوز کر لی۔

سبھی ابراہیم باری کیڈو چکن اُن کے پاس لے آیا۔ یاور خان نے کارنڈ سے ایک پیس شندی کی پلیٹ میں رکھا اور دوسرا اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ ابراہیم کوشندی کی طرف زیادہ تنگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ ڈش لئے آگے بڑھ گیا۔ ”چو کلیس اور مارزی پان ملے؟“ کھانا کھاتے اُس نے پوچھا۔ اُس نے آتے آتے اُس کی سب شوپنگ میوہ خان کے حوالے کر دی تھی۔

”جی۔ مل گئے۔ تھینکس۔“

چند پل وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

”تم۔ پورا آدھا گھنٹہ لیٹ آئی ہو۔“ یاور خان نے کہا۔

”اور آپ ... پورے بیس منٹ لیٹ آئے ہیں۔“ اُس نے اُسے

کھڑکی میں سے یہاں آتے دیکھا تھا۔

اُس کا جاندار قبضہ بلند ہوا۔

”تم بدلہ ضرور لیتی ہو۔“

وہ چپکے سے مسکرا دی۔

”تم۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ اُس نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے

کہا۔

”آپ بھی ... بہت ... ہینڈ سم لگ رہے ہیں۔“ اُس نے بمشکل بات

پوری کی۔ کہ۔

اُس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ کہانیاں سی، داستانیں سی ...

اُس کی لمبی خیدہ پلکیں جھک گئیں۔

یاور خان کی دلشیں آنکھوں کی شوخی بوا ہو گئی۔ پرکشش ہونٹوں پر کی

شریر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”تم۔ بہت پیاری ہو۔“

اور اب کے شندی چپ رہی۔ کہ وہ اُس بولتی آنکھوں کا سامنا بالکل نہیں کر پار ہی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”تم نے بدلہ نہیں لیا۔“ وہ ہولے سے بولا۔ بدلہ لینے کے لئے ہی تو اُس نے چال چلی تھی!

وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر نظریں جمائے جھج ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔

”ہوں۔ بتاؤ نا۔“

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔“ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کا دھیان کھانے کی طرف دلایا۔

ایک بار پھر وہ خوشگواہی سے ہنسا۔

”میں تو کھا رہا ہوں۔ تم جھج سے کھیل رہی ہو۔“

اُسی لمحے یاور خان کا ہوسپٹل سے فون آ گیا۔ اور شندی نے نجات کی سانس لی۔

آج جانے کیا ہو گیا تھا اُسے؟ بدلی بدلی سے باتیں کر رہا تھا!

لذیذ کھانے کے بعد سب دوبارہ ڈائننگ روم میں آ گئے۔ وہیں مزید ارکشمیری چائے سرو ہوئی۔

چائے پینے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

شندی اور یاور خان کو آنٹی وانکل نے کچھ دیروہیں بٹھائے رکھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر یاور خان اُٹھ کھڑا ہوا۔

”آنٹی اب اجازت دیں۔ میں نے بارہ بجے ہوسپٹل بھی جانا ہے۔“

”ہاں بیٹا۔ جاؤ۔“

”شندی آؤ۔“ یاور خان نے اُسے ساتھ چلتے کو کہا۔

دونوں باہر نکل آئے۔ دونوں نے اوپر ہی جانا تھا۔ پہلے یاور خان اور پھر شندی کی جگہ تھی۔

اپنے گھر پر رکنے کی بجائے وہ شندی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔
”شندی“۔ وہ چلتے چلتے بولا۔

”جی“

”ایک بات کہوں۔“

”ہاں۔“

”بدلہ تو نہیں لوگی۔“

وہ بے اختیار ہنس دی۔

”لوں گی۔“

”کئی بات ہے؟“

”ہاں۔“

کھویا کھویا سا بڑا چاند چاروں اور مد بھری چاندنی بکھیر رہا تھا۔ ہر چیز بہت واضح نظر آرہی تھی۔ شندی کی حسین آنکھیں بھی، یاور خان کی سحر جگاتی نظریں بھی!

اُس نے دھیرے سے اُس کا نازک ہاتھ تھاما۔ ہولے سے اپنے پرکشش ہونٹ اُس پر رکھے۔

”I love you.“ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔

اُس نے دیکھا۔ شندی ساکت سی رہ گئی تھی۔

”بدلہ نہیں لوگی؟“ اُس کا ہاتھ تھامے وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں

دیکھ رہا تھا۔

”میں... میں...“

اور اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ جلدی سے اپنے گھر کے دروازے میں کھس گئی۔

انوکھی سی لذت محسوس کرتا یاور خان واپس مڑا اور۔ بڑے بڑے قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف ہولیا۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ شندی کی نیند تو یاور خان پُرا کر لے گیا تھا۔ کیا خاک کوشش کرتی سونے کی!

وہ جسے آنکھیں بند کرتی تو اپنے بالکل قریب پاتی اور۔ آنکھیں کھولتی تو وہ دور بہت دور نظر آتا۔ آج اُس نے کھلی ہی آنکھوں سے اُسے اپنے بہت نزدیک پایا تھا۔

’I love you‘ اُس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اُس نے آہستہ سے کہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں جادو تھا۔ وہ ساکت ہو کر رہ گئی تھی!

’بدلہ نہیں لوگی؟‘ وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اُس کی جادو گھر آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ قصے، کہانیاں!

اور۔ وہ بدلہ کیسے لیتی؟

کتنا ہیر پھیر کر آن گھیرا تھا اُس نے!

اُس نے کروٹ بدلی۔ نظر گھڑی پر گئی۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ نیند جانے کہاں غائب ہو گئی تھی؟ اودہ۔ اُسے یاد آیا۔ وہ تو یاور خان ساتھ لے گیا تھا!

آنکھیں موندتے ہوئے اُس نے یاور خان کو پلکوں میں بند کر لیا۔

’سونے دیں نا پلیز!‘ اُس نے ریکوریٹ کی مگر...

آج تو جیسے وہ ادھار رکھائے بیٹھا تھا۔ قسم کھالی تھی جیسے نیند نہ لوٹانے کی

اے!

صبح کے تین بجے جا کر کہیں اے اُس پر ترس آیا۔ نیند واپس کی۔ اور
دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

—

آج ہسپتال میں بھی اُسے خمار سا تھا۔ دن پیئے جیسے پیئے ہوئے تھا۔
مدہوش سا، سرشار سا!

آپریشن ختم کر کے وہ سرجن لاؤنج میں آیا۔ نادیا بھی ساتھ تھی۔ اپنے
ساتھ ساتھ اُس نے اُس کے لئے بھی کوئی بنائی۔ دونوں کپس ہاتھوں میں لئے وہ
کھڑکی کی طرف آیا۔ کپس میز پر رکھے۔ اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
نادیا نے دیکھا۔ اُس کی دلنشین آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت نمایاں
ہو رہے تھے۔

”رات سوئے نہیں کیا؟“ اُس نے پوچھا۔
”نو۔ آن کال ہوں اس ہفتے۔ رات بھی تقریباً جاگتے گزاری ہے۔“

دوبار آیا ہوں ہو سچل۔“ اُس نے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔
کچھ عرصہ قبل تک نادیدہ کو اُس کا تمام ٹائم ٹیبل پتہ ہوتا تھا۔ آج کل
دھیان انور کی طرف رہتا تھا شاید۔ بھول بھال گئی تھی غالباً!
یادِ خان کی دلکش آنکھیں بند تھیں۔ پرکشش ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ
تھی۔

”کچھ خوش خوش لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“ نادیدہ بولی۔

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ نظریں اُس پر جمادیں۔

”میں واقعی بہت خوش ہوں۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”وہی تو پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟“

”محبت ہو گئی ہے کسی سے۔“ اُس نے کوئی کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

نادیدہ کچھ جھجھکی ہوئی۔ دل میں چور بھی تو تھا۔

”اچھا؟“ لہجہ میں پھر بھی طنز تھا۔ ”اُس لئے کھینچے کھینچے رہتے ہو مجھ

سے۔“

عجیب چیز تھی۔ انور کے ساتھ بھی بیٹنگیں بڑھا رہی تھی۔ اُسے بھی کسی اور

کے پاس جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی!

”تمہارے پاس تو بیٹھا ہوں۔ تمہارے سامنے تو ہوں۔“

”اس کے باوجود تمہاری وہ والی بات نہیں رہی۔“

اور۔ اگر یہی بات وہ کہہ دیتا۔ تو لڑائی یقینی تھی!

اُس نے نادیدہ کا کپ مزید اُس کے قریب کیا۔

”کوئی پٹو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ وہ مصالحت کے انداز میں بولا۔

اُس نے کپ اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔

”تم بات گول کر رہے ہو۔ جبکہ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔ تم بہت

خوش ہو۔“

”میں۔۔۔ دراصل۔۔۔ پی کر آیا ہوں۔“ اُس نے اپنا کپ میز پر رکھا۔

”چھوڑ دنا۔ صبح صبح تو کوئی پی کر نہیں آتا۔“

”میں نے کب کہا صبح پی ہے۔ رات کو پی تھی۔“

”تو اب یہ کام بھی کرنے لگے ہو۔“

”گلاس سے نہیں... آنکھوں سے پی ہے۔“ وہ بات چبا چبا کر

مسکراتے مسکراتے کہہ رہا تھا۔ ”پتہ نہیں کیا چیز تھی آنکھوں میں کہ... نظر ملاتے

ہی پلا دی...“

نادیدہ کچھ کچھ سمجھ گئی۔ شندی کا بے پناہ حسن، جادو جگاتی آنکھیں

اور۔ یادِ خان سے دو چار قدم پر قیام۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا!

”میں سمجھ گئی تم کس کی بات کر رہے ہو۔“

وہ گڑبڑایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شندی کا نام آئے۔ بات کر کے

پچھتایا۔

”یار میں مذاق کر رہا تھا۔“

”چلو۔ مان لیتی ہوں کہ مذاق کر رہے تھے۔“ وہ کوئی پینے لگی۔ مگر

مطمئن پھر بھی نہیں تھی۔

وہ دوسرا آپریشن کرنے آپریشن تھیٹر چلا۔ تو بات آئی گئی ہو گئی۔

شام کے نیم روشن دھندلکوں میں وہ گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

شندی اس وقت بھی اُس کے حواسوں پر چھائی تھی۔ وہ پہلے بھی لڑکیوں

سے مل چکا تھا۔ ملکی بھی، غیر ملکی بھی مگر۔

شندی میں جو بات تھی، وہ کسی اور میں نہیں دیکھی!

اُس کے مزاج میں شبنم کی مدھرتا تھی، اُس کی حیا میں پہلے پہر کی

پاکیزگی تھی اور۔ اُس کے سراپے میں پارسا شہزادیوں کا سا وقار تھا!

تبھی تو۔۔۔ Longing اُسے شندی کے لئے ہو رہی تھی، جو انوکھی

سی چھین، بیٹھی سی کک وہ اُس کے لئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس نے اس سے قبل کسی اور کے لئے محسوس نہیں کی تھی!

اور اب۔ اُسے ایک نئی فکر لاحق ہو گئی تھی!

امی کو کیسے بتائے گا؟ امی بہت محبت کرنے والی بے حد شفیق تھیں۔ مگر ساتھ ہی اپنی بات پر سختی سے قائم رہنے والی تھیں۔ اُنہیں شس سے مس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اُسے اپنے آپ پر ترس سا آیا۔ بہت چاہتا تھا وہ شندی کو۔ کیا کرے

گا؟

غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اپنے سیل پر گیا۔ اور شندی کا نمبر ملا لیا۔

”اوہ... آپ ہیں۔“

اُس کی بے ترتیب ہوتی سانسیں اُس نے صاف محسوس کیں۔ مسکرا دیا،

دھیرے سے۔

”کیسی ہو؟“

”فائین۔“

اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیئے جلتے محسوس کئے۔ اُسے دیکھ کر اُس

کی آنکھیں دیئے ہی تو جلاتی تھیں!

بے اختیار اُس کا جی چاہا۔ اُسے دیکھے۔ مگر کیسے؟ مگر سے باہر وہ اُسے

بجائیں سکتا تھا۔ کہ اُسے دیکھنے جانے کا خطرہ تھا۔ مگر کے اندر؟ بغیر کسی وجہ کے وہ

وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ پھر اُس کی ماما بھی تو تھیں اُدھر!

”شندی۔“

”جی۔“

”تم بیمار پڑ جاؤ نا۔“

”جی۔“

”پڑ جاؤ نا پلیز!“

وہ اب بھی نہیں سمجھی۔ خاموش رہی۔

وہ ہنس دیا۔ دلا ویزی سے۔

”دیکھو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ تو ماما مجھے بلا لیں گی۔ اور اس طرح میں تمہیں

مل لوں گا۔“

”اوہ۔ آپ ویسے ہی آ جائیں۔“ اُس کا انداز شرمیلا شرمیلا سا تھا۔

”ویسے آ سکتا ہوں؟“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”جی۔“ وہ اُن لوگوں کا محسن بھی تو تھا۔ اُسے ہنسی بھی آئی۔ ایک مختار محل قسم

کی چیز آج اُس سے اجازت طلب کر رہی تھی!

”اچھا سنو۔ ماما سے کہو۔ ڈنرمت تیار کریں۔ میں ساتھ لیکر آؤں گا۔“

”جی۔“ وہ اتنا ہی بولی۔ کہ کم از کم آج وہ اُس سے زیادہ بحث نہیں کر

سکتی تھی۔

”ہائے۔“ یا در خان نے عجلت سے کہا۔ فون بند کیا اور۔

کسی ٹین ایجر لوڈر کی طرح گاڑی کا رخ واپس موڑتے ہوئے شہر کی

طرف بھگانے لگا۔

اُسے پتہ تھا شندی کو K.F.C پسند تھا۔ پیزا ہٹ کی میٹر اپسند تھی۔ وہ

منگوا لیا کرتی تھی یہ سب شہر سے۔

وہ سیدھا وہیں گیا۔ دونوں جگہوں سے چیزیں لیں۔ پیکری سے چو کلش

اور مارزی پان لئے اور واپس اپنی بستی چلا آیا۔

ٹھیک نو بجے وہ اُس کے مین دروازے پر تھا۔

شندی نے ہی دروازہ کھولا کہ اُسے اُس کی Due respect ملنی

چاہئے تھی!

”ہیلو مہم۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”وہ۔ تمہاری والی کوئی کی طرح؟“ اُس نے اُس کی لائیٹ سی کوئی پر لطیف چوٹ کی۔

”نہیں... آپ کی والی کوئی کی طرح۔“

”سُکڑ۔ اسی طرح اچھے اچھے کام کیا کرو...“

”کیا مطلب؟ وہ صرف آپ کے لئے بن رہی ہے۔ میری والی اُسی طرح ہے۔“

”چلو۔ تم باتیں تو کرنے لگی ہو۔“ اُس نے اُس کا خوبصورت نازک ہاتھ اپنے ہونٹوں سے چھوا۔

وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی۔ ہاتھ واپس کھینچتا چاہا مگر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔

”وہ... ماما دیکھ لیں گی۔“ وہ شیشائی سی لگ رہی تھی۔

”ماما سے میں ڈرتا ہوں؟“ اُس نے دوبارہ اُس کے ہاتھ پر اپنے پرکشش ہونٹ رکھ دیئے۔

اُسی لمحے ماما ہاتھوں میں ٹرے لئے کچن کے دروازے سے نمودار ہوئیں۔

یاور خان نے فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔

”آپ ماما سے بالکل نہیں ڈرتے؟“ شندی اپنی ہنسی بھٹک چھپاتی آہستہ سے بولی۔

یاور خان ہنس دیا۔ دلا دیزی سے۔

ماما آئیں۔ یاور خان کو سلام کرتے ہوئے کوئی کے برتن دونوں کے آگے میز پر رکھے۔ یاور خان کی خیر خیریت پوچھی۔ اور خالی ٹرے لئے واپس چلی گئیں۔

شندی کی کوئی تیار تھی۔ یاور خان کی بنانا تھی ابھی۔ وہ اپنا کپ ایک

”ہائے۔“ جھکی جھکی نظریں، خوبصورت چہرے پر لالی لئے وہ بھٹک

بولی۔

چند پل کنفیوژن میں وہ وہیں کھڑی رہی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”اندر لے جاؤ نا۔“

”اوہ۔ آئیں پلیز! اُس نے جلدی سے کہا اور۔“

اُسے راستہ دیتی اندر لاتے ہوئے اپنے خوبصورت کوزی، لوہنگ روم

میں بٹھا دیا۔ خود بھی اُس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

شندی سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔ نظریں اٹھا کر دیکھنے

اور بات کرنے کی جیسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اُسے ہنسی آگئی۔ شروع میں شندی کو اُس سے اپنی محبت کا احساس ہوا

تھا۔ تو محتاط ہو چلی تھی۔ اب اُس نے اپنی چاہت کا اظہار کر دیا۔ تو۔

وہ تو بالکل ہی چپ کر گئی تھی۔ ساری کروفر جاتی رہی تھی!

اُٹھتے ہوئے وہ اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”اپنے ناخنوں سے بہت کھیل لیا۔ اب باتیں کرو میرے ساتھ۔“ وہ

اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

اُس نے خاموشی سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ بولی اب بھی کچھ

نہیں۔

”یار میں تو پچھتا رہا ہوں تمہیں بتا کر۔ اچھی خاصی گپ شپ کرتی تھیں

میرے ساتھ۔“ وہ اب بھی اُس کا ہاتھ، ہاتھ میں لئے تھا۔ ”اچھا بتاؤ ماما کہاں

ہیں؟“ اسی بہانے سے وہ بات تو کر لیتی۔

”کچن میں ہیں۔ کوئی بنا رہی ہیں۔“ وہ بول ہی پڑی۔

طرف کرتے ہوئے اُس کے لئے کوئی بنانے لگی۔

”تم اپنی کوئی پیڑ۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ میں بناتا ہوں اپنی۔“ وہ اُس کا کپ اُس کے آگے سرکاتے ہوئے بولا۔ ”ویسے بھی تم میری کوئی بنانا نہیں جانتیں۔“

وہ محض چھیڑ رہا تھا اُسے۔ ورنہ وہ پہلے بھی اُس کے لئے کوئی بنا چکی تھی۔ اور وہ واقعی اچھی کوئی بناتی تھی۔

شندی بے اختیار ہنس دی۔

”کیوں؟ غلط کہا میں نے؟“

”نہیں۔ آپ غلط نہیں کہہ سکتے۔“ وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

”تمہیں پتہ ہے تمہاری ہنسی کیسی لگتی ہے؟“ وہ اپنے کپ میں جج چلاتے چلاتے بولا۔

”کیسی لگتی ہے؟“

”جیسے پریوں کے دیس میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔“ اُس نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ اُس کے بے تحاشا خوبصورت دانت، اُس کی جادوگر سائیل اور اُس کے طلسم جگاتے تھقبے اُسے پہروں مسکور رکھتے تھے۔ مگر کہہ نہ سکی۔ خاموشی سے نظریں اپنی کوئی پر جمائے رکھیں۔

وہ بہت خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ مختصر، خوشگوار، دلآویز!

وہ انجوائے کرتی رہی اُس کی باتوں کو۔ یاور خان من میں اتارتا رہا اُس کی ہنسی کو۔ اور یوں۔ دونوں نے ہنستے بولتے اپنی اپنی کوئی ختم کی۔

حمید ڈنر کے بوکس لے آیا تھا۔ ماما نے وہیں لوہنگ میں ہی کھڑکی کے قریب کونے میں لگی خوبصورت میز پر گرم گرم کھانا جن دیا۔

”شندی بی بی۔ کھانا لگا دیا ہے۔“ ماما نے پاس آتے ہوئے اُسے

اطلاع دی

دونوں اٹھتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔

یاور خان نے شندی کا سفید شفاف نیپکن کھولتے ہوئے اُس کے آگے بچھایا۔ پھر اپنا نیپکن اپنے آگے ڈال دیا۔

شندی نے میٹر اسے ابتدا کی۔ تو یاور خان نے چکن پیس اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

دونوں کھانا بھی کھا رہے تھے۔ باتیں بھی کر رہے تھے۔

تبھی ماما گاجر کا حلوہ لے آئیں۔ ماما نے خاص طور سے یاور خان کے لئے بنایا تھا۔

”آپ کو ماما کا بنایا ہوا گاجر کا حلوہ یقیناً پسند آئے گا۔“ شندی گلاس میں سے پیسی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”حویلی بھر میں ماما کے اس حلوے کا چمچا تھا۔“

”اوہ۔ پھر تو ضرور کھاؤں گا۔ ویسے تم اور ماما آج میرا ویٹ بڑھانے پر تلی ہوئی ہو۔ تم نے میٹر اکھلا دیا۔ ماما حلوہ کھلا دیں گی۔ اگلا پورا ہفتہ مجھے کسر نکالنی پڑے گی۔“

”آپ بہت خیال رکھتے ہیں اپنا۔“ شندی نے کہا۔

”بہت تو نہیں۔ لیکن رکھتا ہوں۔“ وہ تھوڑا سا حلوہ اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے بولا۔

”ڈیلیشس۔“ یاور خان نے کہا۔ ”تمہیں آتا ہے بنانا؟“

”نہیں۔“

”بہت مزے کا ہے۔“

”آپ کو اچھا لگتا ہے گاجر کا حلوہ؟“

”بہت اچھا لگتا ہے۔“

”میں ماما سے سیکھوں گی۔“

”میرے لئے بناؤ گی؟“

”اسی لئے تو سیکھوں گی۔“

یادِ خان کو اُس سے وہ بہت اچھی لگی۔ بحث نہ مباحثہ۔ بات سن لی، سمجھ لی اور مان لی۔ اُسے لگا۔ صحرا کی تپتی ریت میں بھٹکا وہ اچانک ٹھنڈے میٹھے جھرنے کے پاس آ گیا تھا!

”I love you Shandi.“ اُس نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”I love you so much.

شندی پھر رنگ ہو کر رہ گئی۔ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔

”تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں؟“ وہ ایک بار پھر شرارت پر اتر آیا۔

”میں یہیں تھی۔ آپ خود کہیں اور گھومتے پھر رہے تھے۔“ اُس کے لہجے میں شکایتیں در آئیں۔

وہ سمجھ گیا اُس کا اشارہ نادیدہ کی طرف تھا۔

”اب کہیں اور نہیں گھوموں گا پھروں گا۔“ تم مل گئی ہوتا۔ مجھے کہیں اور

جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس کے ہاتھ پر ہولے سے اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

حلوے کا آخری جھج لیتے ہی اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔

”اب چلنا چاہئے مجھے۔“ وہ بولا۔ ”آن کال ہوں ان دنوں۔ کیا پتہ

کس وقت کال آ جائے ہو سہیل سے۔“

گو جانے کو اُس کا دل نہیں کر رہا تھا۔ مگر رات کے گیارہ بجنے کے بعد بھی ایک لڑکی کے پاس بیٹھے رہنا کچھ اچھا نہیں لگا رہا تھا۔ اسی بات کا شندی کو بھی خیال تھا۔ ورنہ دل تو اُس کا بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یوں ہی بیٹھا باتیں کرتا رہے

اور وہ بیٹھی سنتی رہے۔ بہر حال۔

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”او کے میم۔“

آپ اس دروازے سے چلے جائیں۔ یہ نزدیک پڑتا ہے۔ آپ کے گھر کو۔ اُس نے کوریڈور میں پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھا۔ شندی بھی دو قدم ساتھ چل کر رک گئی۔

”مجھے چھوڑنے کا ہر تک نہیں جاؤ گی۔“ اُس نے اُسے ہاتھ سے تھاما۔

وہ خاموشی سے ساتھ چلی آئی۔

چاند آج بھی نور بکھیر رہا تھا، ڈھلان پر بکھرے چھوٹے چھوٹے گھروں

میں روشنیاں ماند پڑ گئی تھیں اور۔ ماحول ساکت ساکت ساگ رہا تھا۔

وہ رک گیا۔ اُس کا ہاتھ اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔

”کتنا Bewitching ہے نا سب کچھ۔“ وہ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں۔“ وہ بمشکل بولی۔

یادِ خان نے اُس کے حسین چہرے پر گھر آئے بال انگلی سے پیچھے

ہٹائے۔ پھر دھیرے سے اُسے سینے سے لگایا، اور ہولے سے اپنے ہونٹ اُس

کے خوبصورت ماتھے پر رکھ دیئے۔

”لیکن تم سے زیادہ Charm کہیں نہیں ہے۔“ وہ اُسے بے تحاشا

پیار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شندی خود سپردگی لئے اُس کے مضبوط بازوؤں میں جکڑی رہی۔ وہ

اپنی سانسوں میں مدغم ہوتی اُس کی گرم مہکتی سانسیں محسوس کر رہی تھی، اُس کے

مخصوص پرفیوم کی اروما اُسے مدہوش کئے دے رہی تھی اور۔ اُس کے وجود کا

قرب اُسے دینا سے بیگانہ کر رہا تھا!

آج ہفتہ تھا۔ اُس کا ایونٹ سیشن نہیں تھا۔ لُج بریک ہوتے ہی وہ گھر کے لئے چل پڑا۔

پورے آکاش پر بوجھل گھٹاؤں کا قبضہ تھا۔ دبے پاؤں برف کے گالے پڑ رہے تھے اور وقت سے پہلے ہی شام گھر آئی تھی۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کئے وہ چکر دار سڑک پر نظریں جمائے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔

آج پھر امی نے اپنے ملنے والوں کے ہاتھ اُسے پارسل بھیجا تھا۔ یہ لوگ بیہیں کے رہنے والے تھے۔ کراچی میں بزنس کرتے تھے۔ کبھی کبھار اس طرف آنا ہوتا تو امی سے یادِ خان کے لئے کسی پیغام وغیرہ کا ضرور پوچھتے۔ پچھلی

یادِ خان بے خود سا اُسے پیار کئے جا رہا تھا۔ کتنے ہی پل یوں ہی گذر گئے۔

پھر — شندی کو ہوش آیا۔ آہستہ سے اُس سے الگ ہو گئی۔ کہیں ماما دیکھ لیتیں تو؟

”کیا ہوا؟“ یادِ خان کے لہجے میں اب بھی شرارت تھی۔ دلنشیں آنکھوں میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

وہ اُس کی نظروں کا سامنا نہ کر سکی۔ گھنی سیاہ پلکوں نے خوبصورت آنکھوں پر چلن گرا دی۔

”وہ... ماما... دیکھ لیں گی۔“

”اوہ — ظالم سماج۔“

”نہ چاہتے ہوئے بھی شندی کو ہنسی آ گئی۔

یہ سویرا اور اچھا روزِ گندہ خوبصورت باتیں کرنا چاہتا تھا!

”اچھا چلتا ہوں۔ یوں ہی تمہیں دیکھتا رہا تو کبھی نہیں جا پاؤں گا۔“

ایک بار پھر اُس نے اُس کے ہاتھ پر پیار کیا۔ ”گڈ نائٹ“۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

”گڈ نائٹ۔“ شندی بولی۔

اور — یادِ خان بڑے بڑے ڈگ بھرتا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

چند ٹاپے وہ وہیں کھڑی اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اندر چلی آئی۔

※ — ※

بار کی طرح آج بھی امی نے اُسے بہت ساری چیزیں بھجوائی تھیں۔ بے شک کہ یہ سب چیزیں یہاں بھی ملتی تھیں مگر ماں کا دل۔ بچہ کبھی اُس کی نظر میں بڑا ہوتا ہی نہیں!

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اُسے بھی تو امی کے ہاتھ کی ہر چیز کی ہر وقت ضرورت ہوتی تھی۔ اُسے امی پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ کتنا چاہتی تھیں وہ اُسے! معا اُسے شندی کا خیال آیا۔ کیا امی اُسے قبول کر لیں گی؟ کتنا ٹیڑھا سوال تھا؟

اُس نے سر جھٹکا۔ قیامت سے پہلے اپنے اوپر قیامت طاری کرنا غلطی نہیں تھی۔ اُسے شندی بہت اچھی لگتی تھی۔ اور وہ اُس کے پیار میں مگن رہنا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے۔

کل شندی کا برتھ ڈے تھا۔ 'پاپا بہت شوق سے میری برتھ ڈے سلیمینٹ کیا کرتے تھے' ایک دفعہ اُس نے باتوں باتوں میں اُسے بتایا تھا۔ اُس پر پیار آنے کے ساتھ ساتھ اُسے دکھ بھی ہوا۔

گہری سانس لیتے ہوئے۔ اُس نے گیٹ پر ہلکا سا ہارن دیا۔ میوہ خان دوڑا چلا آیا۔ آج سبز ٹوپی کے ساتھ سرخ مفلر بھی لپیٹے تھا۔ گھٹنوں تک لمبا نیلا کوٹ، لوٹنگ شوز، اور حسب معمول پاؤ پاؤ بھر سرمہ فی آنکھ بھی ڈالے تھا!

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ اُس کا یہ ڈریس صرف بستی تک ہی محدود تھا۔ اُس کے ساتھ کہیں آنا جانا ہوتا یا ہوسپٹل کی ڈیوٹی کرنی ہوتی تو اُسے یاور خان کا مہیا کردہ یونیفارم پہننا پڑتا تھا۔ اُس نے اُس کے لئے خاص طور سے سیاہ پینٹ کوٹ اور شوز کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

وہ سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف گیا۔ میوہ خان گاڑی سے پارسل لیکر اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

یاور خان نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کئے۔ بیڈ روم میں آیا، صوفے پر بیٹھا، اور میز پر پڑا پارسل کھول لیا۔ امی نے اُس کے لئے گرم کپڑے، ٹائیٹ سوٹس اور ڈھیر سارا ڈرائے فروٹ بھیجا تھا۔ ساتھ میں حمید اور میوہ خان کے لئے بھی کپڑے تھے۔ میوہ خان کی بیوی کے لئے شادی کے گفت میں سرخ کا مدار سوٹ، سچے طلے کی شال اور سونے کے جھمکے بھی تھے۔ میوہ خان امی کا بھی چہیتا تھا۔ وہ بھی امی کا دم بھرتا تھا۔ اُن سے ملنے کراچی بھی جا چکا تھا۔ اُن کا فون آتا۔ تو وہ بھی بات کئے بنانا رہتا۔

حمید اُس کے لئے چائے لایا۔ تو اُس نے اُن دونوں کی چیزیں اُس کے حوالے کر دیں۔ پھر ٹی وی آن کی اور صوفے پر کہنی کے بل لیٹتے ہوئے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگا۔

محویت سے نیوز سن رہا تھا۔ کہ اچانک کپ ہاتھ میں لرزا اور چائے چھلک کر اُس کی قمیض پر آ رہی۔

اٹھتے ہوئے وہ ڈرینگ روم میں آ گیا۔ الماری کھولی۔ اور اپنا ٹائیٹ سوٹ نکالنے لگا۔

ایک نکالا۔ پھر واپس رکھ دیا۔ اس کی تو شرٹ کا بٹن ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرا نکالا۔ اس کی شرٹ کا بٹن بھی ٹوٹا تھا۔ پر کام چل سکتا تھا۔ وہ کچھ جھنجھلا سا بھی گیا۔ میوہ خان نے اب تک بٹنوں کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سارا وقت گیس ہی مارتا رہتا تھا حمید کے ساتھ۔ آج اُس کی خبر لینی تھی اُس نے۔ مگر۔

بٹن تو ٹھیک کیا جا چکا تھا لیکن۔ عجیب الٹے سیدھے ٹانگے لگا کر اپنی جگہ فلکس کر لیا گیا تھا۔ یہ کس سے ٹھیک کروایا تھا میوہ خان نے؟ اُس نے پہلے والے ٹائیٹ سوٹ کی شرٹ بھی چیک کی۔ اُس میں بھی بٹن ٹانگا جا چکا تھا۔ بالکل اسی سائل میں خیر۔

اُس نے کپڑے تبدیل کئے، ٹائیٹ سوٹ کے اوپر ہاف لینتھ گرم

گاؤں لیا، کمرے میں آیا، کچن ٹیل کی، اور پھر سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔

”جلدی ہی میوہ خان آ گیا۔“

”جی سر“۔ وہ ادب سے بولا۔

”یہ میز صاف کرو۔ چائے گری ہے۔ اور ڈرینگ روم سے میرے کپڑے بھی لو۔ قمیض پر بھی چائے گری ہے۔“ وہ ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

میوہ خان نے ڈرینگ روم سے اُس کے کپڑے اٹھائے۔ نیچے گیا اور کچن سے چھوٹا تولیہ لا کر میز صاف کرنے لگا۔

”میوہ خان۔ میری شرٹس کے بن کس سے لگوائے ہیں تم نے؟“ یاور خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کہ میوہ خان کو اُس کے بن خود اُسی صفائی سے ٹانگنے چاہئے تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔

”صاحب۔“ اُس کا کام کرتا ہاتھ رک گیا۔ ”میں نے تو نہیں لگائے، آج لگانے تھے لیکن...“ اپنی کوتاہی پر وہ سخت نادم لگ رہا تھا۔

یاور خان کو کچھ حیرت سی ہوئی۔

”پھر کس نے لگائے ہیں؟“

”پتہ نہیں صاحب۔“ وہ کچھ گھبرا سا بھی گیا۔

”تم گھر لیکر گئے تھے قمیض؟“ مبادا اُس کی بیوی کا کارنامہ ہو یہ!

”نہیں صاحب۔“

اُسے حیرت کے ساتھ تجسس ہونے لگی۔ یہ کام حمید کا بھی نہیں تھا۔ پھر؟

”کوئی آیا تھا میرے کمرے میں؟“

”نہیں... نہیں صاحب۔“ میوہ خان ہکلا یا۔

کچھ تھا۔ جس کا میوہ خان کو پتہ تھا۔ اور جو وہ چھپائے نہیں چھپا پار ہا تھا!

”میں سمجھ گیا...“

”لیکن صاحب۔ میں نے نہیں بتایا آپ کو۔“ اُس کی بات کاٹتے ہوئے وہ مزید گھبراہٹ سے بولا۔

اوہ۔ تو وہ اُس بندے سے گھبراتا بھی تھا۔ جس نے یہ کام کیا تھا!

”تم نے نہیں بتایا مجھے۔ میں خود سمجھ گیا ہوں۔ اب نام بھی بتا دو۔“ اُس نے بات تقریباً اگلا والی تھی۔

”صاحب۔ وہ... شائدانہ بی بی آئی تھیں۔ آپ کے ٹائیٹ سوٹوں میں بن بھی لگائے۔ استری بھی کئے۔ اور الماری اور کمرہ بھی ٹھیک کیا۔ میں نے بہت منع کیا۔ مگر وہ نہیں مانیں۔ پھر کہا کہ میں آپ کو اُن کے یہاں آنے کا نہ بتاؤں...“

وہ حیرت سے سب سن رہا تھا۔ بولا کچھ نہیں۔ دھیان ایک بار پھر ٹی وی پر لگا دیا۔

میوہ خان میز صاف کر کے چلا گیا۔

یاور خان نے ایک نظر اپنی شرٹ کے بن پر ڈالی۔ بے اختیار اُس کا فلک شکاف قہقہہ بلند ہوا۔ پھر ٹائیٹ سوٹ کی استری پر نگاہ کی۔ جس کی طرف اُس کا پہلے دھیان نہیں گیا تھا۔ اُس کا حال بھی بنوں جیسا ہی تھا۔

اچانک اُسے شندی پر بے طرح پیار آیا۔ گاؤں اتار تے ہوئے گرم لائننگ والا رین کوٹ پہنا۔ اور تیزی سے پڑتی برف میں شندی کے دروازے پر جا پہنچا۔

اُس نے سوچ لیا تھا۔ شندی دروازے پر آگئی تو ٹھیک۔ ورنہ ماما سے وہ کوئی بہانہ کر دے گا۔

ٹیل بچتے کے تھوڑی ہی دیر بعد ماما نے دروازہ کھول دیا۔

”وہ۔ شندی نے بتایا تھا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اُس نے

خالص جھوٹ بولا۔

اُسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اچھا خاصا Confident بندہ تھا۔ شندی کے پیار میں کنفیوزڈ ہوا جا رہا تھا۔
”اندر آئیں بیٹا۔ برف میں کھڑے ہیں۔“ ماما نے فوراً اُسے اندر آنے کو کہا۔

وہ اندر چلا آیا۔ ماما اُسے شندی کے بیڈروم تک لائیں۔
”اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ چلے جائیں۔“ ماما نے کہا۔ اور۔۔۔ خود دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔
یاور خان نے ہولے سے شندی کے دروازے پر دستک دی۔
”آجائیں۔“ اُس کی مہین دکش آواز ابھری۔
اور۔۔۔ یاور خان اندر چلا آیا۔

شندی کارنس سے ٹکی جانے کن سوچوں میں گم تھی؟ اتنی برفباری میں اُسے اپنے بیڈروم میں دیکھ کر حیران سی بھی ہوئی۔ آنکھوں میں قدیلیں بھی جل اٹھیں۔
”آپ...؟“

وہ پاس چلا آیا۔ چپ چاپ اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ سینے سے جکڑ لیا۔
”تمہیں اچھا نہیں لگا میرا آنا، ہوں۔“ وہ اُسے پیار کرتے کرتے کہہ رہا تھا۔

آج پھر اُس کی گرم مہکتی سانسیں اُس کی سانسوں میں مدغم ہونے لگیں، اُس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو اُس کے حواسوں پر چھانے لگی، اُس کے مقناطیسی سراپے کالس اُس کی روح میں سرایت کرنے لگا!
چند لمحوں ہی بے خودی میں گزر گئے۔ پھر۔۔۔ یاور خان کو ہی ہوش

آیا۔ ماما آجائیں تو؟

اُس نے آہستہ سے اُسے چھوڑ دیا۔ جھکی جھکی نظریں، ہیکے ہیکے ہونٹ لئے وہ وہیں کھڑی رہی۔
”آج ایک چور آیا تھا میرے کمرے میں۔“ وہ اُس کی جھکی جھکی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

شندی سمجھی نہیں۔ نظریں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔
”دیکھو۔“ اُس نے اپنی شرٹ کا بٹن اُسے دکھایا۔ ”میرا بٹن بھی لگا گیا۔۔۔“
اوہ۔ اُس نے فوراً اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
”میں نے نہیں لگایا۔“ وہ صاف مکر گئی۔
اُس نے اُس کے ہاتھ ہٹا دیئے۔ اُسے پھر سینے سے لگا لیا۔
”وہ جس طرح سے لگا ہے نا بچارا۔ اُس کا حال بتا رہا ہے۔ کہ اُسے شائدانہ مم صاحب نے لگایا ہے۔“
”نہیں لگایا میں نے۔“ اُس نے پھر دہرایا۔
اُس نے پھر اُسے پیار کیا۔

”بائے واوے۔ اس یونیک طریقے سے تم نے ٹانگے لگائے کیسے؟“
اُس نے پھر اُسے چھینڑا۔
”میں نہیں بولتی آپ سے۔“ روٹھے روٹھے لہجے میں کہتی وہ اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

یاور خان نے اُسے مضبوطی سے بھینچ لیا۔ بار بار پیار کرنے لگا۔
”تم میرے آپریشن ٹیم میں آ جاؤ۔ سچر لگانے کی باری آئے گی تو تم سچر لگا دیا کرو گی۔“ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

”چھوڑیں مجھے۔“ وہ پھر Struggle کرنے لگی۔
اُس نے ایک پیار اُسے زبردستی دیا۔ اور چھوڑ دیا۔

وہ بالکنی کے رخ جاتی اپنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔
 ”چلو آؤ۔ لوگ روم میں بیٹھتے ہیں۔“ پاس آتے ہوئے وہ مصالحت
 آمیز لہجے میں بولا۔
 ”نہیں۔ میں بات نہیں کروں گی آپ سے۔“ وہ پھولے پھولے منہ
 کے ساتھ بولی۔

اُس سے وہ اُسے بہت اڈور سیل گئی۔
 ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے تمہارا بٹن لگانا اچھا لگا تھا۔ بہت زیادہ۔
 تمہیں جھینکس کہنے ہی تو میں اتنی برفباری میں آ گیا تھا۔۔۔“
 نظریں اٹھا کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔ ناراضگی معدوم ہونے لگی۔
 ”میں تو اپنی اور قمیضوں کے بھی بٹن توڑنے والا ہوں۔۔۔“
 اور۔۔۔ اُسے لگا وہ اب بھی اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ مزید برداشت نہ
 کر سکی۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”کبھی نہیں بولوں گی آپ سے۔“ اُس نے وہاں سے جانے کو قدم
 بڑھائے۔

”I'm serious. I swear, I'm not joking.“ اور بھی
 بٹن لگا دو میری قمیضوں میں۔ یہ بھی بہت پیارا لگا ہے۔“ اُس نے اپنی قمیض کے
 بٹن کو اپنے ہونٹوں سے چھو لیا۔ ”میں ہوسپل پہن کر جایا کروں گا۔“
 وہ ہولے سے مسکرا دی۔ یادِ خان کو لگا، چاند بادلوں سے جھانکا تھا!
 ”بولو گی ناب۔“
 اُس کی دلنشین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے سرد حیرے سے نفی
 میں ہلادیا۔

”بولو نا۔ پلیز!“

اُس نے اب بھی سر کو نفی میں جنبش دی۔ اُس نے تھوڑا اُس کے بٹن

لگانے کا مذاق اڑایا تھا؟ کچھ تو بدلہ اُس نے بھی لینا تھا!
 ”پلیز!“ اُس نے دوبارہ کہا۔

وہ اب بھی چپ چاپ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
 اُس کی دایکوں میں جھوٹا غصہ تھا۔ جھکی پلکوں میں بے تحاشا پیرا تھا!
 اُس کی ہر ادانرالی تھی۔ وہ محفوظ ہوئے بنانہ رہ سکا۔
 پھر۔۔۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔
 ”اب؟“ اُس کی جادوگر آنکھیں شندی پر جمی تھیں۔
 یہ چٹان جیسی چیز پیار کرنے کے سبب انداز جانتا تھا!
 شندی نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ محبت سے
 اپنا گال اُن پر رکھا۔ اور چپکے سے اُس کے دونوں ہاتھوں پر پیار کر لیا۔
 ”ایک یہاں بھی۔“ یادِ خان نے اپنا گال آگے کر دیا۔
 شندی نے ہولے سے اپنے کوئل ہونٹ وہاں رکھ دیئے۔
 اور۔۔۔ یادِ خان بے خود سا ہو گیا۔ ایک بار پھر اُسے اپنے مضبوط
 بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔
 چند لمحوں کے بعد خودی کی نذر ہو گئے۔
 ”آؤ لوگ میں بیٹھتے ہیں۔ ورنہ تمہاری باڈی گارڈ مجھے آئندہ اندر
 گھسنے نہیں دیں گی۔“

دونوں لوگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

ماما دونوں کے لئے کوئی اور چیز سینڈوچز لے آئیں۔ برتن میز پر لگانے
 لگیں۔

”شندی بیٹا۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔“ اُس کا
 کپ اُس کے آگے رکھتے رکھتے ماما گویا ہوئیں۔
 شندی ہل بھر کو کچھ کنفیوزڈ سی نظر آنے لگی۔ نظریں یادِ خان کی طرف

انہیں۔ اس نے فوراً ایک دلکش ویک دی۔

اوہ۔ وہ سمجھ گئی۔ ماما سے اُسی نے کہا تھا۔ وہ بھی بالکل صاف جھوٹ!
 ”جی ماما۔ گلے میں درد ہو رہا تھا۔ سر میں بھی...“ اور وہ کیا کہتی؟
 ”ڈاکٹر صاحب کی دوا بھی لیتا۔ سوتے وقت جو شانہ بھی دوں گی۔“
 ”تھینک یو ماما۔“

اور ماما بچن کی طرف چل دیں۔

”میں تمہارے پیار میں کیا کیا نہ بنا۔“ مسکین سی شکل لئے وہ اپنے لئے
 کوئی بنا رہا تھا۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی۔ اُس نے خود ہی کہہ دیا۔ نہ چاہتے ہوئے
 بھی وہ بے اختیار ہنس دی۔

دونوں دلچسپ باتوں کے دوران کوئی پیتے رہے۔ باتوں کا رخ چلتے
 چلتے ہسپتال اور ہسپتال کی ڈیوٹیز پر آ نکا۔

”کل سنڈے ہے۔ آج کوئی آپریشن بھی نہیں کیا۔ سومریض کی بھی فکر
 نہیں ہے۔ خوب سوؤں گا... اگر تم سونے دو تو۔“ ہیر پھیر کر اُس نے اُس کے
 لئے کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ یہ طے تھا!

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”میری نیندیں اُڑائی ہوئی ہیں“

”نیندیں آپ کے پیشکس نے اُڑائی ہوئی ہیں۔“

”اُن کی مجال ہے میری نیند اُڑائیں۔“

”بائے داوے۔ آپ کی ڈاکٹر نادیہ کا کیا حال ہے؟“ اُسے اچانک

خیال آیا۔

اور۔ یادِ رخاں کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔

”مجھے پتہ تھا ایک زمانہ ضرور پوچھو گی۔“

اُسے نادیہ کے ذکر پر اُس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

”نہیں۔ وہ میرے لئے اتنی امپارٹنٹ نہیں ہے۔“

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ وہ نادیہ سے جیلس لگ رہی تھی!

”ہوں۔“ اُس نے کوئی کا آخری گھونٹ لیا۔ اور خالی کپ میز پر رکھ

دیا۔

وہ چند پل منتظر رہی۔ مگر اُس نے ٹانگیں سیدھی پھیلائے ہوئے خاموشی

سے سرووفے کی پشت سے نکا دیا تھا۔

آپ نے اُسے ہسپتال میں ہی دیکھا تھا پہلی بار؟“ اُس نے

پھر پوچھا۔

وہ اب بھی چپ تھا۔ سامنے خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔

”اچھا یہ بتائیں۔ پہل کس نے کی تھی؟“

اُس کے ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ تھی اور بس!

”I, m sure پہل اُس نے کی ہوگی۔“ وہ خود ہی بولی۔

اُس کی curiosity پر اُس کی مسکراہٹ قدرے گہری ہو گئی۔

”اور پھر آپ... بھی پیچھے پڑ گئے ہوں گے...“

وہ سیدھا ہوتا ہوا۔

”میں اُس کے پیچھے بالکل نہیں پڑا۔“ اُس نے ”پیچھے“ پر زور دیتے

ہوئے کہا۔ ”بس۔ دوستی کا جواب دوستی سے دیا تھا...“

”دوستی یا...؟“

ایک بار پھر وہ خوشگوار سی ہنس دیا۔ وہ چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اُس

کی تسلی کرنا ہی تھی اُسے!

”یار۔ میں ایک غریب بندہ ہوں خدا کا...“

اُس کی شکل اچانک اتنی مسکین ہو گئی تھی۔ اور لب و لہجہ اتنا لاچار کہ نہ

چاہتے ہوئے بھی اُسے ہنسی آگئی۔

”اتنے مسکین مت بنیں۔ آپ پوری چیز ہیں۔“

ایک بار اور اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں۔ اور تم سے پہلے کبھی کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں کی۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”نو۔۔۔ بلکہ۔۔۔ مجھے ایک دولڑکیوں سے انچنٹ بھی ہوئی تھی مگر۔۔۔“

”اُن میں سے ایک ڈاکٹر نادیا ہو گی۔“ اب وہ بھی خوشگوار موڈ میں تھی۔

”اوہ۔۔۔ اُس نے شرارت سے اپنی کینٹی سہلائی۔“ یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہی۔۔۔“

”مطلب یہ کہ یہ اُن دو کے علاوہ تھی؟“ اُسے ہنسی آگئی۔
”لیں۔۔۔“

”آپ۔۔۔ کپکے فلرٹ ہیں۔“

”نہیں نہیں۔ میں فلرٹ نہیں ہوں۔“ اُس کی شکل پھر سے مسکین ہو گئی۔

”پھر کیا ہیں؟“ وہ نکھلا کر ہنس دی۔

”صرف ایک کمزور بندہ خدا۔“ عاجزی انہما کو پہنچ گئی۔ ”اب دیکھو نا۔ ایک

لڑکی تھوڑے سے کپڑے پہن کر، بہت سارا میک اپ کر کے، فرانس کی پوری پرفیومری میں غوطہ لگا کر، کلو پیٹر کے طمطراق کو مات دیتی سامنے آ جائے۔ تو میں تو۔۔۔ ایک مسکین بندہ ہی ہوں نا۔۔۔ ڈگمگا گیا تو کیا عجیب بات ہو گئی۔ شکر کرو۔ الٹا نہیں گرا۔۔۔“

یہ یاد علی خان کہہ رہا تھا۔ عام حالات میں جو بہت جاہ و جلال والا تھا، دبدبے سے جس کے آس پاس کی فضا بھی مرعوب ہو جاتی تھی اور۔۔۔ جان جاتی تھی جس سے اپنے شاف کی ا

وہ ہنستی چلی گئی۔

”یہ کون تھی؟“ ہنسی قدرے تھمی تو اُس نے پوچھا۔

”تمہاری ڈاکٹر نادیا۔“

”میری ڈاکٹر نادیا۔“

جواب میں اُس کی جاندار ہنسی گونجی۔

پھر۔۔۔ میں نے تمہیں دیکھا، پہلی بار تمہاری حویلی میں۔ کھیتوں کی طرف جاتے۔ بے حد سادگی میں بھی تم بہت اچھی لگ رہی تھیں، باوقاری۔ اُس کے بعد تمہیں ہسپتال میں، یہاں آنکسی میں، بار بار دیکھا۔ بابا کے دوست کی بیٹی ہونے کے ناطے تو تم مجھے اچھی لگتی ہی تھیں مگر۔ جلدی ہی میں نے محسوس کیا۔ تم میرے حواسوں پر چھانے لگی تھیں۔ اور۔۔۔ اس سے پہلے۔۔۔ میرے حواسوں پر کسی نے حکومت نہیں کی۔

"No body could govern me like this. And I suppose this is colled love ..."

وہ اب بھی مسکرا دی۔

”اور۔۔۔ ڈاکٹر نادیا سے۔۔۔؟“

”میں نے کہا نا۔ اتنی سڑوگک feelings میری پہلے کبھی کسی کے

لئے ڈیولپ نہیں ہوئیں۔ اتنی کہ۔۔۔ مجھے ڈر لگنے لگے کہ۔۔۔“

وہ چپ چاپ اُسے نکتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

”اچھا چلتا ہوں اب۔“ اُس نے گھڑی پر نگاہ کی۔ ”کافی دیر ہو گئی ہے۔ تم

ان Bewitching آنکھوں سے دیکھتی رہو گی نا۔“ اُس نے باری باری

اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔ ”تو میں سچ نہیں جاپاؤں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا

ہوا۔

وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری آنکھیں اتنی خوبصورت کیوں ہیں، ہاں؟“ وہ اب بھی اُس

کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
 ”اپنی آنکھوں کا پتہ ہے؟“ وہ بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھی۔

”نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میکینک ہیں۔ مسرائیز ڈرہتی ہوں میں۔۔۔“

”Really?“ اُس نے اچانک پڑی بدلی۔ بغور اُس کی آنکھوں

میں جھانکا۔

بے شمار داستانیں تھیں اُس کی آنکھوں میں۔ اُن گنت افسانے تھے!

ساتھ میں شرارت تھی، شوخی بھی!

کوشش کے باوجود وہ سہار نہ سکی۔ جھالریں پلکیں لڑکھڑا کر گر گئیں۔

وہ محفوظ ہوا۔ بہت زیادہ۔

”اچھا۔ شب بخیر۔“ اُس نے اُسے وہیں لوگ میں چھوڑا، اور

بڑے بڑے قدم اٹھاتا پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

برفباری تھم گئی تھی۔ آسمان کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سردی مزید بڑھ گئی

تھی۔

کھانے کے بعد حسب معمول ماما اپنی چائے لئے شندی کے پاؤں کی

طرف آ کر بیٹھ گئیں۔

شندی اُن سے باتیں کرنے لگی۔ اُس کی آواز میں خوشی کی چہکار تھی،

آنکھوں میں سرور کی چمک اور چہرے پر لالی کی دھک تھی!

ماما بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ اور جانے کیوں؟ اُس کی خوشی میں خوش بھی

تھیں۔ یا اور خان اچھا انسان تھا۔ آڑے وقت میں اُن کے کام آیا تھا۔ اچھے دل

کا اچھا ذہن کا مالک تھا۔

مکپ شپ کرنے کے بعد ماما اپنے کمرے میں چل دیں۔ اور شندی لائیٹ آف کرتے ہوئے نرم گرم بستر میں گھس گئی۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی مگر۔

”اتنی سڑوگ feelings میری پہلے کبھی کسی کے لئے ڈیولپ نہیں

ہوئیں۔ اتنی کہ۔ مجھے ڈر لگنے لگے کہ۔۔۔“

اُس کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا وہ

آگے؟

اُس نے سونے کی کوشش ہی چھوڑ دی۔ اطمینان سے اُس کی دلچسپ

خوبصورت باتوں کی بازگشت میں کھو گئی۔

معا اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ کس کا ہو سکتا تھا؟

”پپی برتھ ڈے۔“ یا اور خان تھا۔ ”جلدی سے بالکنی میں آؤ۔ اور اپنا

گفت لو۔“

وہ بہت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ شاید آس پاس کا خیال تھا!

وہ اٹھی۔ لیپ آن کئے بغیر ہی صوفے کی پشت پر سے شال اٹھا کر

ٹائیٹ سوٹ کے اوپر لیٹی اور۔ پتا کوئی کھٹکا کئے بولٹ کھولتے ہوئے آہستہ

سے بالکنی میں نکل آئی۔

بالکنی ڈھلان کے لیول پر ہی تھی۔ یا اور خان ریٹنگ پر سے قدم بڑھاتا

اندر آ گیا۔

بغیر کسی تمہید کے اُس کا ہاتھ تھاما۔ اور کوٹ کی جیب سے ڈائمنڈز سے

مزین بیش قیمت بریلٹ نکالتے ہوئے اُس کی نازک کلائی میں پہنا دیا۔

شندی نے شکریہ کے لئے لب کھولنا چاہے۔ مگر اُس نے اشارے سے

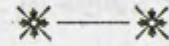
چپ کرادیا۔ کہیں ماما جاگ جاتیں تو؟

شندی نے دیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے گال پر رکھ دیئے۔

وہ بے خود سا ہو گیا۔ بدلے میں اُسے ڈھیر سا راپیار کر لیا۔
اور۔ بالکل آہستگی سے نیچے اترتے ہوئے اپنے گھر کی راہ ہو لیا۔
واہ۔ کیا انداز تھا۔ برتھ ڈے وش کرنے کا؟
چوری چوری آیا۔ گریٹ کیا۔ اور چل دیا!

مدہوش سی وہ اندر آ گئی۔ بستر میں گھستے ہوئے لیپ آن کیا۔ ایک نظر
اپنی کلائی پر ڈالی۔ وہاں گولڈ اور وائیٹ گولڈ میں جڑے ہیروں کا بے حد
خوبصورت بریسلٹ جھللا رہا تھا۔ اُس نے ہولے سے اپنے ہونٹ اُس پر رکھے
اور۔

لیپ آف کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔



آج پھر نادیا نے اُس سے لفٹ لی تھی۔ اُس کا گھریلو ڈرائیور کسی کام
سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ سو اُس نے یاور خان کو اُسے گھر ڈراپ کرنے کو کہا
تھا۔

دونوں باتیں کرتے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔
گو دونوں کا تعلق اب صرف کبھی کبھار باتوں تک ہی رہ گیا تھا۔ مگر نادیا پھر بھی
کوئی نہ کوئی Hint دے جاتی۔ اپنی محبت کی، اُس کی بے رخی کی اور۔ انور صاحب کی
دولت کے ریل پیل کی!

یاور خان نے البتہ کبھی اُس سے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نہ یہ کہ وہ انور
سے اُس کی ملاقاتوں سے واقف تھا، نہ یہ کہ اب وہ اُسے آپریشن تھیٹر کے علاوہ

کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ۔۔۔ وہ تو خاصا مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ پُرسکون، پر امن!

پھر اب تو وہ شندی کی معصوم محبت سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُسے گھر پر چھوڑتے ہوئے وہ واپس مڑا۔ اور چکر دار سڑک پر احتیاط سے چلتا آگے بڑھنے لگا۔

شام گھر آئی تھی، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف چل پڑے تھے اور۔۔۔ سردی بوا ہو گئی تھی۔

گاڑی بستی کی طرف موڑتے ہوئے وہ دیرے دیرے اوپر جانے لگا۔

دائیں جانب والا موڑ کاٹتے ہوئے وہ پیچھے گیا۔ تو منظر یکسر بدل گیا۔ ڈھلان پر بکھرے گھروندوں میں سے شام کی پکوان کے دھوئیں اٹھ رہے تھے، بید بجنوں کی زمین یوس شاخوں پر بنائے گھونسلوں میں پیچھی آ آ کر بیٹھ رہے تھے اور۔۔۔ نور محمد کا دس سالہ بیٹا اپنی بھیڑ بکریاں ہانکتا گھر کی طرف رواں دواں تھا!

روح پرور منظر کومن میں اتارتے اتارتے اُس نے اوپر نگاہ کی۔ شندی کی بالکنی خالی تھی وہ اکثر اُسے اس وقت یہاں نظر آتی تھی۔ کبھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے، کبھی سنیک کھاتے ہوئے۔ شاید مصروف تھی اندر۔

آخری موڑ کاٹتے ہوئے وہ ایک بار پھر سامنے آ گیا۔ تبھی۔۔۔ اُس کی نظر بائیں جانب شندی کے گھر کے پچھلے دروازے پر پڑی۔ بالکل وہیں جہاں چند روز قبل رات کو وہ اور شندی کھڑے تھے، اس وقت شندی کے پاس ابراہیم کھڑا تھا۔ شیرنگ وٹیل پر اُس کی گرفت ڈھیل پڑ گئی،

کنپٹیاں سلگ سی اُنھیں۔

چند روز پہلے اُن کے یہاں ڈنر پر بھی وہ شندی کے بہت آگے پیچھے ہو

رہا تھا۔ مگر اب۔۔۔ اب تو گھر جا پہنچا تھا۔ وہ بھی جب شام گہری ہو رہی تھی! غصہ سے بھناتا، آگے بڑھتا، وہ اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

سیدھا اپنے بیڈ روم میں گیا۔ شندی کو فون کرنے ہاتھ فون کی طرف کیا۔ مگر پھر۔۔۔ جیسے کچھ خیال آ گیا، ارادہ بدل دیا۔

واش روم گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت قدرے بشاش ہو گئی۔ نرم و گرم کپڑے پہنے اور آتش دان میں جلتی لکڑیوں کی آگ کے قریب صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کرتے ہوئے کوئی کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر وہ مختلف چینلوں چیک کرتا رہا۔ پھر۔۔۔ ایک لگا ہی لیا۔ کچھ بے چین سا تھا، بے کل سا۔

پھر۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اُس نے اپنا سیل اٹھایا اور شندی کا نمبر ملا لیا۔

”Shandi here.“ اُس کی آواز اُس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

”کیسی ہو؟“

”بالکل ٹھیک۔“

”ابراہیم کیا کر رہا تھا تمہارے پاس؟“ وہ بلا تہید بولا۔ اُس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دھاڑی تھی۔

شندی سہمی گئی۔ تو اُس نے اُسے دیکھ لیا تھا!

”آئی سے میں نے کچھ کپڑے منگوائے تھے۔ وہ دینے آیا تھا۔“ کارمنٹس، شوز وغیرہ کی جتنی بھی شوپنگ ہوتی تھی وہ آئی سے ہی کرواتی تھی۔

”اُن کے نوکر کیا مر گئے تھے سب؟“

یہی تو اُس نے ابراہیم سے کہا تھا۔ کہ وہ کسی نوکر کے ہاتھ بھجوا دیتا۔

”میں نے سوچا اتنی خوبصورت لڑکی کو ایک بار پھر مل لوں۔“ اُس نے

کہا تھا۔

وہ اور بھی کئی معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ اوپر سے یادِ خان بھی پوچھ گچھ کرنے لگا تھا۔

”وہ... میں نے کہا تھا اُس سے...“

”پھر؟ کیا کہا اُس نے؟“

”ک... کچھ نہیں۔“ وہ اب بھی گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

اُسے اُس پر ترس آ گیا۔ اس میں اُس کا کیا قصور تھا؟

”اچھا سنو۔ پھر کوئی آئے۔ تو ماما کو بھجوا دیا کرو۔ تم باہر مت نکلا کرو۔“

”اچھا۔“

جبکہ اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر ابراہیم نے ماما سے کہا تھا کہ وہ خود بات کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی مالکن سے۔

تبھی۔ حمید اُس کی کوئی لے کر آ گیا۔

”میں پھر فون کروں گا۔ Love you“ اُس نے فون بند کر دیا۔

کوئی پیتے پیتے اُسے خیال آیا۔ وہ خود چلا جائے شندی کے پاس۔ اُس کی برتھ ڈے پر اُسے Greet کرنے کے بعد وہ اُس سے ملا ہی نہیں تھا۔ فون پر بات ہو جاتی تھی۔ جو پیاس اور بڑھادی تھی۔

مگر۔ اب کیا بہانہ بنائے گا؟ اُس کی ماما کی تو...

پھر اُسے ایک ترکیب سوچھی۔ شندی کا لینڈ لائن ملا دیا۔

”ہے... لو۔“ اُس کی توقع کے عین مطابق ماما ہی تھیں۔

”ماما میں ڈاکٹر یا در بات کر رہا ہوں۔“ اُس نے کچھ جھجکتے جھجکتے کہا۔

پتہ نہیں کیوں دل میں چور سار بنے لگا تھا شندی سے اپنے پیار کے اظہار کے بعد

۔

”جی بیٹا۔ کیسے ہیں آپ؟“ ادب کے ساتھ ساتھ اُن کے لہجے میں شفقت بھی تھی۔

یادِ خان قدرے Encourage ہوا۔

”ٹھیک ہوں ماما۔ آپ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں بیٹا۔ اس عمر میں کچھ نہ کچھ تو لگا ہی رہتا ہے۔“

”تو آپ مجھے بتایا کریں نا۔ میں فٹ کر دوں گا بالکل۔“

”اللہ عمر دراز کرے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو...“

”ٹھینک یو ماما۔“

شندی کے ’ٹھینک یو‘ کہنے پر بھی ماما بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت

یادِ خان کے کہنے پر اور بھی خوش ہو گئیں۔

”جیتے رہئے، خوش رہئے۔ شندی بی بی بھی ’ٹھینک یو‘ کہتی ہیں تو دل

خوش ہو جاتا ہے۔“

”آپ کی شندی بی بی کیا کر رہی ہیں؟“ اُسے موقع مل ہی گیا۔

”ارے بیٹا۔ آج تیرا دن ہے۔ برابر گاجر کا حلوہ بنانے کی کوشش

کرتی ہیں اور پھر رد کر جاتی ہیں۔ کہ ماما آپ کے جیسے والا نہیں بنا۔ اس وقت پھر

لگی ہوئی ہیں...“

اوہ۔ یادِ خان بے اختیار ہنس دیا۔

شندی پر بے طرح پیار آیا۔ اُسی کے کہنے پر تو وہ سیکھنے کی کوشش کر رہی

تھی!

”کہتی تھیں۔ جس دن ٹھیک بن جائے گا ڈاکٹر صاحب کو بھی بھیجیں

مے۔“ ماما نے مزید کہا۔

”واؤ۔ ویسے ماما آپ نے کیا پایا ہے آج؟“

”میں نے چکن بریانی اور مٹر قیمہ بنائے ہیں۔ فروٹ کشرڈ بھی ہے...“

”بہت مزیدار چیزیں ہیں سب ہاں۔“

”آپ کو پسند ہیں یہ چیزیں؟“

”بہت۔“

”تو آپ آجائیں نا۔ شندی بی بی کے ساتھ مل کر کھالیں۔“

اُسے یہی تو چاہئے تھا۔ ماما سے بات کرنے کی ساری تگ و دو اسی لئے تو کی تھی۔

”آتا ہوں ماما پھر میں بھی۔“ اُس نے فون بند کر دیا۔

اٹھا۔ ڈرینگ روم جا کر اوڈر کوٹ پہنا اور۔ گھر سے نکلتے ہوئے شندی کی طرف ہولیا۔

پچھلے دروازے پر دستک دی۔ تو ماما نے خوشی خوشی دروازہ کھول دیا۔

”آئیں بیٹا آئیں۔ اپنا ہی گھر سمجھیں۔“

وہ اندر داخل ہو گیا۔ مختصر سے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے دائیں طرف نظر ڈالی۔ شندی کچن میں مصروف تھی۔ اُسے بہت اچھا لگا۔ کھلے دروازے کو ہولے سے اٹکیوں سے بجاتے ہوئے اندر چلا آیا۔

اُسے دیکھ کر شندی بدحواس سی ہو گئی۔

ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ سارا کچن اٹھل پٹھل ہو رہا تھا۔

”آپ... آپ کیسے آئے؟“

”تمہیں حلوہ پکاتے دیکھنے آ گیا۔“

”اوہ۔“ اُس نے فوراً دیکھے پر ڈھکن بند کر دیا۔ آگے بڑھ آئی۔

”آئیں لوگ میں بیٹھتے ہیں۔“ وہ لال سرخ ہو رہی تھی۔

”نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔ تمہیں حلوہ پکاتے دیکھوں گا۔“ وہ وہیں

کھڑا رہا۔

”پلیز چلیں نا۔ میں آپ کے سامنے نہیں پکا سکوں گی۔“ وہ سچ بچ

گھبرا ئی جا رہی تھی۔

”اچھا کتنی دیر اور لگے گی؟“ وہ واقعی اُس کے سامنے کچھ نہ کر پاتی۔

جانا ہی بہتر تھا۔ ”میں ویٹ کروں گا۔“

”بس دو منٹ میں تیار ہوتا ہے۔ آپ چلیں میں آتی ہوں۔“

”او کے ایم صاحب۔“

وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج وہ پہلے کی نسبت زیادہ بے تکلف محسوس

کر رہا تھا۔

شندی جلدی ہی آ گئی۔ اُس کے قریب والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا میں حلوہ بنا رہی ہوں۔“

”ماما نے بتایا تھا۔“

”اوہ۔ تو وہ لمبی لمبی باتیں آپ سے کر رہی تھیں؟“

”ہاں۔ بلکہ میں نے فون کیا تھا انہیں۔“

”اُن کو فون کیا تھا؟“

”اُن کے ساتھ دوستی کی تو تم تک رسائی ہوئی نا۔“

”اوہ مائے گوڈا!“ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔ ”آپ Tricks بھی

کرتے ہیں؟“

اُس کا جاندار قبضہ بلند ہوا۔

”کرنا پڑتا ہے۔“

”اچھا؟“ شندی شرارت سے بولی۔

اور۔ یادِ خان نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس کے خوبصورت گھنے

بال جھنجھوڑ ڈالے۔

”میرے سارے بال الجھا دیئے۔“ بال درست کرتے کرتے وہ

روٹھی روٹھی سی شکل لئے بولی۔

اس وقت وہ اُسے بہت پیاری لگی۔

اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔
”مجھے پورے کا پورا الجھا دیا۔ وہ کوئی بات نہیں، ہاں۔“ وہ اُس کی بند
بند آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ آواز جذبات سے بھاری ہونے لگی۔

”ہوں، ہتاؤ نا۔“ انگلی سے اُس کے خوبصورت چہرے پر لکیر بناتے
ہوئے وہ ایک بار پھر بولا۔

وہ خاموش تھی۔ کبھی بھی کیا؟

”اچھا اور تو دیکھو نا۔“ وہ باری باری اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار
کرتے ہوئے ایک بار اور بولا۔

اور۔۔۔ شندی نے آہستہ سے جھالریں پلکیں واکیں۔

اُس کی آنکھوں میں بے شمار باتیں تھیں۔ بے حساب قصے تھے۔

وہ سہار نہ سکی۔ پلکوں کی چلن کرنے اُٹھنے لگی۔

اور۔۔۔ اُس نے اُسے ڈھیر سارا پیار کر لیا۔

قدرے ہوش میں آیا۔ تو اُسے اپنے سے الگ کیا۔ اُس کے بال

سہلائے۔

تبھی ماما دونوں کے لئے کوئی لیکر آ گئیں۔ اُن کے آگے میز پر لگائی۔

اور خالی ٹرے لئے واپس چلی گئیں۔

شندی چپ چپ سی تھی۔ یاور خان اپنے لئے کوئی بناتے ہوئے

دھیرے سے مسکرایا۔

”شندی باتیں کرو نا۔“

وہ کیسے باتیں کرتی۔ نظریں تو اوپر اٹھا نہیں سکتی تھی۔ اتنی بول رہی تھیں

آج اُس کی آنکھیں۔ آہستہ سے اُس نے اپنا نگ اپنے نزدیک کر لیا۔

”اچھا تم مت کرو۔ میں باتیں کرتا ہوں۔ تم سنو۔“

وہ ریلیکس محسوس کرنے لگی۔

”تمہیں پتہ ہے ایک لڑکی نے مجھے Haunt کیا ہوا ہے۔ گھر میں بھی
ہوسپٹل میں بھی میرے حواسوں پر چھائی رہتی ہے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو بھی
وہی، کھولتا ہوں تو بھی وہی۔ پتہ نہیں کیا ہو گا میرا۔۔۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے آخری جملے پر شندی کو ہنسی آ گئی۔

وہی دور کہیں بچتے پانکوں کی سی ہنسی!

اُس کی ہر ادا انوکھی تھی۔ وہ بے بس سا اُسے دیکھنے لگا!

”میں تو کہیں کا نہیں رہا۔ اُلٹے سیدھے کام کرنے لگا ہوں اب تو۔“

”مثلاً؟“ شندی بول ہی پڑی۔

یاور خان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

”مثلاً۔“ ایک پل کو اُس نے کچھ سوچا۔ ”کل میں نے آپریشن کے بعد

مریض کے پیٹ پر ٹانگے لگانے کے بجائے پاس کھڑے ڈاکٹر کے ہاتھ پر لگا

دیئے۔۔۔“

اور۔۔۔ شندی کھلکھلا کر ہنس دی۔

”آپ۔۔۔ جھوٹ بھی بولتے ہیں؟“

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

”کبھی کبھی۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو۔“

”اس وقت ضرورت تھی؟“

”ہاں نا۔ تم بول جو نہیں رہی تھیں۔“

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا تھا!

شندی نے اپنا نگ اٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ کوئی پینے لگی۔

تبھی۔۔۔ یاور خان نے اُسے نواز کی دی گئی مزید معلومات سے آگاہ

کیا۔ مسز علی ملک سے باہر پہنچی ہوئی تھی۔ اکرم بابا ابھی بھی پولیس کی نظر سے

پوشیدہ تھے۔ نواز بتا رہا تھا۔ کہ وہ اکرم بابا سے ملا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ کہ جوں ہی شندی بی بی گھر آ جائیں گی، اُن کی بیوی بچوں کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا ہو گا۔ تو وہ خود بخود گواہی دینے کو رٹ میں پیش ہو جائیں گے ...

”اوہ۔ انکل انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بہت خوفناک انسان ہیں۔“ اُسے پٹیتے وقت اُن کا غضبناک چہرہ اُس کے سامنے آ گیا۔ وہ سہم کر بولی۔

”انکل اُن کا کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمہارے پاپا کے ساتھ اگر کیا۔ تو صرف موقع کا فائدہ اٹھا کر کیا۔ اب اُن کی اصلیت کھل چکی ہے۔ دوبارہ ہمت نہیں کر سکتے۔ انہیں پتہ ہے الزام اُن پر ہی آئے گا۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ اب بھی گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ اور۔۔۔ یادِ خان نے سوچا۔ اُسے بتا کر اُس نے اُس نے غلطی کی۔ آئندہ وہ اس سلسلے میں اُس سے بات نہیں کرے گا۔ کیس چلتا رہے گا۔ جو ہو گا۔ سامنے آ جائے گا۔

”میں ہوں نا۔“ اُس نے اُس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ ”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اُس کی دلنشین آنکھوں میں اپنائیت تھی، بہت کیڑی تھی!

اُس کی ڈھارس بندھی۔ دل بڑا ہوا۔

”اور پھر اچھا ہے کہ کچھ فیصلہ ہو۔ تم کب تک یوں جھپتی چھپاتی پھر رہی۔ جبکہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اپنے لوگ ہیں ...“

”اپنا گھر ہے۔ اپنے لوگ نہیں ہیں۔“ وہ اُداسی سے بولی۔ وہ چپ سا ہو گیا۔ اُس کی طرف دیکھا۔ ایک گہری سانس لی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اُس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے پرکشش ہونٹ رکھ دیئے۔

”مجھے اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔“ اُس کی حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔ آہستہ سے اپنا سر اُس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ وہ اُس کے خوبصورت مہکتے بال سہلانے لگا۔ بہت پیار سے، بہت اپنائیت سے۔

”سنو۔“

”جی۔“ وہ سر اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

”یہ۔۔۔ ابراہیم کیوں آیا تھا؟“

وہ اب بھی قدرے گھبراہٹ مگنی۔

”آپ کو بتایا تو تھا۔ میری شوپنگ کی چیزیں لیکر آیا تھا ...“

”ہہہہ۔“

”غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا؟“

”اپنے گھر ڈنر پر بھی تمہارے آگے بیچھے ہو رہا تھا۔ اُس وقت تو میرا دل چاہا تھا گلہ دیا دوں اُس کا اور آج۔ آج دل چاہا تھا گولی مار دوں اُسے۔ ایک دو نہیں۔ پوری مشین گن خالی کر دوں ...“

”باپ رے۔“ شندی مسکرا دی۔

”میں سیریس ہوں۔ آئندہ تو ہمت کر کے دیکھے ...“

تبھی اُس کا سیل بج اٹھا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔

”مجھے جانا ہو گا سیم۔ ہسپتال سے کال ہے۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”لیکن آج تو آپ آن کال نہیں ہیں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوہ۔ تمہیں اتنا یاد رہتا ہے۔“

”مجھے آپ کی بہت سی باتیں یاد رہتی ہیں۔“

اُس نے محبت سے اُسے دیکھا۔ پیار سے اپنے ہاتھ کی پشت سے اُس کا گال سہلانے لگا۔

”وہ دراصل میں نے اپنے شاف سے کہہ رکھا ہے۔ کہ میرے پشت کو پرالیم ہو تو آن کال سرجن سے مت کہیں مجھے خود بلائیں۔“

”اوہ۔“ اُسے سسزنگس نے بھی یہی بتایا تھا کہ یاور خان اپنے پشت کو دیکھنے خود آتا ہے۔ آن کال سرجن سے تسلی نہیں ہوتی۔ ”لیکن کھانا تو کھا کر جائیں۔“

”پھر کبھی سہی، ہاں۔“ اُس نے اُس کا گال تھپتھپایا۔

اور۔۔۔ بڑے بڑے قدم اٹھاتا گھرا آیا، گاڑی میں بیٹھا اور۔۔۔

ہوسپٹل کی راہ لی۔

رات دیر سے واپس آیا۔ اوپر جاتے جاتے اُس نے حمید کو کھانا اُس کے بیڈ روم میں لانے کو کہا، ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں کھانے کی ٹرے لئے حمید اندر آ گیا۔ اُس کے سامنے میز پر برتن لگانے لگا۔

”صاحب نور محمد یہ حلوہ لیکر آیا تھا۔“ اُس نے حلوے کی ڈش رکھتے رکھتے کہا۔

”اوہ۔“ شندی کے ہاتھ کا بنا حلوہ!

ایک دلاویز مسکراہٹ اُس کے لبوں سے چپک کر رہ گئی۔

وہ کھانا کھانے لگا۔ حمید نے بھی آج سوپ خاصا اچھا بنایا تھا۔ چائیز چلی اور چاول بھی بُرے نہیں تھے۔ یکے ہی گیا تھا آہستہ آہستہ

اور۔۔۔ حلوہ۔۔۔ بس سو سوتا تھا۔ مگر اُسے بہت اچھا لگا۔ کہ شندی نے یہ صرف اُس کی خاطر بنایا تھا!



دن دھیرے دھیرے سرک رہے تھے۔ ٹھنڈا اب بھی تھی۔ مگر وہ والی چھین نہیں رہی تھی۔ خوبانیوں اور سیبوں کے باغوں میں سفید گلابی شکوفوں کی بہار آگئی تھی، نوخیز ہریالیوں میں نرم خرام ہوائیں۔ سرگوشیاں کرنے لگی تھیں اور۔۔۔ چرند پرند میں نئی جوت انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

متواتر تین گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہنے کے بعد یاور خان تھا کہ سا سرجن لاؤنج میں آ گیا۔ ماسک اور گلووز اتارے، ہاتھ دھوئے، کچھٹ آیا، اپنے لئے چائے بنائی۔ اور پرلی طرف جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ نادیا بھی ساتھ ساتھ تھی۔

”تھک گئے ہونا؟“ نادیا کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

یاور خان چونک سا اٹھا۔ عرصہ بعد وہ concerned سی لگ رہی

تھی۔

”ہاں۔“ اُس نے میز کے نیچے ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔ سرکری کی پشت سے لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”اور ابھی ایک اور بھی آپریشن رہتا ہے۔“ وہ اپنے پرس میں سے پیپر نیپکن نکالتے ہوئے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے آپریشن کے دوران لگا خون کا چھینٹا صاف کرتے ہوئے بولی۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

”بہت مہربان ہو رہی ہو آج ہاں۔“ سیدھا ہوتے ہوئے اُس نے

کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”تم ہی کچھ کچھ رہتے ہو ورنہ...“ وہ خاموش ہو گئی۔

چائے پینے کے دوران نادیا نے مزید گلے شکوے کئے۔ شندی کا بھی ذکر آیا۔ کہ اُس کا خیال تھا کہ یاور خان اُس میں انٹرسٹڈ تھا سو اُس نے خود ہی قدرے فاصلہ رکھ لیا تھا۔ لیکن اب اُس کی غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہیں۔

یاور خان ہاں ہوں میں جواب دیتا رہا۔ اور کرتا بھی کیا؟

دوسرے آپریشن سے فارغ ہو کر وہ لُنج کے لئے کینی ٹیریا میں آ گیا۔

وہیں ڈاکٹر نادر بھی ایک ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی آ کر بیٹھ گیا۔

”خیریت؟ آج لُنج کے لئے ہوٹل نہیں گئے؟“ یاور خان نے پوچھا۔

اُس کا فلیٹ ہوٹل کے احاطے میں ہی تھا!

”سُز۔ دراصل آج میری وائف بمعہ بچے کے چلی گئی اپنے پیرنٹس کے

پاس۔ نوکر بھی بس یوں ہی سا ہے۔ سو جتنے دن وہ وہاں گزارے گی۔ میں لُنج

یہیں کیا کروں گا۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ یاور خان نے بھی اپنے لئے کھانا منگو لیا۔

دونوں کھانا کھاتے کپ شپ کرنے لگے۔

”کل ڈاکٹر کوثر کا نکاح ہو گیا ہے۔ آپ کو پتہ ہے؟“

ڈاکٹر نادر کے پاس ویسے خبریں خاصی ہوتی تھی!

”اچھا۔“ شاید اُسے انور کے علاوہ کوئی مل گیا تھا!

”ڈاکٹر نادیا آج کل بڑی آپ سیٹ رہتی ہیں۔ وہ تو اپنی دانست میں

لے اڑی تھیں انور کو مگر انور کے پیرنٹس نے انور کو کھری کھری سنائیں اور کل شام

بٹھا کر نکاح پڑھوا دیا ڈاکٹر کوثر کے ساتھ...“

تو اس لئے آج ایک بار پھر مہربان ہو رہی تھی اُس پر!

”تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب؟“

”ڈاکٹر کوثر کی میری وائف سے بڑی کپ شپ ہے۔ اُس نے خود فون

کر کے بتایا ہے اُس کو۔“

”آئے سی۔ ویسے ٹریٹ لینا چاہئے ڈاکٹر کوثر سے۔“ یاور خان

خوشگوار سے بولا۔

”میں نے صبح کہا تھا اُس سے۔ کہتی تھی کل دے گی ٹریٹ سب کو۔“

”چلو اچھا ہے۔ ڈاکٹر کوثر کا گھر بس جائے گا۔“

لُنج کے بعد دونوں اپنے اپنے آفس چلے گئے۔

”چھٹی ہونے سے پہلے نادیا نے اُسے سیل پر میسج دیا۔ کہ گھر جاتے

وقت وہ اُسے ساتھ لیتا جائے۔

شام ساڑھے چھ بجے کے قریب آج پھر دونوں گاڑی میں بیٹھے اپنے

گھروں کی طرف چلے جا رہے تھے۔

”تمہاری... پیشد کا کیا بنا؟“ نادیا نے خاصی دیر کی خاموشی کو توڑا۔

اوہ۔ اُس کا اشارہ یقیناً شندی کی طرف تھا!

”کون سی پیشد؟ آج جس کا آپریشن ہوا ہے؟“ وہ جان بوجھ کر

انجان بن گیا۔ لہجے میں شرارت سی بھی تھی۔
 ”چھوڑنا۔ اچھی طرح جانتے ہو میں کس کی بات کر رہی ہوں۔“
 یادِ رخاں نے صبح بھی نوٹ کیا تھا، اس وقت بھی۔ وہ کچھ پریشان سی
 تھی، بشکری بھی۔
 ”میں واقعی نہیں جانتا تم کس پیشہ کی بات کر رہی ہو؟“ وہ اب بھی
 انجان بنا رہا۔

”میں نیلوفر کی بات کر رہی ہوں۔“
 ”اوہ۔ اُس کو کیا ہوا؟“ لب و لہجہ اب بھی شریر تھا۔
 ”تنگ مت کرو تا یاد۔ میں پہلے ہی کافی پریشان ہوں۔“
 ”کیوں؟ کیا ہوا؟“
 ”بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ۔ نیلوفر کا کچھ بنایا نہیں؟ کب جائے گی وہ
 یہاں سے؟“
 یادِ رخاں مسکرا دیا۔ دلا ویزی سے۔
 ”تم کیوں اُسے یہاں سے بھگانے پر تکی ہو؟“ وہ خوشگوار سی
 بولا۔

”میرا بس چلے تو میں اُس کا گلہ دبا دوں۔“
 ”اوہ مائے گود! اتنی بری لگتی ہے تمہیں۔“
 ”کیوں نہیں لگے گی۔ تم جو... اچھا بتاؤ۔ تمہارا اُس کے ساتھ صرف
 دوستی کا تعلق ہے یا...“

”کہیں دوستی سے بات آگے نکل گئی ہو تو؟“
 ”میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ سختی سے بولی۔
 ”واؤ۔“ یادِ رخاں نے اپنی کینٹی سہلائی۔ ”میں بے پچارا...“
 ”تم پچارے ہرگز نہیں ہو۔“ وہ تیزی سے بولی۔

یادِ رخاں نے گہری تھکی سانس لی۔ مسکرایا۔
 ”تم اچھی خاصی میچورڈ ڈاکٹر ہو۔ لیکن بعض وقت بالکل بچوں جیسی
 باتیں کرتی ہو...“
 ”دیکھو میں سیریس ہوں۔ تم بات ٹالنے کی کوشش مت کرو۔“
 ”میں بات ٹال نہیں رہا۔“
 ”تو پھر صاف بتاتے کیوں نہیں ہو کہ مجھ سے اکتا گئے ہو۔“
 ”باپ رے۔ تم اکتانے والی چیز ہو؟“ وہ اپنی دلنیش آنکھیں پوری
 کھولتے ہوئے بولا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی نادیدہ ہنس دی۔
 ”اچھا چھوڑو۔ تم نہیں بتاؤ گے۔ میں ہی اپنی پریشانی بتا دیتی ہوں۔“
 وہ اُس سے بات اگلو نہ سکی۔ ہار ماننا ہی پڑی۔
 ”ہاں پلیز! بتاؤ تا کیوں پریشان ہو؟“
 ”میرے لئے ایک پروپوزل آیا ہے۔“
 ”یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔“ اُس نے پھر اُسے چھیڑا۔
 ”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ تم اپنی مندر سے جلدی بات کرو۔ کیونکہ می
 اورڈیڈی اس بار مجھے سیریس لگ رہے ہیں۔“
 ”تو ہونے دو تا سیریس۔“
 نادیدہ جھنجھلا اٹھی۔

”پہلے تم سیریس ہو جاؤ۔ تمہیں پتہ ہے میں تمہارے علاوہ کسی اور کا
 سوچ بھی نہیں سکتی۔“

یادِ رخاں دھیرے سے مسکرایا۔ انور سے مایوس ہو کر ایک بار پھر وہ
 اُسے بیوقوف بنانے کا سوچ رہی تھی۔
 ”تمہیں میں نے بتایا تھا تا کہ امی اپنی ایک دوست کی بیٹی سے میرا رشتہ

کروانا چاہتی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ امی اپنی بات کی بہت پکی ہیں۔ میں تو خود پریشان ہوں کہ امی سے کیسے اپنی بات منواؤں گا۔ وہ واقعی شندی کے بارے میں امی سے بات کرنے کے خیال سے آپ سیٹ تھا۔

”تو تم نے ابھی بات نہیں کی اُن سے؟“

”چھٹی ملے تو جاؤں۔ فون پر کرنے والی باتیں تو ہیں نہیں۔“

”اور اس دوران بھی می اور ڈیڈی نے میری بات پکی کرادی تو؟“

”تو وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔“ اُس نے گاڑی بائیں جانب

نادیہ کے گھر کی طرف موڑ دی۔

کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے عالم سے دوچار وہ گاڑی سے اتر گئی۔

اور۔۔۔ یاور خان نے آہستہ سے گاڑی کا رخ واپس موڑ لیا۔

گھر کی طرف چلا۔ تو کچھ گھٹی سا محسوس کرنے لگا۔

اُسے چاہئے تھا کہ اُس سے صاف بات کر لیتا۔ اندھیرے میں رکھنا

کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن۔۔۔ کیسے منہ پر کہہ دیتا؟ اور پھر شدید لڑائی کا

امکان بھی تو تھا!

بہر حال۔۔۔ آئندہ بات ہوئی اس موضوع پر۔ تو یقیناً اُس سے

معذرت کر لے گا۔

”رات گھر آئی تھی۔ جگمگاتی کہکشاں بستی پر جھک آئی تھی اور۔۔۔ اور

پارکسی جزیرے سے سرگوشیاں کرتی ہوائیں در آئی تھیں!

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے اپنی بالکنی میں کھڑا وہ ارد گرد کے سحر

سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

تبھی۔۔۔ اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ نادیدہ تھی۔

”ایس ڈاکٹر صاحب۔“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”تمہیں بتایا تھا اُس پر پوزل کا۔“

”ہاں۔“

”وہ لوگ آج پھر آئے تھے۔“

وہ خاموش رہا۔ کیا کہتا؟ انور نے راستہ بدل لیا تھا تو اُسے اُس کی یاد

آگئی تھی!

”کچھ بولوتا۔“ وہ پھر بولی۔

”کیسا ہے وہ آدمی؟“ آخر وہ گویا ہوا۔

”کون؟“ وہ جیسے سمجھی نہیں۔

”وہی جو تمہیں پروپوز کر رہا ہے۔“

”بس اچھا ہے۔ سائیکیاٹرٹ ہے۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔ یہی کچھ تو ہوتا ہے۔“

”کیا؟“ اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔

”ہاں۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اتنی چاہت سے تمہارا رشتہ مانگ

رہا ہے۔ یہی تمہاری قدر بھی کرے گا۔“ اُس نے اپنی رائے دے دی۔

”اور تم۔۔۔ نیلوفر کے چکر میں ہو۔“ وہ اچانک آتش پا ہو گئی۔

اُس نے انکار نہیں کیا۔ خاموش رہا۔

اُسے اور بھی غصہ آ گیا۔

”خود سے اتنی چھوٹی اور مجبور لڑکی کے ساتھ کچھ بھرے اڑاتے شرم نہیں

آتی۔“ وہ چلائی۔

”اوہ شٹ آپ۔“ کتنی فضول بات کر رہی تھی۔ وہ بھی برس پڑا۔

”چلاؤ مت۔ اتنے پارسا بھی نہیں ہو۔“

”Stop it. I say, stop it.“

”سچی بات کڑوی لگی نا۔“

جج تو اُس کے پاس بھی بہت تھا۔ مگر وہ اتنا کم ظرف نہیں تھا کہ اُسے یاد

دلالت!

”Shut up — Just shut up.“ اُس نے فون بند کر دیا۔
وہ عورت نہ ہوتی تو وہ اُس کا گلہ دبا دیتا۔ کتنی گندی اور مکروہ سوچ تھی
اُس کی!

اور۔ بالکٹی سے اندر کمرے میں آتے آتے اُس نے سوچا۔ یہی وقت
تھا۔ اُسے امی کو سب بتا دینا چاہئے تھا!
کچھ دیر یوں ہی وہ بے مقصد بچ کرے میں کھڑا رہا۔ پھر خیال آیا اُسے
حمید نے آج کوئی نہیں دی تھی۔ گھر آتے ہی وہ کوئی نہ پی لیتا تو وہ ادھورا ادھورا
سامحوس کرتا تھا۔

اوپر سے کہلانے کی بجائے وہ خود نیچے پکن میں آ گیا۔
”صاحب۔ میں آپ کی کوئی لیکر آیا تھا۔ آپ فون پر بات کر رہے
تھے۔ میں واپس لے آیا۔“

وہ جس وقت نادیر سے تیز تیز باتیں کر رہا تھا۔ اُسی وقت حمید کوئی لیکر آیا
تھا۔ مگر یاور خان کو غصے میں دیکھ کر اُلٹے قدموں واپس آ گیا تھا۔
”اوہ۔ چلو اب لے آؤ۔ اور۔ میوہ خان کو بھی اوپر بھیجو۔“ کہتے کہتے
وہ واپس مڑا۔

کوئی اور میوہ خان دونوں آ گئے۔ کس کافر کا دھیان نہ بدلتا!
کوئی کا خالی کپ اور میوہ خان دونوں رخصت ہوئے تو وہ وہیں
صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے شندی کا نمبر ملانے لگا۔
”کیسے ہیں آپ؟“ ادھر سے شندی کی آواز ابھری۔
ہر بار شرمایا لگایا لہجہ۔ فرمانبرداری، مؤدب سی!
جاگیردارانہ ماحول میں پٹی بڑھی یہ بھی تو ایک لڑکی تھی۔ وہ نادیر سے
اُس کا مقابلہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔

ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ کیا کر رہی تھیں؟“
وہ مسکرا دی۔

”Patience کھیل رہی تھی۔“

اوہ۔ تاش کا گیم جو صرف ایک بندہ کھیلتا ہے!

”اس کا مطلب ہے لوٹی فیل کر رہی تھیں۔“

”ہاں۔ ماما بھی بازار گئی ہیں۔“

”میں آ جاؤں؟“ اچانک اُس کا دل اُسے ملنے کو کرنے لگا۔

”آ جائیں۔“

”واقعی آ جاؤں؟“ ماما بھی تو نہیں تھیں۔

شندی سمجھ گئی۔ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”آ جائیں۔ ماما بس آنے ہی والی ہیں۔“

”او کے نیم۔“ اُس نے فون بند کر دیا۔

ڈریس آپ ہوا اور۔ منٹوں میں اُس کے پاس جا پہنچا۔

اُس نے پہلے کی طرح اُسے لوگ روم میں بٹھایا۔ خود بھی پاس ہی بیٹھ

گئی۔ اب اُس کی وہ پہلے والی جھجک جاتی رہی تھی۔

لجاتی سی، آنکھیں چراتی سی وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ پیاری

پیاری اور میٹھی میٹھی!

یاور خان گا ہے گا ہے اُس کے چہرے پر گھر آئے اُس کے خوبصورت

بال ہٹاتا، اُس کی بے حد حسین آنکھوں میں بغور جھانکتا، اُس کے دلکش چہرے کو

ہونٹوں سے چھوتا۔ تو وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جاتی، لعلیں لب کپکپا اٹھتے

اور لائی خمیدہ پلکیں آنکھوں پر سائبان کر لیتیں!

سارے دن کی تحسُن اور نادیر کے ساتھ جھج جھج کے بعد اُسے لگا۔ وہ اُس

گھنے درخت کے نیچے آ بیٹھا تھا۔ جو اپنی ڈالیوں پر مہکتے پھولوں کی قدیلیں جلائے

دور دور تک سایہ کئے تھا!

”ابراہیم پھر تو نہیں آیا تھا؟“ اُس نے اچانک پوچھا۔
”نہیں۔ آنٹی آئی تھیں۔“

”She is a nice lady.“ وہ بولا۔

”ہاں۔ میرا تو بہت خیال رکھتی ہیں۔“

”وہ ہیں ہی بہت اچھی۔ امی کی دوست تو ہیں ہی۔ مجھے بھی بہت محبت دی ہے۔“

”کہتی تھیں ابراہیم کچھ عرصے میں جاب کے سلسلے میں واپس انگلینڈ جانے والا ہے۔ سوچتی ہوں جانے سے پہلے کسی اچھی سی لڑکی سے اُس کا نکاح کروالوں۔“

آنٹی آئی تھیں اور شندی سمجھ گئی تھی اس بار وہ خاص طور سے یہ بات کرنے آئی تھیں۔ کیونکہ سارا وقت باتوں کا موضوع ی تو ابراہیم رہا یا پھر شندی کی تعریفیں کرتی رہیں۔ مزید کہ۔ یہی وقت تھا، شندی کو ایک مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی...

شندی نے اس وقت یادِ خان کو محض چھیڑنے کے لئے یہ بات بتائی۔

”یہ کہہ رہی تھیں وہ؟“ یادِ خان کے کان کھڑے ہوئے۔

”ہاں۔“ اُس نے ہنسی بھری شکل ضبط کی۔

”تو تمہیں کیوں کہہ رہی تھیں؟“

”پتہ نہیں۔ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ یہی وقت ہے کہ مجھے ایک مرد کے

مضبوط سہارے کی ضرورت ہے...“

”اس کا مطلب ہے آنٹی کے منہ میں بھی تمہارے لئے پانی آ رہا

ہے۔“ اُس نے دو لمحے توقف کیا۔ دلنشین آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔

مضبوط سہارا، بہہ۔ ابراہیم۔ چوہا۔“ اُس نے اُن کے مختصر تخیل سراپے پر چوٹ

کی۔

آنکھوں میں اتھارٹی، شخصیت میں کمانڈ۔ پھر بھی جیلس ہو گیا تھا۔
شندی کو ہنسی آ گئی۔

”تم ہنس رہی ہو۔“ وہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

”نہیں۔“ سرٹلی میں ہلاتے ہوئے وہ اور بھی ہنس دی۔

اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگایا۔ غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اُن سے کہہ دو۔ تم میری ہو۔ صرف میری۔“ اُس نے آہستہ سے

اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

پھر۔ اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ سینے سے لگالیا۔

”I love you Shandi.“ اُس کے مہکتے بالوں میں چہرہ دیئے وہ

جذبات سے بھاری آواز میں بولا۔

اور۔ شندی اپنی دھڑکنوں میں دھڑکتی اُس کے دل کی دھڑکنیں، اپنی

سانسوں میں گڈمڈ ہوتی اُس کی مہکتی سانسیں، اپنے چہرے پر محبت کی مہر ثبت

کرتے اُس کے تپتے ہونٹ محسوس کرتی اُس کے بازوؤں میں گھری دنیا و مافیہا

سے بے خبر اُس کے سینے سے لگی رہی۔

اُسے لگا۔ وہ ہی تھا اُس کا سب کچھ۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے تھا؟

اُسے جاننے کی ضرورت نہیں تھی!

”شندی۔“ یادِ خان اس کی بند بند آنکھوں میں جھانکا۔

”جی۔“ جھالریں پلکیں وا کرتے ہوئے وہ ہولے سے بولی۔

”Do you love me too?“

کوئی بھی جواب دیئے بنا شندی نے دھیرے سے اپنے کول ہونٹ اُس

کے گال پر رکھ دیئے۔

بہت انوکھا بہت پیارا جواب تھا۔ وہ مدھوش سا ہو گیا۔ اُسے ڈھیر سارا

”ہاں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس سے وہ اُسے بہت بہت اچھی لگی۔ آہستہ سے اپنے ہونٹ اُس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔
"I'm so lucky for having such a wonderful girl as the love of my life."

"And I am even luckier for having you as my love."

وہ اپنائیت سے مسکرا دیا۔ ایک بار اور اُس کے ہاتھ پر پیار کر لیا۔

تبھی۔ ماما ہاتھوں میں ایک ڈش لئے آ گئیں۔

”شندی بی بی۔ یہ جج صاحب کے گھر سے آیا ہے۔“ انہوں نے ڈش میز پر رکھی۔ اور واپس چل دیں۔

کھیر تھی۔ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔“

اُس کے لب و لہجے پر اُسے ہنسی آ گئی۔

”آئی تو شروع ہی سے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہیں۔“

”خطرے کا سگنل ہے۔ And now its high time to

tell my mother every thing about you."

شندی کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔

”کیوں کیا خیال ہے؟“ یاور خان نے اُس کی جھکی جھکی پلکوں کو دیکھتا

محفوظ ہوتا پھر بولا۔

”آپ... یہ لیں۔“ اُس کی شوخ نظروں سے بچنے کے لئے اُس نے

اُسے کھیر آفر کی۔

”سوری۔ میں رقیبوں کے گھر کی چیز نہیں کھاؤں گا۔“

جبکہ وہ اپنے فزیک کا خیال اتار رکھتا تھا کہ میٹھی چیز کو شاذ ہی ہاتھ

پیار کر لیا۔

تبھی۔ باہر ماما کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔

یاور خان کی سیاہ گھنٹی بھونکی اور پراٹھ گئیں۔ مسکرا دیا۔

”آگئیں تمہاری بوڈی گارڈ۔“

دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

چند ثانیے کے لئے یاور خان کا دھیان آئی نور جہاں کی باتوں کی طرف

گیا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا اُن کے ذہن میں شندی کے لئے۔ اُسے بھی اب بات کو

زیادہ طول نہیں دینا چاہئے تھا۔ لیکن۔ امی۔ باپ رے!

”آپ کہاں کھو گئے؟“

وہ خیالوں سے ابھرا۔ اُس کی طرف دیکھا۔

”کہیں نہیں۔ یہیں ہوں۔ تمہارے پاس۔“ وہ خوشگواہی سے بولا۔

وہ مسکرا دی۔ وہ واقعی اُس کے پاس رہتا تھا۔ دن رات، پل پل!

ڈنر پر چکن و تخمیشیل سوپ تھا، ایک فرائیڈ رائس، ڈرم سٹیکس اور فروٹ

ٹرائفل تھا۔

دونوں مزیدار کھانا کھانے لگے۔

”ماما نے یہ کھانے بنانا کہاں سے سیکھا ہے؟“ اُسے واقعی حیرت ہو رہی

تھی۔

”ہماری حویلی کے خانا ماں سے۔ پاپا کو بھی بہت شوق تھا چائیز

کھانوں کا۔“

”اوہ۔ میں حمید سے کہوں گا وہ بھی آکر ماما سے سیکھے...“

”مجھے نہیں کہیں گے سیکھنے کو؟“ پتہ نہیں کیوں اُس کے لہجے میں شکایت

سی عود کر آئی۔

”اوہ۔ تم سیکھو گی؟ میرے لئے؟“

چند سال قبل یادور خان کے والد ڈاکٹر علی خان کا انتقال ہوا۔ تو ایسہ بیگم اپنی دونوں بیٹیوں نایاب اور شاداب سمیت کینیڈا سے کراچی چلی آئیں۔ وطن واپس آنے کا مقصد یہیں سیٹل ہونے کے علاوہ بیٹیوں کی شادیاں بھی مناسب جگہوں میں کروانے کا تھا۔ یادور خان بہنوں سے بڑا تھا۔ And was A Diplomat American Board in Surgery امیریکہ میں ہی جاب کر رہا تھا۔ مگر ماں بہنوں کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے وہ بھی جلدی ہی وائینڈ آپ کر کے کراچی چلا آیا۔

بیٹیوں کو توقع کے مطابق اچھے بڑل گئے۔ جلدی ہی اپنے گھروں کی اور پھر بچوں والی بھی ہو گئیں۔ یادور خان نے کچھ عرصہ کراچی میں جاب کی۔ پھر

لگاتا تھا۔

شندی کو اور بھی ہنسی آ گئی۔

”بائے داوے۔ تم کیوں اتنی خوش ہو رہی ہو۔“

”مجھے تو آپ کی باتوں پر ہنسی آرہی ہے۔“

”کیوں؟“

”بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ اُس نے اچانک اُسے غور سے دیکھا۔

اور۔۔ وہ اپنی ساری تیزی بھول گئی۔ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ محظوظ ہوئے بنانہ رہ سکا۔

”اچھا میم صاحب۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم کھیر کھاؤ اور میں گھر چلا

ہوں، ہاں۔“ اُس نے اپنائیت سے اُس کا چہرے تھپتھپایا اور۔

کوریدور کی طرف بڑھا۔

چند لمبے وہ اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بول میں کھیر نکالی اور۔

اُسی کے متعلق سوچتی آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

※—※

یہاں اس پرائیویٹ ہسپتال میں اچھی آفر ہوئی تو یہاں چلا آیا۔

آج ہی صبح دس بجے کی فلائیٹ سے وہ کراچی پہنچا۔ ایئرپورٹ سے باہر آیا۔ تو ڈرائیور کے ساتھ ساتھ امی بھی اُسے لینے آئیں موجود تھیں۔ اُسے دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔

اس بار وہ پورے چار ماہ بعد آیا تھا۔ یہاں موسم گرم تھا۔ ایئر کنڈیشنرز چلنے لگے تھے۔

نہادھو کر فریش ہوا۔ تو امی اور وہ دونوں وسیع و عریض خوبصورت لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔

دنیا جہان کی گپ شپ ہونے لگی۔ نایاب اور شاداب کی، اُن کے بچوں کی، یاور خان کے چچا اور دونوں پھوپھیوں کی، پاس پڑوس کی اور۔۔۔ امی کی اُس دوست اور اُن کی بیٹی کی جس سے امی اُس کا رشتہ کروانا چاہتی تھیں۔

”بہت پیاری لڑکی ہے۔ تم دیکھو گے تو ضرور پسند آئے گی۔“

اور۔۔۔ یاور خان سوچ میں پڑ گیا۔

امی کو شندی کے بارے میں بتادے؟

No۔۔۔ وہ گھبرا گیا۔ امی نے ڈانٹ تو پلائی ہی تھی۔ پھر آتے ہی کیوں؟

رات کو تسلی سے ڈانٹ کھا لگا۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“ امی نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”کچھ نہیں۔ امی نایاب اور شاداب کس وقت آئیں گی؟ انہیں پتہ تو

ہے تا میرے آنے کا۔“ وہ خوبصورتی سے بات ٹال گیا۔

”کیوں نہیں۔ میں نے رات ہی فون پر بتا دیا تھا۔ شام تک آ جائیں گی دونوں۔“

”پھر تو مزا آ جائیگا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

دوپہر لُغ پر امی نے اُس کی پسند کے کھانے بنوائے تھے۔ مٹن پلاؤ،

کوفتے، بھنڈی گوشت، شامی کباب اور کھیر۔ اُسے پاکستانی کھانے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ جب بھی امریکہ سے چھٹیوں میں امی کے پاس کینیڈا آتا تھا۔ تو خاص طور سے امی سے فرمائش کرتا تھا ان کھانوں کی۔

دونوں بعد امی کے ہاتھ کا کھانا کھایا تھا۔ بہت اچھا لگا۔

دوپہر آرام کرنے کے لئے جو سویا۔ تو شاداب نے ہی آکر جگایا۔ نایاب اور شاداب کے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ واقعی مزا آ گیا۔ عرصہ بعد بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔ خوب خوب گپ شپ ہوئی۔

رات ڈنر کے بعد بھی لاؤنج میں بیٹھے سبز چائے پیتے سب باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے امی اٹھتے ہوئے نماز پڑھنے اور پھر آرام کرنے چلدیں۔ اور نایاب، شاداب اپنے اپنے بچوں کو سلانے۔

بچوں کو سلا چکیں تو دونوں بہنیں بھائی کے بیڈروم میں آدھکیں۔ ایک بار پھر گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور۔۔۔

بہنیں یاور خان نے شندی کے بارے میں کچھ نایاب اور شاداب کے گوش گزار کر دیا۔ کہ۔۔۔

کس طرح ایک دن یاور خان کو اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ فلاں فلاں علاقے کے جاگیردار عالمگیر حیدر اسلمی کی صفائی کرتے ہوئے گولی چل جانے سے انتقال کر گئے تھے۔ یاور خان اور اُس کی بہنوں کی شروع سے ہی بہت خواہش تھی۔ کہ پاکستان جا کر اپنے رشتہ داروں سے ملیں۔ رشتوں کی مٹھاس کیا ہوتی ہے؟ وہ دیکھنا چاہتے تھے مگر۔۔۔

امی اور یاور خان نے جب بابا کے سائیڈ کے رشتہ داروں، چچا اور پھوپھیوں سے میل جول کی کوشش کی۔ تو وہ رسپانس نہیں ملا۔ جو ملنا چاہئے تھا۔ ایک طرفہ کوشش زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اپنی سبکی معلوم ہوئی تو یاور خان اور امی بھی خاموش ہو گئے۔

پھر خالو کے انتقال کا علم ہوا۔ تو اُس نے سوچا۔ اب کے نکھیاں میں جائے۔ اُن کا رویہ کیسا تھا؟ وہ جاننا چاہتا تھا۔ گو اُسے معلوم تھا امی نے اپنے میکے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ بقول امی اُن کے والد نے دوسری شادی کر کے اُن کے ساتھ نا انصافی کی تھی۔ خالہ نفیسہ اُن کی سوتیلی بہن تھیں۔ امی کا کہنا تھا خالہ نے بہتیرا اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر۔۔۔ نانا نے جو اُن کی حق تلفی کی تھی۔ وہ بھول نہ پائی تھیں۔ اور اسی وجہ سے اُنہوں نے کبھی بھی نہ نفیسہ خالہ کو کوئی رسپانس دیا۔ نا ہی اپنے سوتیلے بھائی سے کوئی رابطہ رکھا۔

پر۔۔۔ اب چونکہ یہ موت کی بات تھی۔ اس پر یقیناً امی برا نہ مانتیں۔ خالہ نفیسہ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ سو۔۔۔ اتنے بڑے سانحے کا پتہ چلا تو اُس نے سوچا یہی موقع تھا جا کر اپنی خالہ زاد سے تعزیت کر آئے۔ خالو کے بھائی جہانگیر حیدر کو بھی مل لے۔

مگر۔۔۔ وہ حویلی پہنچا، جہانگیر حیدر کا پوچھا۔ تو حویلی کے اندر سے نواز آ گیا۔۔۔

یاور خان نے بہنوں کو شروع سے لے کر آج تک کے تمام واقعات بتا دیئے۔

شندی کے حالات سن کر نایاب کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔
”اوہ۔ کیا چچا اور کیا ماموں ہیں۔ دونوں ہی پجاری کے دولت کے چکر میں تھے۔“ وہ اگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”تو۔ آپ کو شندی پسند آ گئی ہے۔“ شاداب مسکراتے ہوئے بولی۔
”ہاں۔ بہت۔“ یاور خان نے کہا۔

”لیکن۔۔۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے فون پر کسی ڈاکٹر نادیا کا بھی ذکر کیا تھا۔“ شاداب اُسے چھیڑتے ہوئے بولی۔
وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

”تم نے خود پوچھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر واکٹر کا چکر تو نہیں چل رہا۔ سو میں نے بتا دیا۔ میں نے اُس سے شادی کا بالکل نہیں کہا تھا۔“

”تو۔۔۔ شندی سے شادی کریں گے۔“ وہ پھر معنی خیز انداز میں بولی۔
”ہاں۔“

”کیوں؟“
”کیونکہ اُس میں ہر وہ بات ہے جو ایک اچھی بیوی میں ہونی چاہئے۔“
”مثلاً؟“

”مثلاً فرمانبرداری۔۔۔ گھرداری۔۔۔“ وہ بھی اُسے تنگ کرنے کو بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

”نوٹ کرتی جائیں باجی۔“ وہ بھی کم شریہ نہ تھی۔
اور نایاب اور یاور خان بے اختیار ہنس دیئے۔

”اچھا تم یاور بھائی کو تنگ کرنا بند کرو۔ اور کام کی بات کرو۔“ نایاب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”لیکن امی کے گلے میں کھنٹی کون باندھے گا؟“

”بڑی بد تمیز ہو۔ امی کو پتہ چلا نا۔۔۔“
”میں تو اُس خوبصورت سی کیوٹی سی سفید سفید لمبے لمبے بالوں والی ملی

کی بات کر رہی ہوں۔۔۔“
”تینوں پھر ہنس دیئے۔

”ویسے۔ آپ بات کر سکتی ہیں امی سے؟ خالہ نفیسہ کی بیٹی۔۔۔ وہ بھی امی کے لاڈ لے اکلوتے بیٹے کے لئے۔۔۔“

”ویسے۔ اب تو زمانے گزر گئے ہیں۔ نہ چھوٹی تانی زندہ ہیں نہ خالہ نفیسہ۔ نا ہی خالو عالمگیر باقی رہے ہیں۔ لے دے کر نکھیاں میں ایک شندی رہ گئی

ہے۔ دو خیال تو دیکھ ہی لیا۔۔۔“ نایاب کہہ رہی تھی۔
 ”نخیال میں صرف شندی نہیں۔ ایک ماموں بھی ہیں ہمارے۔ جو
 شندی کو زہر دے رہے تھے۔“ شاداب نے یاد دلایا۔
 ”باپ رہے۔ لیکن... شندی بچاری تو خود مظلوم ہے۔“ نایاب بولی۔
 ”بہت بے ضرر ہے۔“ یاور خان کے منہ سے نکلا۔
 ”بہت انوسٹ ہے۔“ شاداب نے یاور خان کی جڑوں میں کئی چند
 لمحے پہلے کی بات دہرائی۔

اور۔ شاداب کے ساتھ نایاب کو بھی موقع مل گیا۔
 ”بہت چارمنگ ہے۔“ اُس نے بھی یہ پوائنٹ نوٹ کیا تھا۔
 ”بہت چھوٹی ہے۔ ابھی ابھی اے لیولز کیا ہے۔“ شاداب نے کمر
 ”شٹ آپ۔“ یاور خان نے دونوں کو چپ کرایا۔
 ”ہم آپ کی سفارش نہیں کریں گے۔“ شاداب ناراض ہو گئی۔
 بس اب سیریس ہو جاؤ سب۔ سوچو کہ امی سے بات کیسے کریں گے۔
 انہیں راضی کیسے کریں گے؟ نایاب نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ یاور خان خوش ہو گیا۔ ”ویسے۔۔۔ میرا خیال ہے
 جب میں واپس چلا جاؤں۔ تو تم لوگ امی سے بات کرو۔ ورنہ خواہ مخواہ میرا
 Stay خراب ہوگا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب چلتے ہیں سوتے ہیں ہجاکر۔ یاور بھائی واپس
 چلے جائیں گے تو پھر امی سے بات کریں گے۔“ نایاب بولی۔
 اور۔۔۔ دونوں بہنیں یاور خان کو ”شب خیر“ کہتیں اپنے اپنے کمروں کی
 طرف ہو لیں۔



اُس کی فلائیٹ لیٹ تھی رات دیر سے گھر پہنچا تھا۔
 ڈنر کے بعد سونے کے لئے بستر میں لیٹا تھا۔ تو دل بہت چاہا تھا شندی
 سے بات کرے۔ اُس سے پوچھے اُس سے تین دن بات کئے بغیر اُس کا وقت
 کیسے گزرا تھا؟ کتنا یاد کیا تھا اُسے؟
 مگر۔۔۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اُس کی نیند ڈسٹرب ہو جانی تھی۔ یہی
 سوچ کر اُس نے ارادہ بدل لیا تھا۔
 آج ہفتہ تھا۔ اُس کا O.P.D تھا۔ مریض پر مریض چلے آ رہے تھے۔
 موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اُس سے بات کرنے کا۔
 ایک بجے بریک ہوتے ہی وہ گھر کے لئے چل پڑا۔

بہت خوش تھا وہ۔ ایوننگ سیشن بھی نہیں تھا۔ کل چھٹی بھی تھی اور — شندی سے باتیں بھی تو کرتی تھیں۔

پھر — اُس نے سوچا۔ گھر پہنچنے کا ہی انتظار کیوں؟ اپنا سیل فون اٹھایا اور شندی کا نمبر ملا لیا۔

بہت ساری نیوز ملیں اسے۔ ان دنوں اُسے بہت تیز بخار ہوا تھا۔ ماما نے آئی فور جہاں کو بلوایا تھا۔ وہ اپنی سی کوششیں کرتی رہیں۔ دوا ایک ڈاکٹر زکو جو وہ جانتی تھیں۔ اُن میں سے ایک بھی دستیاب نہیں تھا۔ پھر اُنہیں ڈاکٹر نادیر کا خیال آیا۔ یاور خان نے اُنہیں ایک دفعہ ہسپتال میں اُس سے ملوایا تھا۔ فون کر کے انہوں نے گاڑی بھجوا کر اُسے بلا لیا۔ نادیر نے اُس کا چیک اپ کیا، دوائیاں لکھ کر دیں۔ جن کے استعمال سے اب وہ کافی سنبھل گئی تھی۔ اور — وہ ڈاکٹر نادیر کی بہت ممنون تھی وغیرہ...

شندی سے باتیں کر کے اُسے جیسے دنیا بھر کے خزانے مل گئے تھے۔ کتنا چاہتا تھا وہ اُسے!

اُس نے گاڑی ہستی کی طرف موڑی۔ تو خیال آیا۔

نادیر نے اُس دن کے بعد سے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُسے حیرت سی ہونے لگی۔ دونوں میں اس قدر تلخ کلامی کے بعد بھی وہ کیسے شندی کو دیکھنے آگئی تھی؟

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے شاید...

No way. اُس نے فوراً اپنے خیال کی نفی کی۔ وہ ایسا کوئی فرض، کوئی اصول نہیں جانتی تھی۔ شاید کیوریاسٹی لیکر آئی تھی۔ کہ وہ کون تھی؟ کیسے رہ رہی تھی؟ وغیرہ۔ اُس کی عادت تھی یہاں وہاں کی خبریں اکٹھا کرنے کی۔

موسم قدرے ٹھنڈا ہوا تھا۔ ہریالیوں میں سے جھانکتے خود رو پھل پھول نظروں کو بھلے لگ رہے تھے، بھیڑ بکریوں کے منے منے بچے یہاں وہاں پڑ رہے

تھے۔ ہاں ٹھنڈا اب بھی تھی، بادل اب بھی یہاں وہاں ڈیرہ جمائے تھے! پھولوں، جھرنوں اور ہلکورے لیتی ہواؤں کی خوشبوئیں من میں سموتا وہ اپنے گیٹ کے پاس رک گیا۔

آج گیٹ حمید نے کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے گیا۔

لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ میوہ خان پاس آ گیا۔

”صاحب۔ بڑی نیگم صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ پیچھے گیٹ روم میں بیٹھی ہیں۔ آپ کو یاد کیا ہے۔“ پھر وہ اُس کے قدرے قریب ہوا۔ ”بہت غصے میں ہیں صاحب۔“ وہ آواز نیچی کر کے بولا۔

باپ پرے۔ نایاب اور شاداب نے یقیناً بات پہنچادی تھی مگر۔

اتنی جلدی؟ رات کو وہ پہنچا تھا اور صبح امی پہنچ گئیں!

”جل ٹو جلال ٹو“ پڑھتا وہ گیٹ روم میں آ گیا۔

”اُسے حویلی سے نکالتے نکالتے کوئی تمہیں گولی مار دیتا تو؟ ویسے تم یہاں مگے ہی کیوں تھے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اُس کی ثانی تمہاری ماں کی سوتیلی ماں تھی؟ اور اُس کی ماں تمہاری ماں کی سوتیلی بہن تھی؟ سوتیلے بھی کبھی اپنے ہوئے ہیں؟ اور پھر تمہارا خیال ہے کہ میں نفیسہ کی بیٹی سے تمہاری شادی کرادوں گی؟ یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ میں تو حیران ہوں تم نے اُسے اُس کے گھر سے لا کر یہاں کیوں ڈال دیا ہے؟ مجھے نور جہاں پر حیرت ہے۔ ہم دونوں بچپن کی دوست ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ میرا نفیسہ سے کیسا رشتہ ہے؟ اُس کی بیٹی کو اپنے یہاں پناہ دی ہی کیسے؟...“

ایسہ نیگم دیر تک دل کی بھڑاس نکالتی رہیں۔ یاور خان خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر — اُس نے گہری سانس لی۔

”امی۔“ وہ وہیں کھڑے کھڑے اُن کی کرسی پر جھک آیا۔ ”اوپر بیڈ

روم میں چلیں۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اور یقیناً کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔“
اُسے پتہ تھا۔ امی کے دو Extremes تھے۔ پیار کرنے پر آتی
تھیں تو شفقت کے خزانے لٹا دیتی تھیں۔ اور غصہ آ جاتا تھا تو کھانا پینا بھی بھول
جاتی تھیں۔

”جب سے نایاب نے بات بتائی ہے میں اپنے آپ کو بھی بھول گئی
ہوں۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”پلیز امی! اوپر چلیں۔ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوں۔“ اُس نے انہیں
ہاتھ سے تھاما۔

اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کمرے سے نکلتے ہوئے
یڑھیوں کی طرف بڑھنے لگیں۔

یاور خان بھی پیچھے پیچھے چلا۔ وہ تو اُس کی توقع سے کہیں زیادہ ناراض
تھیں۔ کیا بنے گا؟

وہ واش روم میں گئیں۔ تو یاور خان نیچے کچن میں آ گیا۔ لُنج تیار ہونے
میں ابھی وقت تھا۔ امی کے لئے حمید نے کھانے میں مزید کچھ چیزیں شامل کر لی
تھیں۔ جس کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی۔ اُس نے حمید سے چائے اور سینڈویچز
لانے کو کہا۔ اور واپس اوپر آ گیا۔ اپنے واش روم میں گیا۔ ہاتھ منہ دھوئے،
کپڑے تبدیل کئے اور دوبارہ امی کے کمرے میں آ گیا۔

چائے آگئی تو یاور خان امی کو سرو کرنے لگا۔

”دیکھو بیٹا۔“ امی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ سوتیلے
کبھی اپنے نہیں ہوتے۔ تم باہر پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے۔ میں جانتی ہوں
تمہاری خواہش ہوگی کہ اپنوں سے ملو جلو۔ اپنے گاؤں، ددھیال، ننھیال گھومو
پھر و مگر... یہ سب دور سے اچھے لگتے ہیں۔ پاس جاؤ تو سوائے مایوسی کے کچھ
ہاتھ نہیں آتا۔ تم نے دیکھ لیا اپنے چچا، پھوپھیوں اور اُن کی اولاد کا رویہ۔ کتنی بار

ہم گئے۔ مگر سوائے نایاب کی شادی میں شرکت کے انہیں شاداب کی شادی تک
میں آنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پھر نایاب بتا رہی تھی کہ شائدانہ کو اپنا ماموں
Slow poison کر رہا تھا۔ اپنا چچا دولت تھیانے کے چکر میں مار پیٹ کر
اپنے پہلے سے شادی شدہ بیٹے سے بیاہنے کی فکر میں تھا۔ تو جب سگوں کا یہ حال
ہے تو سوتیلوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ یہ تو بھلا ہو میری نانی کا کہ وہ مجھے فوراً
اپنے پاس لے آئیں ورنہ جانے کیا شکر کرتے سوتیلے میرا...“

امی کی ذہن پر سکے اور سوتیلے کا اس قدر خوف سوار تھا۔ کہ بھول ہی گئی
تھیں کہ سونئیں تو کب کی خاک میں مل چکی تھیں۔ اُن کی بہن بھی اب اس دنیا میں
نہیں رہی تھی۔ اور پھر۔

شندی کے ساتھ سگوں نے کیا کیا تھا؟

یہ رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کچھ بھی وثوق سے نہیں کیا جاسکتا ان کے
بارے میں!

اچھے رشتے شاید وہی ہوتے ہیں جو خلوص اور محبت سے جنم لیں اور بس۔ پھر
چاہے وہ اپنوں میں ہوں چاہے غیروں میں۔ سگوں میں ہوں چاہے سوتیلوں میں!
امی ویر تک اُسے سمجھاتی رہیں۔ دنیا کی اونچ نیچ۔ خاص طور سے سوتیلے
رشتوں سے باز رہنے پر زور دیتی رہیں۔

وہ سنتا گیا۔ چپ چاپ۔ کہ اُن سے خود شندی کی سفارش کرنا جلتی پر
تیل کا کام کرنا تھا۔

وہ سب کہہ چکیں۔ تو اُس نے گہری سانس لی۔ اپنا خالی کپ میز پر
رکھا۔

”امی کل پکنک پر جائیں گے۔ بہت خوبصورت spots ہیں یہاں۔
کراچی سے تو لوگ پہاڑ پر آنے کو ترستے ہیں۔“

اتنی سیر لیں باتوں کے جواب میں یاور خان کی بات پر نہ چاہتے ہوئے

بھی ایسہ بیگم مسکرا دیں۔ اُس پر بہت سارا پیار آ گیا۔ اُس کا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اُسے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”میری جان۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہی ہوں۔“ وہ شفقت سے بولیں۔

”مجھے پتہ ہے امی۔“

”اُس کی سوچوں میں پڑ کر خود کو ہلکان مت کرو۔ نکال دو اُس کا خیال ذہن سے۔“ وہ مزید بولیں۔

یاور خان دہل سا گیا۔ کیسے اُس کا خیال ذہن سے نکال دے؟ وہ تو اتنا آگے نکل چکا تھا اُس کے پیار میں۔ کہ پیچھے ہٹنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔

”امی۔ آئی نور جہاں آپ کا بہت پوچھتی رہتی ہیں۔“ اُس نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

”ارے ہاں۔ رات ڈنر پر بلایا ہے نور جہاں نے مجھے اور تمہیں۔“ انہیں اچانک یاد آیا۔

”اچھا۔“ موضوع بدلا تو وہ ریلیکس محسوس کرنے لگا۔ ”انہیں کیسے پتہ چلا کہ آپ آئی ہیں۔“

”میں نے کراچی سے فون کیا تھا اُسے۔“

اوہ۔ تو اُس کے ساتھ ساتھ امی سب کی خبر لینے آئی تھیں!

رات ڈنر کے بعد ایسہ بیگم نے نور جہاں کو سب بتا دیا۔ کہ یاور خان کراچی کس مقصد سے آیا تھا۔ اُن کو تو یاور خان نے سب سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شائدانہ کون تھی اور کس طرح وہ اُسے اُن لوگوں سے بچا کر یہاں لایا تھا۔ ہاں یہ ذکر کبھی نہیں کیا تھا۔ کہ خود بھی اُس میں دلچسپی لیتا تھا۔ کبھی تو وہ ابراہیم کی بات شادی کے کان میں ڈالنے خاص طور سے اُس کے پاس گئی تھیں۔ بہر حال۔

”ایسہ۔“ نور جہاں بانو بولیں۔ ”تمہارا یہ کہنا کہ یاور وہاں گیا ہی کیوں؟ تو چلو لڑکا ہے۔ مدتوں بعد اپنے وطن لوٹا تھا۔ رشتوں کی پیاس اُسے وہاں لے گئی۔ اور پھر موت پر تو میں کہتی ہوں تمہیں بھی وہاں جانا چاہئے تھا۔ ہر تلخی بھلا کر۔ رہی یہ بات کہ شائدانہ کے جھگڑے میں کیوں ہاتھ ڈالا؟ تو میرا خیال ہے یاور نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے۔ ایک بے بس اور لاچار لڑکی کو موت کے منہ سے بچا لایا ہے۔ یاور کو معلوم تھا کہ اُسے زہر دیا جا رہا ہے تو وہ اُسے مرنے دیتا کہ وہ اُس کی اپنی خالہ زاد نہیں تھی۔ سوتیلی تھی۔ کمال کرتی ہو تم بھی ایسہ۔ میں تمہیں شروع میں ہی کافی سمجھا چکی ہوں کہ اگر تمہارے والد نے دوسری شادی کی تھی تو اُس وقت تمہاری والدہ تو حیات نہیں تھیں۔ بقول تمہارے انہوں نے شادی تمہارے لئے نہیں اپنی خوشی کے لئے کی تھی۔ تو بھی پہلے نہ سہی اب تو تمہیں اتنی عقل ہے کہ سوچ سکو کہ اُس وقت اُن کی عمر صرف بتیس، تینتیس سال تھی۔ تو اگر انہوں نے دوسری شادی کر لی تو کون سا جرم کر لیا۔ تمہاری والدہ کی زندگی میں ایسا کرتے تب الگ بات تھی۔ تب ضرور دکھ ہوتا۔ تم پتہ نہیں کیوں اُسی بات کو لئے بیٹھی ہو۔ والد تک سے تعلق توڑ دیا تھا۔ اب بس کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ خود کو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا رکھتی ہو۔۔۔“

”لیکن اب یہ بھی تو نہیں کر سکتی تاکہ بیٹے کی شادی نفیسہ کی بیٹی سے کر دوں۔“

”اگر یاور کی خواہش ہے تو میرا خیال ہے اتنی بُری بات بھی نہیں ہے۔ آخر تو دونوں کی رگوں میں ایک ہی نانا کا خون دوڑ رہا ہے۔۔۔“ انہوں نے اب بھی یاور خان کی حمایت کی۔ اپنی خواہش دل میں ہی دبا دی کہ پہلا حق یاور خان کا ہی بنتا تھا۔

ایسہ بیگم جز بڑی بیٹھی تھیں۔

”اور پھر تم اُس لڑکی کو دیکھو پرکھو۔ تو حیران رہ جاؤ کہ آج کے زمانے

میں پوری جاگیر، بے شمار املاک کی اکیلی مالک لڑکی میں اتنی خاکساری ہے، اتنی شرم و حیا ہے، نماز روزے کی پابندی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ اس کے status کی لڑکیاں تو رانڈنگ کرتی ہیں، سوئمنگ کرتی ہیں، بوائے فرینڈز رکھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔ میری مانو تو ضد چھوڑ دو۔ اپنا لو اسے۔ بے سہارا ہے۔ تمہارا خون ہے۔۔۔“

مگر۔۔۔ ایسہ بیگم نے بات ہی بدل دی۔ دوسری باتیں کرنے لگیں۔ عرصہ بعد دونوں دوست ملی تھیں۔ بہتری اور باتیں تھیں کرنے کو۔ رات گئے تک کپ شپ کرتی رہیں۔ پھر ماں بیٹے نے اجازت لی اور گھر چلے آئے۔ ”ایسہ بیگم رات کے کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گئیں۔ یاور خان ضروری کاموں سے فارغ ہوا تو ایسہ بیگم کے کمرے میں جھانکا۔ جاگ رہی تھیں وہ اب بھی۔ یاور خان پاس آ کر اُن کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں دبانے لگا۔“

”تھکی ہوئی ہوں پر نیند نہیں آرہی۔“ ایسہ بیگم بولیں۔

”آپ ٹینشن مت لیا کریں نا اُمی۔ ریلیکس ہوں پلیز!“

”خاک ریلیکس ہوں۔“ وہ اچانک تیزی سے بولیں۔ ”اور نور جہاں کو دیکھو۔ کتنی آسانی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس پر آتی تو میں دیکھتی کہ کیا کرتی ہے۔ دوسروں کو سمجھانا بڑا آسان ہوتا ہے۔“ وہ سخت ناراض لگ رہی تھیں۔

یاور خان مجرم سا بنا اُن کے پاؤں دباتا رہا۔

”اچھا ہے آپ آگئی ہیں۔ کل سنڈے ہے۔ پرسوں آپ کا کمپلیٹ

چیک اپ کروالوں گا۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

”میں واپس جا رہی ہوں کل۔“ وہ ہنوز ناراض تھیں۔

”بالکل نہیں۔ آپ ہفتہ دس دن کم از کم میرے پاس رہیں گی۔“

”اور تم نے اس لڑکی کو لا کر اپنے پہلو سے کیوں لگا رکھا ہے؟ وہ تو نور جہاں سے دور تمہارے احاطے میں گھسی ہوئی ہے۔“ وہ اُس کی اُن سنی کرتے ہوئے بولیں۔

نادیہ نے بھی ایک بار یہی کہا تھا۔ اُسے ہنسی آگئی۔

”امی! تنگی اسی طرح بنی ہوئی ہے۔“ اُس نے قدرے ہمت کی۔

”چپ کرو۔“ اُنہوں نے دیکھا۔ یاور خان نے اس تمام دوران ایک بار بھی شندی کو چھوڑ دینے کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ ڈٹا ہوا تھا جیسے اپنی بات پر، چپ چاپ۔ اُنہیں اور بھی غصہ آ گیا۔

پھر۔۔۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے گھونٹ بھرا۔

”وہ... تم نے بہنوں سے کسی لیڈی ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا تھا شاید۔“ اُن کا اشارہ ڈاکٹر نادیہ کی طرف تھا۔ شندی سے تو وہ اچھی تھی!

”میں نے ذکر کیا تھا۔ لیکن شادی کے خیال سے نہیں۔ اُس کے اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر میں کسی ڈاکٹر سے شادی کروں گا بھی نہیں۔ میاں بیوی دونوں صبح سے رات تک گھر سے باہر ہوں۔ تو گھر سرائے بن کر رہ جاتا ہے۔ آیاؤں کی گود میں پل کر بچے سائیکو کیس بن جاتے ہیں۔ میں کسی گھریلو لڑکی سے شادی کروں گا۔ جو گھر اور بچوں کا خیال رکھ سکے۔۔۔“

”اسی لئے تو فارخہ کی بیٹی کا سوچا ہے میں نے۔“ اُنہوں نے اپنی دوست کا نام لیا۔ ”اور میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ نفیہ کی بیٹی کا خیال چھوڑ دو۔ ایسا کچھ نہیں ہونیوالا۔“

اور اُسے یاور خان دم بخود رہ گیا۔ کیسے اُس کا خیال چھوڑ دے؟

چند پل دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ ایسہ بیگم نے خالی گلاس واپس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

گی وغیرہ۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ امی کو وہ لوگ بتا بھی چکی ہیں اور امی اُس کی اچھی خبر لینے خود بہ نفس نفیس یہاں پہنچ بھی چکی ہیں۔ رات تھی۔ وہ اُسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور پھر۔ اُسے زیادہ بتانا بھی کیا؟ اُس کے پاس کوئی اچھی خبر تو تھی نہیں۔ اُس کی آواز سن لی۔ یہی بہت تھا۔

”اچھا اب سو جاؤ۔ Love you۔ گڈ نائٹ۔“

”Love you too گڈ نائٹ۔“

وہ مسکرا دی۔ پہلے نیند سے جگایا۔ اب کہہ رہا تھا۔ سو جاؤ۔ نیند کی جگہ تو اُس نے لے لی تھی۔ اُس کو آنکھوں میں سموتے ہوئے اُس نے ہولے سے پلکیں بند کر لیں۔ دیر تک اُسی کو سو جتی رہی۔



”آپ نے اپنی دوایاں لی ہیں؟“ وہ اٹھتے ہوئے اُن کے سر ہانے آگیا۔ وہیں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اُن کی بلڈ پریشر کی دوایاں رکھی تھیں۔

”ہاں لے لی ہیں۔“ اُن کے لہجے میں اب بھی تناؤ تھا۔ ”اب تم سو جاؤ جا کر۔“

”خاک سو جاؤں جا کر۔“ اُس نے بالکل اُن ہی کے کچھ دیر پہلے کے انداز میں کہا۔ ”آپ خفا ہیں تو مجھے نیند آ جائے گی۔“

وہ پہلی بار بلیچ گئیں۔ اُسے اپنی نقل اتارتے دیکھ کر اُنہیں ہنسی آ گئی۔ آخر تو ماں تھیں!

”جامیر اچھے سو جا اب۔“ اُنہوں نے شفقت سے کہا۔ ”ماں بھی کبھی بچوں سے خفا ہو سکتی ہے۔“

اور۔ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے اُنہیں ’شب بخیر‘ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگیا۔

بستر میں لیٹا تو جسم کے ساتھ ذہن بھی بہت تھکا تھکا محسوس ہوا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے گھڑی پر نگاہ کی۔ بارہ بج چکے تھے۔ خاصی دیر تھی۔ پھر بھی اُس کا ہاتھ فون پر گیا۔

”یا اور بول رہا ہوں۔“ اُس نے شندی سے کہا۔

”جی۔ کیسے ہیں آپ؟“ اُس کی آواز میں نیند کا خمار تھا۔

”جگا دیا تا میں نے۔ سوری شندی۔ لیکن میں بہت Exhausted

فیل کر رہا تھا۔ فزیکلی بھی، مینٹلی بھی، سوچا تم سے بات کر لوں گا۔ تو ریلیکس ہو جاؤں گا۔“

وہ مسکرا دی۔ خاموشی سے۔

پھر دونوں باتیں کرنے لگے۔ یاور خان نے اُسے بتایا کہ کس طرح کراچی جا کر اُس نے اپنی بہنوں سے بات کی۔ اور اب وہ امی سے بات کریں

شادی کے اگلے ہی دن اپنے گھر لے آئیں۔ کہ بقول اُن کے وہ سوتیلی ماں کا سایہ بھی اُن پر پڑنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اُن کی تانی کے مطابق اُن کے ابا جان نے دوسری شادی اُن کی دیکھ بھال کے لئے نہیں بلکہ اپنی عیاشی کے لئے کی تھی۔

”سوتیلی ماں چڑیل ہوتی ہے۔ وہ تمہارے باپ کو بھی اپنے قبضے میں کر لے گی۔ اور تمہیں بھی نوکرانی بنا کر مارا پیٹا کرے گی۔“ نانو اُن سے کہا کرتی تھیں۔

انہوں نے ایسہ بیگم کو ارد گرد کی کئی مثالیں بھی دی تھیں۔ کہ کیسے فلاں کو سوتیلی ماں کنوئیں میں الٹا لٹکایا کرتی تھی۔ کیسے فلاں کی زبان پر سوتیلی ماں نے جلتے کوئلے رکھ دیئے تھے وغیرہ...

یہ سن کر وہ دہل جاتی تھیں۔ تب سے ہی اُن کو اپنے ابا جان ایک جلاو لگتے تھے اور سوتیلی ماں ایک خوفناک چڑیل۔

سال بھر بعد ہی نفیسہ بیگم پیدا ہوئیں۔ تو انہیں لگا اُن کی بدترین دشمن آگئی تھیں دنیا میں۔ جنہوں نے اُن سے اُن کا باپ اور گھر یا سب چھین لیا تھا۔ یہ بانئیں اُن کے ناچختہ ذہن میں کچھ اس طرح گھر کر گئی تھیں۔ کہ ابا جان کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ یہ زہرا اُن کے دل سے نکال نہیں پائے تھے۔

نفیسہ بیگم نے ہوش سنبھالا تو بڑی بہن سے جا کر ملنے کی خواہش بیدار ہوئی جسے ایسہ بیگم نے سختی سے رد کر دیا۔ ایسہ بیگم جوان ہوئیں، ڈاکٹر علی خان کے ساتھ شادی کے بعد کینیڈا گئیں۔ تو نفیسہ بیگم نے خطوط کا سہارا لیا۔ پہلے ہی خط پر انہیں اس قدر برا بھلا کہا گیا کہ کچھ عرصے کے لئے وہ خاموش ہو گئیں۔ مگر بھانجے کی پیدائش کا علم ہوا تو رہا نہ گیا۔ ایک بار پھر مبارکباد کا خط بھیج دیا۔ جس پر ایسہ بیگم نے آخری بار متنبہ کیا کہ وہ اپنے باپ، سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن بھائی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتیں۔ اس لئے آئندہ اُن سے کوئی رابطہ نہ کیا

یاور خان کے کہنے پر ایسہ بیگم رک گئی تھیں۔ اُس میں تو اُن کی جان تھی۔ اُس کا کہنا کہاں رو کر سکتی تھیں۔ اگر اُسے شندی سے روک رہی تھیں تو اُس کے ہی بھلے کے لئے کر رہی تھیں۔

دن کے بارہ بج رہے تھے۔ صبح سے وہ یاور خان کے ساتھ ہوسپتال گئی ہوئی تھیں۔ اپنا چیک اپ کروانے۔ ابھی ابھی میوہ خان انہیں گھر لیکر آیا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے وہ کچن کے راستے اندر آ گئیں۔ حید کو چائے بنانے کا کہا۔ اور خود لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئیں۔

ایسہ بیگم پانچ سال کی تھی جب اُن کی والدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے والد نے اُن کی دیکھ بھال کے لئے دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر اُن کی تانی انہیں

جائے۔ اُس کے بعد نفیسہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔ اور ایسہ بیگم سکون سے رہنے لگی تھیں۔

پھر۔۔۔ پلک جھپکنے میں بچے جوان ہو گئے۔ یاور خان U.S.M.L.E. کے لئے امریکہ چلا گیا۔ اور ایسہ بیگم اور علی خان، نایاب، شاداب سمیت کینیڈا میں ہی اپنی دنیا بسائے رہے۔ ماہ و سال گزر رہے تھے کہ اچانک علی خان کو ہارٹ ایک ہوا۔ اور پہلے ہی ایک میں چل بے۔

ایسہ بیگم وطن واپس لوٹ آئیں۔ اپنے سرالی شہر کراچی میں قیام پذیر ہو گئیں۔ بیٹیاں وہیں اپنے گھریلو کی ہو گئیں اور یاور خان کو اس شہر سے جاب کی آفر ہوئی۔ تو وہ اس بستی میں چلا آیا مگر۔۔۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں اُس کی مڈ بھیڑ نفیسہ کی بیٹی سے ہو گی۔ وہ رشتوں کا اتنا پیاسا ہو گا کہ سکے اور سوتیلے میں فرق نہ کر سکے گا۔ یہ اندازہ نہیں تھا انہیں!

ماضی میں گم وہ کھڑکی کے اُس پار خلاؤں میں تک رہی تھیں۔ حمید نے کچن کا دروازہ کھولا۔ تو کراکری اور کٹکری کی کھٹک سے اُن کی سوچوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

حمید نے اُن کے آگے میز پر چائے لگائی۔ انہوں نے تھرمس سے گرم گرم چائے کپ میں ڈالی۔ اور گھونٹ بھرتے ہوئے ایک بار پھر سوچنے لگیں۔

کس طرح یاور خان کو شندی سے چھٹکارا دلانیں؟

رات بھر بھی اسی سوال نے انہیں چین نہیں لینے دیا تھا۔

کیا کریں؟

ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا کہ یکا یک انہیں شاداب کی بات یاد آ گئی۔

’یاور بھائی کہتے تھے۔ جلدی کرو ورنہ آنٹی نور جہاں اپنے بیٹے ابراہیم کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔‘

جبھی۔۔۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ وہ نور جہاں بانو سے بات کریں گی۔ شاندانہ انہیں پسند تھی۔ ابراہیم بھی اچھا خاندانی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ عام حالات میں تو شاید عالمگیر حیدر اپنی بیٹی کا ہاتھ اُس کو نہ تھماتے۔ کہ وہ ایک عام انجینئر تھا۔ لیکن اس وقت حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ اُسے ایک اچھے مرد کے سہارے کی ضرورت تھی اور بس۔ لہذا ابراہیم میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اور پھر نور جہاں بانو کی خواہش بھی یہی تھی۔

سوچتے سوچتے ہی انہوں نے قریب رکھے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر۔۔۔ وہ چائے بھی پیتی جا رہی تھیں اور نور جہاں بانو کے ساتھ کپ شپ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ آخر میں انہیں اپنے دل کی بات کہنے شام پانچ بجے اپنے یہاں چائے پر مدعو کرتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا۔

سر صوفے کی پشت سے نکاتے ہوئے وہ چوڑی خوبصورت کھڑکی میں سے باہر گھنٹی ہریالیوں کو دیکھنے لگیں۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ یاور خان نے لُنج اُن ہی کے ساتھ کرنے کا کہا تھا۔ بس پہنچنے ہی والا تھا۔

لُنج پر یاور خان کے پسندیدہ بلیک پیپر چکن اور ایک فرائیڈ رائیس تھے۔

ایسہ بیگم کے لئے الگ اُبلی ہوئی سبزی بھی تھی۔ دونوں ادھر ادھر کی باتوں کے دوران کھانا کھا رہے تھے۔ یاور خان آن گارڈ سا تھا۔ مبادا امی کا دھیان شندی کی طرف جائے اور پھر اُسے آڑے ہاتھوں لیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہ تو کسی اور ہی سوچ میں گم تھیں۔ شندی کو ابراہیم سے بیاہ کر یاور خان

کا اُس سے پیچھا چھڑانے کی!

شام ٹھیک پانچ بجے نور جہاں بانو آ گئیں۔ کچن کے باہر ڈھلتی دھوپ میں گھاس پر کرسیاں ڈلو کر دونوں بیٹھ گئیں۔ وہیں کئی لوازمات کے ساتھ چائے آ گئی۔ جنت نظاروں سے لطف اندوز ہوتیں کپ شپ کرتیں وہ چائے پینے لگیں۔

”ابراہیم کے لئے کوئی لڑکی ہے نظر میں کیا؟“ وہ جلدی ہی اپنے مطلب پر آگئیں کہ پونے سات، سات بجے تک یاور خان نے بھی آ جانا تھا۔
نور جہاں بانو مسکرا دیں۔

”تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔“

”کہو۔ میں کیوں برا مانوں گی۔“

”تمہیں پتہ ہے جب تک مجھے یاور کا پتہ نہیں تھا میں شائد انا کو ابراہیم کے لئے پسند کئے بیٹھی تھی۔“

”تو اب کیا ہو گیا ہے۔ شائد انہ کہیں گئی تو نہیں۔“

”نہیں۔ اب تو یاور کی بات بچ میں آگئی ہے۔“

”خواہ مخواہ یاور کی بات آگئی ہے۔ میں اُس کی شادی اُس سے کرواؤں گی تو ہوگی نا۔“

”کہیں... یاور کو جو وہ پسند ہے۔“

”اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ دن پہلے اُس کی ڈاکٹر نادیا کے

ساتھ کپ شپ تھی۔“

”پھر؟“ وہ قدرے چوکتے ہوئے بولیں۔ ڈاکٹر نادیا کو تو وہ جانتی تھیں

”چھوڑ چھاڑ دیا اور کیا۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرائیں۔ ”تم ایسا کرو۔ ابراہیم کے انگلیڈ واپس جانے

سے پہلے پہلے اُس کی مگنی شائد انہ سے کرادو۔۔۔“

”اُس سے زیادہ اور خوشی کی بات کیا ہوگی لیکن یاور۔۔۔“

”پھر یاور۔ بچ پوچھو نور جہاں تو یاور کو شائد انہ سے بچانے کا بس یہی

ایک راستہ ہے۔ اگر تمہیں شائد انہ پسند ہی ہے تو مجھ پر یہ احسان ضرور کر دو۔ میرا بچہ میرے دشمنوں سے بچ جائے گا۔“ اُن کے لہجے میں التجا تھی۔

”لیکن یاور سے بھی تو بات کر لیں۔“

”یاور سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو ہفتے کے لئے لنڈن

جانے والا ہے۔ بس اُنہی دنوں میں یہ کام کر لو۔“

”لیکن یاور۔۔۔“

”بھول بھال جائے گا چند دنوں میں۔ جیسے ڈاکٹر نادیا کو بھول گیا ہے۔

جیسے پڑھائی کے دوران ایک امیریکن لڑکی کو بھول گیا تھا۔“

”اچھا۔“ نور جہاں بانو خوشگوار سے ہنس دیں۔

اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ نور جہاں بانو کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

شائد انہ صورت اور سیرت سے تو مالا مال تھی ہی۔ مگر نور جہاں بانو اُس کے املاک

سے بھی متاثر تھیں۔ اُن کا بیٹا بیٹھے بٹھائے جاگیر دار بن جاتا تو اُس میں کوئی حرج

تو نہیں تھا!

اور پھر۔ اُنہوں نے اپنی سی کوشش تو کر دیکھی تھی۔ ایسہ بیگم کو شائد انہ

کے حق میں قائل کرنے کی، اب جب وہ خود ہی اُسے راستے سے ہٹانے کی فکر

میں تھیں۔ تو کسی اور کے بجائے خود اُن کا ابراہیم شائد انہ کے ساتھ ساتھ اتنی

ساری خوبیوں کو کیوں نہ سمیٹ لے۔ دہلیز پر آئی نعمتوں کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہی

تھا!

شروع میں جج صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ کسی بھی قانونی چارہ جوئی سے

پہلے شائد انہ کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جاتی۔ تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو

جاتے۔ اور وہ اس عمر میں کورٹ کچہری اور بے حد فعال میڈیا میں کچھڑا چھلنے سے

بچ جاتی۔ جس میں کہ حویلی سے اُس کی کسی گارڈ کے ساتھ رات گئے فرار ہونے کا

ذکر آتا تھا۔ آج تک اُس کے ساتھ غائب رہنے کا چرچا ہوتا تھا۔ اور کورٹ میں

جو غیر اخلاقی سوالات ہونے تھے وہ الگ۔ مگر بقول جج صاحب کے شادی بھی تو

کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ یاور خان اُس کا

خالہ زاد تھا۔ اُس سے شادی کر لیتا تو اچھا تھا۔ اس پر جب نور جہاں بانو نے کہا تھا۔ کہ ایسہ بیگم کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گی۔ مزید کہ اس سلسلے میں جج صاحب کا اپنے ابراہیم کے بارے میں کیا خیال تھا؟ تو انہوں نے کہا تھا۔ ابراہیم کے لئے شاندار جیسی لڑکی کو پا کر وہ خود کو خوش قسمت سمجھیں گے...

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔ بس سوچ رہی تھی کہ شاندار کا کیا ہوگا؟ وہ بھی تو یاد رکھی پسند سے واقف ہوگی۔“ سوچوں سے ابھرتے ہوئے انہوں نے بات بنائی۔

”اول تو بات ابھی اتنی دور نہیں۔ اور اگر کچھ بھٹک پڑی بھی ہو شاندار کو تو وہ میں ٹھیک کر لوں گی سب۔“ ایسہ بیگم اپنے بیٹے کو اپنی سوتیلی بہن کی بیٹی سے بچانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں۔

یوں دونوں سہیلیاں دیر تک آئندہ کی پلاننگ کرتی رہیں۔ یاد خان کو فی الحال کوئی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ جج صاحب کو یاد خان کی پسند کا بالکل نہیں بتانا چاہئے۔ باقی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تیجی۔ یاد خان کی گاڑی موڑ کاٹتی سامنے آتی دکھائی دی۔

دونوں دوستوں نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ یاد خان گاڑی گیراج کے آگے روکتے ہوئے وہیں آ گیا۔ تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا، چائے پی، اور پھر معذرت کرتا اور اپنے بیڈروم میں ریست کرنے آ گیا۔

اُس کی شاید آنکھ لگ گئی تھی۔ لینڈ لائن پر کال آئی تو نیند کھل گئی۔ ہسپتال سے کال تھی۔ اُس کے آج ہی آپریشن کردہ مریض کے متعلق نرس نے اُسے کو ٹیکٹ کیا تھا۔ اُس نے پشٹ کا حال دریافت کیا۔ کچھ ضروری انسٹرکشنز دیں اور فون بند کر دیا۔

بستر سے اٹھتے ہوئے اُس نے بالکنی کے پردے ہٹائے۔ نیچے وادی میں، قد آور درختوں میں، رات کی تاریکیاں اتر آئی تھیں۔ آکاش پر تاروں

کے چراغ، دھرتی پر دیپ جل اٹھے تھے۔

ہمیشہ کی طرح مسکورتے ہوئے اُس نے پردے دوبارہ برابر کر دیئے۔ گھڑی کی جانب دیکھا۔ نو بجنے کو تھے۔ وہ امی کی طرف آ گیا۔

”امی۔ میں اپنے ایک کولیگ کے پاس جا رہا ہوں۔ دیر ہوگئی تو آپ کھانا کھا لیجئے گا۔ میں واپس آ کر کھالوں گا۔“

”نہیں بیٹا۔ میں انتظار کروں گی۔ تم زیادہ دیر مت کرتا۔ راستے محفوظ نہیں ہوتے آج کل۔“

”جلدی آ جاؤں گا امی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں تیار ہوتا ہوں جا کر۔“

”جاؤ بیٹا۔ اللہ حافظ۔“

”وہ کہیں اور نہیں جا رہا تھا۔ شندی کے پاس جا رہا تھا۔ کراچی سے آنے کے بعد اُسے دیکھا جو نہیں تھا۔“

ڈارک بلویتی سوٹ میں وہ بہت سنگ لگ رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے وہ گاڑی میں چل دیا۔ کہ مبادا پیدل جائے تو امی کو شک پڑ جائے۔

موڑ کاٹتے ہوئے اُس نے روڈ پر عین شندی کی بالکنی کے نیچے گاڑی کھڑی کر دی۔ ڈھلان چڑھتا اوپر آیا۔ اور پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

شندی نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ کئی دن بعد یاد خان کو دیکھا تھا۔ چہرے پر حیا کی لالی دوڑ گئی۔ سیاہ جھالریں پلکیں گرنے لگیں۔

اُس نے آہستہ سے اُس کے حسین چہرے پر گھر آئی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹائی۔ پرکشش ہونٹوں سے اُس کے ماتھے کو چھوا۔

”کیسی ہو؟“ وہ اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ماما کہاں ہیں؟“ چور جودل میں ہر وقت بیٹھا رہتا تھا۔

”نور محمد کے گھر گئی ہیں۔“

”اوہ۔“ اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔

پھر۔۔۔ چپ چاپ اُسے سینے سے لگا لیا۔ دھیرے دھیرے پیار کرنے لگا۔

شندی انداز خود سپردگی لئے اُس کے مضبوط بازوؤں میں گھری بے خود سی کھڑی تھی۔ وہ اُس کے بہت قریب تھا۔ اتنا کہ وہ اُس کے دل کی دھڑکنیں صاف سن رہی تھی، اُس کی مہکتی سانسیں اپنے چہرے پر منڈلاتیں محسوس کر رہی تھی، اُس کے مخصوص پرفیوم کی مدھرتا اُس کے تن من میں ہلچل مچا رہی تھی! کتنے سارے پل بیت گئے۔ وہ دونوں یوں ہی کھڑے رہے۔

پھر۔۔۔ جیسے یاور خان کو ہوش آ گیا۔ آہستہ سے اُسے اپنے سے الگ کیا۔ کہ کہیں ماما آ جاتیں تو؟

”تمہیں پتہ ہے میں نے تمہیں کتنا مِس کیا ہے؟“ اُس کے بال سنوارتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔ آواز اب بھی جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔

وہ خاموش تھی۔ جھکی جھکی چلیں، بھیکے بھیکے ہونٹ لئے سر جھکائے کھڑی تھی۔

”چلو۔ تمہاری بالکنی میں بیٹھتے ہیں۔“ اُس کا شرمایا لجا یا سراپا اُس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”چلیں۔“ وہ اُسے اپنے بیڈروم میں سے گزارتے ہوئے بالکنی میں لے جانے لگی۔

دونوں کین کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نیچے گاؤں کی اونچی نیچی بہت ساری بتیاں اور اوپر ٹم ٹم کرتے اُن گنت تارے! جادوئی ماحول تھا۔

”آج سارا دن کیا کرتی رہیں؟“ اُس نے ابتدا کی۔ وہ اُس کا پل پل

جاننا چاہتا تھا، اپنا نا چاہتا تھا۔

”میں...“ وہ سوچنے لگی۔ ”دن میں یہاں بیٹھی ایک ناول پڑھتی رہی۔ اس وقت اندر... اپنا فون انڈیکس ڈھونڈ رہی تھی۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ مل ہی نہیں رہا۔“

”ویسے۔ حضور کو بتایا تھا کہ اپنے فون سے کسی کو کوئیٹ نہیں کرنا۔“

”کوئیٹ نہیں کر رہی تھی ویسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔“

”اچھا۔ اور۔ اور کیا کر رہی تھیں؟“ وہ اب بھی اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”اور...؟“ وہ مسکرا دی۔ ”ماما سے کہا تھا مجھے چپاتی بنانا سکھائیں۔ وہ آئیں گی تو سکھائیں گی۔“

”اوہ نو۔“ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ ”ویسے اچھی بات ہے۔ میرے یہاں تمہاری حویلی کی طرح نوکروں کی ریل پیل نہیں ہوگی۔ کلک چھٹی جائے گا تو تم ہی کو سب کرنا پڑیگا...“

وہ سرخ سی ہو گئیں۔

”مجھے بہت اچھا لگے گا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں ماما سے تھوڑا تھوڑا سیکھ بھی رہی ہوں۔“

”مجھے تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں بہت اچھی لگیں گی۔“ اُس نے اُس کے ہاتھ پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”چاہے کیسی بھی بنی ہوں۔“

”کیسی بھی بنی ہوں؟“ اُس نے حشمکین نظروں سے اُسے دیکھا۔

”ظاہر ہے۔ کیسی بنی ہوں گی۔“ اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”آپ مجھے چیلنج مت کریں۔ میں ٹھیک ٹھاک چیزیں بناؤں گی۔“

”اچھا۔ آج چپاتی دیکھ لیتے ہیں...“

”اوہ نو۔“ اُس نے اپنی بہت خوبصورت آنکھیں میچ لیں۔

کتنی دلکش ادا تھی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

پھر۔۔۔ جیسے اُسے کچھ خیال آیا۔ سنجیدہ ہو گیا۔

”تمہیں ایک بات بتاؤں؟“ وہ دھیرے سے بولا۔

”جی۔“ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے

لگی۔

”امی آئی ہوئی ہیں۔“

”کب؟“ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”پرسوں۔“

”آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“

اُس نے گہری سانس لی۔

پھر۔۔۔ شندی کو سب بتا دیا۔ کہ اُس کی امی شندی کی امی کی سوتیلی بہن تھیں۔ چند سال قبل وہ لوگ کینیڈا سے کراچی شفٹ ہوئے۔ پھر اُسے خالو عالمگیر کے انتقال کا علم ہوا۔ اور وہ تعزیت کے لئے حویلی گیا۔ اُس وقت وہ شندی کو یہی بتانے گیا تھا کہ وہ اُس کا سوتیلا خالہ زاد تھا۔ اُس سے تعزیت کرنے آیا تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے آیا تھا۔ مگر۔۔۔ وہاں پہنچا تو حالات ہی کچھ اور تھے۔

حویلی آسید زدہ اور ماحول پتھرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اور پھر۔۔۔ جب اُسے معلوم ہوا اپنا سگا بچا اور سگا ماموں ہی اُسے ختم کرنے پر تلے تھے۔ تو اُس نے اپنی شناخت کروانے کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا۔ کہ شندی کا تو سگے رشتوں سے ہی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ سوتیلے رشتوں کا کیا بھروسہ کرتی۔ اور بھی خیال آیا کہ جس طرح ایسہ بیگم اپنے سوتیلے رشتوں سے متنفر تھیں۔ اُسی طرح شاید نفیسہ بیگم کا بھی رویہ رہا ہوگا۔ شندی بھی ظاہر ہے ماں کی ہم خیال ہوگی تو چونکہ وہ مصیبت میں تھی۔ اس لئے بہتر تھا کہ وہ اُسے فی الحال کچھ نہ بتاتا مبادا اُس کی مدد لینے میں اُس کی خودداری مجروح ہو جاتی۔ اُسے اور تکلیف ہوتی یا پھر مزید متنفر ہو

جاتی اُس سے۔

پھر۔۔۔ جوں جوں وہ اُس سے ملنے لگا۔ اُسے پیاری سی دوست سمجھنے

لگا۔ اُس کے پاس آکر اُسے سکون ملنے لگا۔ تو اُس نے اُسے اپنا رشتہ بتانے کا

ارادہ ہی ترک کر دیا۔ بعد میں جب اُس نے محسوس کیا وہ تو اُسے چاہنے لگا تھا۔

تب اُسے فکر پڑ گئی کہ اب بات سے پردہ اٹھائے گا تو کیسے؟ شندی تو خود بھی

اُسے پیار کرنے لگی تھی۔ اور پیار میں انسان دشمن بھلا دیتا ہے۔ مگر۔۔۔ امی کو کیسے

راضی کرے گا؟ یہ قریباً ناممکن لگ رہا تھا اُسے۔۔۔

شندی ہکا بکا سب سن رہی تھی۔ اُس کی طرف بے اختیار کھچنے کی وجہ سمجھ

میں آ رہی تھی۔

"And this is the whole story, my most

precious cousin." اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تمہی آپ میرے گارڈ بنے تھے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

اور۔۔۔ یاور خان کا ایک شکاف قہقہہ بلند ہوا۔

”ہاں۔۔۔ رشتے کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ ورنہ اگر ایسے موقع پر مجھے کسی

اور کی مدد کرنا پڑتی تو کم از کم اُس کا گارڈ بالکل نہ بنتا۔“ اُسے اکثر اپنا بہرہ دپ

بھرنے پر حیرت ہوتی، ہنسی بھی آتی۔

”آپ مجھے پہلے سے کئی گنا زیادہ اچھے لگنے لگے ہیں۔“

”کیوں؟“

”میرے کزن جو ہوئے۔“

”میں پہلے ہی بتا دیتا مجھے پتہ ہوتا تو۔“

”آپ اکیلے ہی مجھے کزن سمجھتے ہوئے مزے لیتے رہے۔ میں بھی

خیران تھی کہ آپ شروع دن سے ہی مجھ سے اتنے بے تکلف کیوں تھے۔ اتنی

اپنائیت کیوں ہوتی تھی آپ کی ہر بات میں۔“

”ہاں۔ مجھے شروع دن سے تم پر پیار آتا تھا۔ تم سے کپ شپ کرنے کو دل کرتا تھا۔ تمہارے لئے بیڑا، بہت سارے چوکلیٹس اور ڈھیر ساری مارزی پان لانا چاہتا تھا۔ جیسی تو تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھاتا تھا۔ تم سے فون پر کپ شپ کرتا تھا۔ ورنہ کسی غیر لڑکی کے ساتھ میں اس طرح Odd hours میں بات کر سکتا تھا؟“

”اور میں سمجھتی رہی کہ آپ میرے محسن ہیں اس لئے۔ پھر میرے ڈاکٹر بھی رہے ہیں شاید اس لئے۔“

”اور یہ سوچا ہی نہیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں شاید اس لئے۔“ وہ اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
اچانک اُس کی آنکھوں میں کہانیاں جنم لینے لگی تھیں، یاد دہانیاں منڈلانے لگی تھیں۔

شندی اُس کی بولتی آنکھوں کا سامنا کبھی نہ کر پائی تھی۔ اب بھی لمبی سیاہ پلکیں تیوراً کر گر گئیں۔

وہ بے طرح محظوظ ہوا۔ چند لمحوں ہی اُسے دیکھتا رہا۔

پھر۔۔۔ جیسے کچھ یاد آیا۔ سنجیدہ ہو گیا۔

”تم دعا کرتی ہو؟“

اُس نے جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

”کس بات کی؟“

”کہ امی مان جائیں“

”اوہ۔ ہاں۔ کرتی ہوں“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ماما سے بھی کہو دعا کریں۔“ ماما کو ڈھلان پر اوپر آتے دیکھتے ہی اُس

کی شوخی لوٹ آئی۔

”ان سے آپ کہیں۔“

وہ خوشگوار سے ہنس دیا۔

”کھانا میرے ساتھ کھائیں گے؟“ آنٹی ایسہ چونکہ گھر پر تھیں۔ اس

لئے اُس نے صرف پوچھ لیا۔ اصرار نہیں کیا۔

”نوجھنک یو۔ امی نے کہا ہے وہ کھانے پر میرا انتظار کریں گی۔“

”اوکے۔ ماما۔۔۔“ اُس نے پاس سے گزرتی ماما کو آواز دی۔

اُنہیں کوئی بنانے کو کہا۔ اور دونوں پھر سے باتوں میں مصروف ہو

گئے۔

ماما نے کوئی لگائی۔ تو دونوں اندر لوگ روم میں نمیل پر آ گئے۔

شندی کا قرب تھا، خوبصورت لوگ روم کا خواب آور ماحول تھا،

مزید اُر کوئی اور ڈھیر سارا ڈرائے فروٹ تھا، مگر۔

یاور خان سوچوں میں ڈوبا تھا۔ امی شندی کا ذکر تک سننا نہیں چاہتی

تھیں۔ آج ہوسپٹل میں اُن کے چیک آپ کے دوران اُس نے ہمت کر کے اپنی

مدعا اُن کے سامنے پیش کر دی تھی مگر۔ وہ یوں سامنے دیکھنے لگی تھیں جیسے کچھ سنا

ہی نہیں تھا۔ اُن کے ماتھے پر کی شکلیں اور گھمبیر خاموشی صاف بتا رہی تھیں کہ وہ

اس معاملے میں ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ شندی کو پانا اُن کو ناراض کرنا

تھا اور اُن کو خوش کرنا شندی کو کھونا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں

چاہتا تھا۔ نہ امی کو ناراض کر سکتا تھا۔ نہ ہی شندی کو کھونا چاہتا تھا۔ پھر۔

کیا کرے گا؟ ماں کو ناراض۔ No way۔ شندی کو چھوڑنا۔ یہ بھی

مشکل!

شندی سے پہلے جو دو ایک لڑکیاں اُس کی زندگی میں آئی تھیں چلی گئیں تو

اُسے دو چار دن سے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ شندی میں جانے کیا بات تھی؟

اُس کے مٹھ جانے کا تو وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ آتی جاتی سانس بن گئی تھی وہ

تو اُس کی۔ اور سانس لئے بغیر جیا تو جا نہیں سکتا!

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ شندی اُس کی دلی کیفیت سے بے خبر دھیرے سے بولی۔

اُس نے گہری سانس لی۔

”شندی۔ تمہاری امی میری امی کو کیسا سمجھتی تھیں؟“ میرا مطلب ہے امی سوتیلی تھیں نا۔“ اُس نے جاننا چاہا۔

”اوہ۔“ وہ جیسے یاد کرنے لگی۔ ”مجھے تو زیادہ یاد نہیں کیونکہ میں چھوٹی تھی تب۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اُن کی ایک بڑی بہن بھی ہیں اور انہیں اُن سے ملنے کی شدید خواہش ہے۔۔۔“

وہ حیران سا اُسے دیکھنے لگا۔

تو۔ ان لوگوں کے دلوں میں امی کے لئے کوئی میل نہیں تھا!

میل امی کے دل میں تھا ان لوگوں کے لئے۔ لیکن۔ بقول امی باپ اور گھر تو شندی کی امی نے اُن سے چھینا تھا۔ میل بھی ظاہر ہے امی کے ہی دل میں آتا تھا۔ پر۔

کیا یہ میل دھویا نہیں جاسکتا تھا؟ صاف نہیں کیا جاسکتا تھا؟ یا ورخان اور شندی کی خاطر ہی سہی!

وہ اُداس سا نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ کوئی پینے میں مصروف رہا۔

”آپ نے یہ کیوں پوچھا؟“ اُسے شک سا گزرا۔ کوئی بات تھی ضرور۔

”بس ویسے ہی۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔“ اُس نے اپنائیت سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

تو بات تھی۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔

”آٹھی نے کچھ کہا ہے کیا؟“

”نہیں۔ تم کوئی بچہ۔“ اُس نے بھی بٹاش بننے کی کوشش کی۔

شندی نے کرشل کی خوبصورت ٹرے میں بھی کیٹو یا ورخان کی طرف کھسکائی۔ مگر اب کے۔ شندی کی آنکھوں میں بھی اندیشے منڈلانے لگے تھے۔ ”او کے میم۔“ یا ورخان خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب چلوں گا۔ امی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔“

”آٹھی کو آپ نے بتایا ہے آپ یہاں آئے ہیں۔“

”میرا دماغ خراب ہے کہ اُن کو بتاؤں۔“ وہ خوشگوار سے کہتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی مسکرا دی۔

”آپ کی بات سے مجھے یہی لگا۔۔۔“

”تمہارے اندازے اکثر۔۔۔“ وہ شرارت سے کہتا چپ کر گیا۔

وہ مسکرائی، کرسی پیچھے کھسکائی، اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نیکسٹ سنڈے کو دو ہفتے کے لئے لنڈن جا رہا ہوں۔ ایک سیمینار میں شرکت کرنے۔“ اُس نے خبر سنائی۔

”دو ہفتے۔۔۔“

”ہاں۔ کم ہیں تو اور بڑھالوں اپنی Stay۔“

اور۔ اُس نے اپنے نازک سے ککے سے اُس کے مضبوط سینے پر دوار کیا۔ پھر۔ جانے کیسے؟ پہلی بار اُس کی دونوں ہانہیں بے اختیار اُس کی گردن کے گرد جمائیل ہو گئیں۔

"I love you more than ever before, and this is perhaps because of the blood we share."

یا ورخان نے اُسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ سینے سے بھینچ لیا۔

"I feel the same, my dear cousin."

ماما کے قدموں کی آہٹ پر دونوں چوکے ہو گئے۔

یاور خان لنڈن سدھار گیا۔ ایسہ بیگم کراچی چلدیں۔ اور —
 نور جہاں بانوشندی کے پاس آگئیں۔ بہت پیاری اور شفقت سے اپنی
 مدعا بیان کی۔ اُن کے پیار اور شفقت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اُنہوں نے تو
 خلوص دل سے ایسہ بیگم کوشندی کو یاور خان سے بیاہنے کا کہا تھا۔ اپنی دلی خواہش
 دل میں دبا کر۔ لیکن وہ کسی طور ایسا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ پھر شندی کی شادی تو
 بہر حال کسی سے ہوتی تھی۔ تو کیوں نہ وہ اُسے اپنے ابراہیم کے لئے لے آتیں۔
 اگر اُس کے پاس جاگیر تھی۔ تو وہ بھی کسی نہ کسی کے پاس تو جاتی تھی۔ ابراہیم کے
 پاس آگئی تو اُس کی قسمت۔ اس میں اُنہیں کوئی عیب یا زیادتی نظر نہیں آئی۔ یہی
 املاک نفیسہ بیگم کے ذریعے عالمگیر حیدر کو ملی تھیں۔ عالمگیر حیدر بھی تو خود ایک عام

”اچھا۔ فیک کیئر۔ گڈ ٹائیٹ“۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔
 ”گڈ ٹائیٹ“۔ شندی بولی اور —
 اپنے بیڈروم کی طرف چل دی۔



آدی تھے۔ ہوتا ہے ایسا۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے! شندی پہلے بھی اُن کی خواہش سمجھ رہی تھی۔ مگر۔۔۔ اس قدر صاف الفاظ میں سن کر دم بخود رہ گئی۔

وہ تو۔۔۔ یاور خان کو چاہتی تھی۔ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال۔۔۔ آنٹی نے اُسے سوچنے کو دو چار دن کی مہلت دی۔ بہت اپنائیت سے دنیا کی اونچ نیچ اور جس سچویشن میں وہ اس وقت تھی، سب سمجھائی۔ ڈھیر ساری تسلیاں دیں اور۔۔۔ نیک خواہشات کے ساتھ اپنے گھر چل دیں۔

لُنج کے بعد شندی سب بھول بھال آرام سے سو گئی۔ آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔

وہ واش روم گئی۔ ہاتھ منہ دھوئے۔ خوبصورت بالوں میں برش کیا اور۔۔۔ کل ہی منگوا یا۔ Dorothy Carlock کا On tall pine lake لیکر اپنی بالکنی میں آ کر بیٹھ گئی۔

سورج دُور اُس پار پہاڑوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کی سمت چل دیے تھے۔ آس پاس کے گھر وندوں سے حسب معمول شام کی پکوان کے دھوئیں اٹھنے لگے تھے اور۔۔۔ سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا اپنی کٹگریوں میں ڈھلتے سورج کا سیندر سجا رہا تھا!

مدھوش کن ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُس نے کتاب کھول لی۔

ماما اُس کی اور اپنی چائے وہیں لے آئیں۔ اُس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھے ہوئے اُس کے لئے چائے بنانے لگیں۔ کچھ سوچوں میں گم تھیں جیسے۔ نور جہاں بانو کے جاتے ہی شندی نے اُنہیں اُن کے آنے کا مقصد بتا دیا تھا۔ خود تو بے فکر ہو گئی تھی مگر۔۔۔ ماما کو اندیشوں میں مبتلا کر گئی تھی۔

ماما جانتی تھیں شندی اور یاور خان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کئے تھے۔ سب سمجھتی تھیں آپس میں دونوں کی دلچسپی۔ شندی نے خود اقرار نہیں کیا تھا تو کیا ہوا؟ بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ متفکر بھی۔

”شندی بیٹے۔“ اُنہوں نے چائے کا کپ اُس کے آگے رکھا۔ ”جی ماما۔“ کپ اٹھاتے ہوئے وہ لب بھی کتاب پر نظریں جمائے تھی۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی۔“ ”جی ماما۔“ اب اُس نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ ”کیا بات کرنا تھی؟“

وہ جیسے ہمت نہ کر سکیں۔ آہستہ آہستہ اپنے کپ میں جھج چلائی رہیں۔ چائے پر نظریں جمائے رکھیں۔ ”بتائیں نا ماما۔“ پتہ نہیں کیا کہنے والی تھیں وہ؟ اتنی سنجیدہ وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئیں تھیں۔

”کل سے سوچ رہی ہوں کہوں نہ کہوں مگر۔۔۔“ ”مگر کیا؟“

”آج تم نے نج صاحب کی بیگم صاحبہ کی بات بتائی۔ تو سوچتی ہوں کہہ ہی دوں۔۔۔“

”بیٹا۔۔۔ میری بات کا برا مت ماننا مگر۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ مت سوچنا۔۔۔“

”ڈاکٹر صاحب کے بارے میں۔۔۔؟“ وہ کچھ آپ سیٹھی نظر آنے لگی۔

”بیٹا۔۔۔ مجھے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تم میں دلچسپی لیتے ہیں۔“ اُنہوں

نے شادی کا کہا ہی نہیں۔ ”مگر... اُن کی والدہ... ایسا نہیں چاہتیں...“
اُنہوں نے کہہ ہی دیا۔

”میں کچھ سمجھی نہیں۔ اُن کی والدہ... یہ سب کیا بات ہے؟“ اُس
نے کپ والپس میز پر رکھ دیا۔

اور۔ ماما نے اُسے سب بتا دیا۔

کس طرح کل یاور خان کے چلے جانے کے بعد کراچی جانے سے قبل
ایسہ بیگم نے ماما کو گھر بلوایا تھا۔

”نفیسہ کی بیٹی سے کہہ دو۔ یاور سے شادی کا جو خواب وہ دیکھ رہی ہے
وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ نفیسہ نے مجھ سے میرا باپ میرا گھر چھینا۔ اب اُس کی بیٹی
مجھ سے میرا بیٹا چھیننے کے درپے ہے۔ مگر اب میں پانچ سال کی ایک کمزور بچی
نہیں ہوں۔ ایک جوان بیٹی کی ماں ہوں۔ یاور کو میں نے جہنم دیا ہے۔ وہ وہی
کرے گا جو میں کہوں گی۔ لنڈن سے واپسی پر وہ سیدھا کراچی آئے گا۔ اُسی دن
میں اپنی دوست کی بیٹی سے اُس کا نکاح کرواؤں گی۔ اُس کے بعد ہی وہ یہاں
آ کر اپنی ڈیوٹی سنبھالے گا۔ بہت ہو چکا... میرا خیال ہے یہ پیغام نفیسہ کی بیٹی
کے لئے کافی ہوگا۔“

شادی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ارد گرد کی ہر چیز گھومتی
محسوس ہو رہی تھی۔

”بہت غصے میں لگ رہی تھیں ڈاکٹر صاحب کی والدہ۔“ ماما مزید
بولیں۔

شادی خود کو سہار نہ سکی۔ سرکسی کی پشت سے نکا دیا۔ پھرائی آنکھوں
سے ماما کو بکنے لگی۔

اُس کی یاور خان سے صرف محبت کی بات تو نہ تھی۔ وہ تو اُس پر پورا اٹکیے
کئے بیٹھی تھی۔ اب تو وہ ہی تھا اُس کا سب کچھ۔ وہ آج کیا کرے گی؟ کل کیا ہوگا؟ یہ

سب تو اُس کے لئے یاور خان ہی Manage کرتا تھا۔ خود وہ تو کچھ بھی نہیں
تھی۔ اُسی نے اُس کو اپنی املاک دلوائی تھیں، اُسے اپنی حویلی میں دوبارہ بسوانا
تھا۔ اُس کے چچا اور ماموں کے آگے وہ ہی تو اُس کی ڈھال تھا۔ اُس کا گارڈ
تھا!

اب یہ سب کون کرے گا؟ اُسے لگا وہ اچانک آسمان کی اونچائیوں
سے زمین کی عقیق گہرائیوں میں جادھنسی تھی۔ اتنے زور سے گری تھی کہ روح تک
جج اٹھی تھی!

یاور خان کو اُنہوں نے ہی جہنم دیا تھا وہ مانتی تھی۔ اُس نے وہی کرنا تھا
جو وہ کہتی تھیں یہ بھی وہ مانتی تھی پر۔ وہ کیا کرے گی؟

اس بھری دنیا میں تنہا اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ اُسے تو
دنیا کا تجربہ ہی نہیں تھا۔ اور۔ ایسے میں انکل ذوالفقار نے بھی اسٹکی خالی
کرنے کو کہہ دیا تو؟ یاور خان کی فیملی کی دوستی میں ہی تو اُنہوں نے اُسے یہاں
رکھا تھا۔ بھلے وہ کرایہ دے رہی تھی مگر وہ تو یاور خان کے ہی توسط سے رہی تھی۔ کہیں
اور جا کر اکیلی کیسے رہ پائے گی؟ وہ تو بے فکر ہو کر دن گزار رہی تھی۔ گو۔ نظر بندی ہی
تھی۔ باہر آنا جانا، کسی سے کسی بھی قسم کا رابطہ یاور خان نے بند کر دیا ہوا تھا۔ اپنے
علاقے سے کوئی بھی خبر نہ آتی تھی نہ جاتی تھی۔ ایسے میں گھبرا بھی جاتی کبھی کبھی
وہ۔ مگر۔ اپنے دشمنوں تو محفوظ تھی۔ یہی سب کچھ تھا اُس کے لئے۔ اب وہ کیا
کرے گی؟ کہاں جائے گی؟

یہاں سے نکلتے ہی کہیں چچا نے دھر لیا تو؟ ماموں نے پھر کوئی سازش کی

تو؟

وہ کانپ کانپ اٹھی۔ آج اُسے یقین ہو گیا۔ پیسہ ہی سب کچھ نہیں

تھا۔

’باپ، بھائی یا پھر شوہر۔ ہمارے معاشرے میں یہی تین رشتے ایک

دل کی بھڑاس نکال چکی تو شندی نے آنسو پونچھ لئے۔
”ماما ہم کیا کریں گے؟“

ماما کا دل اُس کی بے بسی پر کٹ کر رہ گیا۔

”جن کا کوئی نہیں ہوتا، اُن کا خدا ہوتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی مسبب الاسباب ہے۔“

ماما چائے کے برتن سمیٹنے لگیں۔ شندی ناول دوبارہ اٹھا کر خالی خالی نظروں سے اوراق پلٹنے لگی۔ پھر کتاب بند کر کے واپس میز پر رکھ دی۔ تھکی آنکھیں موندتے ہوئے سرکسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

پاس ہی بید مجنوں کے درخت میں چڑیوں کی جھرمٹ آ کر بیٹھی تو چوکتے ہوئے اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

دور پر بتوں کے پیڑوں پر شام نے ڈیرے ڈال دیئے تھے، بید مجنوں کی زمین کو چومتی ڈالیوں میں ہوا سرگوشیاں کرنے لگی تھی اور۔ خنکی ہوا ہو گئی تھی! گہری سانس لیتی، بوجھل سے قدم اٹھاتی وہ بھی اندر آ گئی۔

وقت گزارے کوئی وی آن کی اور بستر میں کروٹ کے بل لیٹتے ہوئے نظریں اُس پر جمادیں۔

’اتنی کہ۔۔۔ مجھے ڈر لگنے لگے کہ۔۔۔‘ ایک دفعہ باتوں باتوں میں یاور خان نے کوئی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

اُسے تجسس ہوا۔ اور بعد میں فون پر پوچھ لیا۔ کہ اُس وقت وہ کیا کہنے والا تھا؟

’یہی کہ۔۔۔ مجھے تم نہ ملیں۔ تو میں جیوں گا کیسے؟‘

’یاور۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں آپ کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟‘ اُس نے ٹوٹے دل میں کہا۔

’یاور کو میں نے جنم دیا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو میں کہوں گی۔‘ ماما کی

عورت کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔ اور پھر تمہارے تو تمہاری اپنی املاک ہی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ تمہیں فوری طور پر ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ جو تمہیں صرف ایک اچھے شوہر کی صورت میں میسر آ سکتا ہے۔۔۔‘ پہلی ہی ملاقات میں انکل ذوالفقار کی کہی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

ماما نے بھی یہی کہا تھا۔ کوئی اچھا بڑا مل جائے تو اُسے شادی کر لینی چاہئے۔ تاکہ اُس کا شوہر اُس کا بوجھ سنبھال لے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اُس کی ماں نے کیا تھا!

آنٹی نور جہاں بھی یہی کہا کرتی تھیں۔ اُسے ایک مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

سو۔ ادھر ادھر سے سن سن کر وہ بھی یہی سب سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ۔ اُسے شادی کر لینی چاہئے تھی۔ جبکہ کچھ ہی عرصہ قبل۔ وہ اپنی پڑھائی مکمل کئے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی!

اور پھر۔ اُس نے شادی کرنے کا فیصلہ دل میں کر ہی لیا تھا۔ پر۔ انتخاب غلط کیا تھا۔ یاور خان کا سوچ لیا تھا۔ یہ جانے بغیر ہی کہ۔ وہ تو اُس کی سوتیلی خالہ کا بیٹا تھا۔ لیکن۔

اگر اُسے معلوم ہوتا کہ وہ اُس کا سوتیلہ خالہ زاد تھا تو کیا وہ اپنا پیار روک پاتی؟ پیار بھی کوئی روکنے کی چیز تھی؟ بندھ باندھنے کی؟ دو آنسو لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

”نامیرا بچہ۔“ ماما اُسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اٹھتے ہوئے اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ اُس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

اور۔ شندی اُن سے لپٹتے ہوئے بے اختیار رو دی۔ بے حساب رو دی۔ ماما کے بھی آنسو ٹپک آئے۔ خدا کے بعد اُن دونوں کو یاور خان کا ہی تو

بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

’ٹھیک تو ہے۔‘ اُس نے انگلیوں سے اپنے آنسو پونچھے۔ ’ایسہ آنٹی یاور کی ماں تھیں۔ اور وہی ہونا چاہئے تھا جو وہ چاہتی تھیں۔‘ اُس نے پاگل من کو سمجھانا چاہا مگر۔

دل تھا، پاگل تھا، کیسے سمجھتا؟

اُس نے ٹی وی بند کر دی۔ ہمیشہ کی طرح کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے باہر بالکنی میں آکھڑی ہوئی۔ مگر۔

یہاں وہاں بکھرے جلتے بجتے دیپ اُداس تھے، ہوا کی سرگوشیاں افسردہ تھیں اور۔۔۔ بید مجنوں رورہی تھی!

وہ بھی رونے لگی۔ کہ وہ بھی بہت اُداس تھی!



آج شام پانچ بجے شادی نے چپ چاپ ابراہیم کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ کہ۔۔۔

وہ اپنی جاگیر پر اپنی حویلی میں راج پذیر نہیں تھی۔ اُس کے چچا اور ماموں اتنے فراخ دل نہ تھے کہ اُس کے لئے آئے اچھے سے اچھے رشتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اُسے دھوم دھام سے وداع کرتے۔ انہیں صرف اپنی فکر تھی۔ اپنے شادی شدہ ادبаш بیٹے سے اُس کی شادی کروا کر اُس کی جاگیر بڑپنے کی۔ یا پھر اُسے زہر دے کر خود جاگیر دار بن بیٹھنے کی!

اُس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ گودل بہت رویا تھا! مگر۔ چاند کے لئے پھر روئے تو کیا چاند اُسے مل جاتا ہے؟
یا اور ایسہ آنٹی کا بیٹا تھا۔ انہوں نے اُسے جہنم دیا تھا۔ وہ اُن ہی کی ملکیت تھا۔

’نفیسہ نے مجھ سے میرا باپ چھینا۔ اب اُس کی بیٹی مجھ سے میرا بیٹا چھیننے کے درپے ہے۔‘
اُن کا خوف بجا تھا۔ وہ اُن سے اُن کا بیٹا کبھی نہیں چھینے لگی۔ اُنہیں اتنا بڑا دکھ ہرگز نہیں دے گی!

اپنے فیصلے سے وہ قدرے مطمئن بھی لگنے لگی تھی۔ یاور خان کے چھٹنے کا بہت دکھ تھا۔ بہت درد تھا۔ لیکن۔ یاور خان کو پالینا ممکن بھی تو نہیں تھا۔ پھر۔ یہی وقت تھا۔ کوئی نہ کوئی فیصلہ تو اُسے کرنا ہی تھا۔ یوں در بدر، گھر میں مقید، باقی دنیا سے کٹی ہوئی، گمنامی کی زندگی وہ کب تک بسر کر سکتی تھی؟

اور پھر۔ ابراہیم کو قبول نہ کرتی۔ تو یاور لوگوں سے رابطہ ختم ہو جانے کے بعد جج فیملی سے تو خود بخود اُس کا تعلق ٹوٹ جاتا تھا۔ پھر کون اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا؟ کون اُس کی مدد کرتا؟ ایسے میں۔ کہ یقیناً اُس کا چچا اُس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ یہاں سے قدم باہر نکالتے ہی اُسے دشمنوں نے پھر آ لینا تھا۔

اس تصور سے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔

دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کے دل ٹوٹتے ہیں۔ ایک اُس کا بھی ٹوٹ گیا تو کوئی اُن ہونی ہوگئی!

’ثرثرن... ثرثرن...‘ دفعتاً اُس کا سیل بج اٹھا۔

’جی... کون بول رہا ہے؟‘ یاور خان تھا۔ پہچاننے کے باوجود وہ

بوکھلا کر بولی۔

’تمہارا گارڈ۔ کیا میری آواز بدلی بدلی لگ رہی ہے؟‘ وہی اپنائیت وہی کیئر، وہی Concern!
’نن... نہیں تو...‘

’پھر کیوں پوچھ رہی ہو کہ کون بول رہا ہے؟‘
وہ خاموش رہی۔ کم از کم آج وہ اُس سے بات کرنے کے قابل نہیں تھی!
’شندی‘۔

’جی‘۔ وہ جو اُس نے سوچا تھا۔ کہ اُس سے کہے گی کہ ایسہ آنٹی کی مرضی کے خلاف اُس سے تعلق قائم رکھ کر وہ اُنہیں دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ کہہ نہ سکی۔ کہ ایسا کہنے سے بات آنٹی پر آ جاتی تو؟
’تم ٹھیک تو ہوتا؟‘

’ٹھیک ہوں‘۔ وہ کمزور پڑنے لگی۔

’اچھا سناؤ۔ کیا گپ شپ ہے؟‘

اور۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں رودی۔

’کیا ہوا؟‘ وہ آپ سیٹ سا بول پڑا۔ ’کیا بات ہے شندی؟‘

’وہ... وہ...‘ آواز کی بجائے سسکیاں تڑپنے لگیں۔

’شندی پلیز! ہیلو... شندی...‘ وہ دور بیٹھا بے بسی سے بول رہا

تھا۔

شندی خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

’کچھ نہیں... آپ... آپ کیسے ہیں؟‘ وہ بمشکل کہہ سکی۔

’میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ روکیوں رہی ہو؟‘ اُس کی آواز میں

سخت تشویش تھی۔

’نمپر پچر ہو گیا تھا... اکیلی تھی بس...‘ اُس نے بات بتائی۔

’اوہ‘۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔

”تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بخار کی ٹیبلٹس لو۔ کل تک نہ اترے تو آئی نئی نور جہاں سے کہو ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ تمہاری ڈاکٹر نادیا کو نہیں کسی اور کو۔“

”تمہاری ڈاکٹر نادیا“ کہہ کر اس وقت پھر وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ کیسے اُسے بتاتی کہ اب یاور خان کو نہ اُسے فون کرنے کا کوئی حق تھا نہ ہی اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا۔ وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ اور اب اُن دونوں کو اس حقیقت کا احترام کرنا چاہئے تھا!

”I love you.“ یاور خان بولا۔

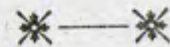
مگر وہ۔۔۔ حسب سابق ”I love you too.“ نہ کہہ سکی۔ کہ اب اُن دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔

فون بند ہو گیا۔ اور وہ سوچنے لگی۔ اُس کا خیال غلط تھا۔ کہ دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کے دل ٹوٹتے ہیں۔ ایک اُس کا بھی ٹوٹ گیا تو کون سی انہونی ہو گئی؟ اُن ہونی ہی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے۔ دل ٹوٹتے ہیں۔ تو بہت درد ہوتا ہے۔ رو جس تک جیٹ اٹھتی ہیں۔

اُس کی بھی روح جیٹ اٹھی تھی۔ بہت درد اٹھا تھا دل میں۔ بہت یاد آنے لگا تھا یاور!

نکیوں میں سردے کروہ بے اختیار رو دی۔ بلک بلک کر رو دی۔

رات نماز پڑھی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ تو اپنے رب کے حضور اپنی استقامت اور سکون کی دعا مانگی۔ گو۔۔۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ٹوٹا ہوا دل کراہ رہا تھا!



یاور خان لندن سے کراچی ایئر پورٹ پر اترا۔ تو ڈرائیور کے بجائے تایاب اُسے لینے آئی کھڑی تھی۔

وہ خوشی خوشی گاڑی میں اُس کے ساتھ پنجر زیٹ پر بیٹھا۔ تایاب ڈرائیو کرتی سڑک پر گاڑی دوڑاتی رہی۔

”امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ تایاب گویا ہوئی۔

”کیا ہوا انہیں؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”ڈاکٹر ز کا خیال ہے کہ ہارٹ ایک ہے۔ C.C.U میں ہیں۔ کل

سے انڈر ایئر رویشن رکھا ہوا ہے۔۔۔“

”کوئی سیریس بات تو نہیں؟ تم کچھ چھپا تو نہیں رہیں؟“

”نہیں نہیں۔ آپ خود ڈاکٹر ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی؟“ وہ

مسکرا دی۔ ”در اصل ڈرائیور اُن کے پاس ہے اس لئے میں آپ کو لینے آ گئی۔“

”ہوں۔“ وہ فکر مند سا بولا۔ ”پھر ہمیں ہوسپٹل امی کے پاس جانا

چاہئے۔“

”ہاں وہیں جارہی ہوں۔ امی آپ کو یاد بھی بہت کر رہی تھیں۔“

چند موڑ موڑتی۔ وہ گاڑی ہوسپٹل کے پارکنگ میں لے گئی۔

ایسہ بیگم پہلے سے بہتر تھیں۔ البتہ کچھ کمزور لگ رہی تھیں۔ یاور خان کو

دیکھ کر کھل اُنھیں۔

تبھی۔ ڈاکٹر زراؤنڈ پر آ گئے۔ اُن کے مطابق ایسہ بیگم ٹھیک تھیں۔

بس E.C.G میں معمولی سا فرق تھا۔ کل E.T.T ٹسٹ ہونا تھا۔ جس کے لئے وہ

گھر سے بھی آ سکتی تھیں مگر آج شام تک اُن کا یہاں رہنا ضروری تھا۔

”بیٹا اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ گھر لے چلو۔ ہوسپٹل میں دل گھبرا رہا

ہے۔“ ایسہ بیگم ڈاکٹر ز کے سامنے ہی بولیں۔

کل سے چند فٹ جگہ میں لیٹے لیٹے تنگ آ گئی تھیں۔ پھر یاور خان بھی

آیا تھا۔ جلد سے جلد گھر جانے کو دل کرنے لگا۔

یاور خان اُن کی بچوں کی سی بے تابی پر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”امی۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اور پھر شام تک ہی تو رہنا ہے۔

میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔“ اُس نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

ڈاکٹر ز آگے بڑھ گئے۔ نایاب اور یاور خان ایسہ بیگم کے پاس بیٹھ

گئے۔

دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ایسہ بیگم

آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔

”یاور بیٹا۔ تم گھر چلو۔ تھکے ہوئے ہو۔ نایاب ہے میرے پاس۔“

ایسہ بیگم بولیں۔

”ہاں یاور بھائی۔ آپ جائیں۔ نہادھو کر ریٹ کریں تھوڑی دیر میں

شاداب بھی امی کے پاس آ جائے گی تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ یاور خان اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈرائیور باہر موجود تھا۔ وہ اُسے گھر لے آیا۔

یاور خان اوپر اپنے کمرے میں گیا۔ نہادھو کر فریش ہوا۔ پھر نیچے آتے

ہوئے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

امی کی طرف سے اُس کی پریشانی کم ہو گئی تھی۔ کل کا ٹسٹ بھی امید تھی

کہ ٹھیک ہی آنا تھا۔

اُس نے کل صبح اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ مگر اب صورت حال بدل گئی تھی۔

امی کے کل والا ٹسٹ بھی ہو جاتا۔ سب ٹھیک ہوتا تو وہ اگلے دن ہی روانہ ہو سکتا

تھا۔

ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے فون کا ریسپور اٹھا لیا۔ ہوسپٹل سے ایک

چھٹی اور لے لی۔ پھر۔ شندی کا خیال آ گیا۔ اُسے بھی فون کرے؟ نو۔ وہاں پہنچ

کر ہی اُسے سر پر اندر دیا!

وہ اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ ساتھ میں

چکن سینڈویچز اور چیز کیک بھی تھا۔

چائے پیتے ہوئے وہ کھڑکی میں سے اُس پار دیکھ رہا تھا۔

معا۔ شاداب کی گاڑی گیٹ کے اندر آتی دکھائی دی۔ وہ خوش ہو

گیا۔

”السلام علیکم یاور بھائی۔“ اندر آتے ہی وہ اُس سے پٹ گئی۔

”کیسی ہو؟ تمہارے چھوٹے شیطان کیسے ہیں اور۔۔۔ تمہارے جواد صاحب بہادر کیسے ہیں؟“ اُس نے بہت پیار سے اُس کے بچوں اور شوہر کی خیریت دریافت کی۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ وہ قریبی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ابھی ابھی نایاب کا فون آیا۔ کہ امی کے پاس کس وقت آ رہی ہو۔ تاکہ میں یاد اور بھائی کے پاس چلی جاؤں۔“

میں نے کہا۔ آپ وہیں رہیں۔ میں چلتی ہوں یاد اور بھائی کے پاس۔ جل کر رہ گئیں۔“

یاد اور خان دونوں کی نوک جھونک پر خوشگوار سی ہنس دیا۔

ملازم شاداب کے لئے بھی کپ لئے آیا۔ دونوں چائے پینے لگے۔ شاداب جیسے کسی سوچ میں، گوگو میں الجھی تھی۔

”یاد اور بھائی آپ کو پتہ ہے۔ شاندانہ کی منگنی ہو گئی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”چند پہل تو جیسے یاد اور خان کے دماغ نے مسیح ہی نہیں لیا۔ اطمینان سے چائے کا گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔

”آئی نوری جہاں کے بیٹے ابراہیم سے ہوئی ہے شاندانہ کی منگنی۔“ شاداب نے دہرایا۔

”کیا مطلب؟“ اب اُس کے ذہن نے مسیح ریسو کر لیا۔ کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ یقیناً اُسے اب بھی نہیں آ رہا تھا۔

”پچھلے دنوں آئی نوری جہاں کا امی کے پاس فون آیا تھا۔ کہ ابراہیم نے شاندانہ کو منگنی کی انگٹھی پہنا دی ہے۔ اُن کو وہ بہت پسند تھی۔ ابراہیم بھی اُسے پسند کرتا تھا۔ مگر اُس کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے جھجک رہا تھا۔ بہر حال آئی نوری نے اُسے آمادہ کیا اور منگنی ہو گئی۔“ شاداب نے مختصر آیتایا۔

گو اُسے یہ خبر سناتے ہوئے وہ بہت پریشان تھی۔ وہ شاندانہ کے لئے سیریس تھا وہ جانتی تھی۔ شاداب کو بھی بہت دکھ تھا اس بات کا، مگر۔۔۔ امی کے سامنے کسی کی ایک نہ چلتی تھی!

یاد اور خان چند ٹائیے دم بخود سا بیٹھا رہا۔ شندی امی کو پسند نہیں تھی۔ خود وہ موقع پر موجود نہیں تھا۔ آئی نوری جہاں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ امی کے سامنے تو وہ فریاد نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اُن کی حالت اس قابل ہی نہیں تھی۔ آئی نوری جہاں سے بھی وہ کیا شکایت کرتا۔ کہ خود امی جو شندی کو اپنانے سے گریزاں تھیں تو کسی نہ کسی نے تو شندی کو اپناتا تھا۔ ہاں۔

شندی نے کیسے حامی بھری؟ یہ بات ضرور انوکھی تھی!

جبھی اُس دن فون پر رورہی تھی۔ نمبر پیچ کا بہانہ بنایا تھا، اکیلے پن کا بھی۔

مگر۔۔۔ رونا کوئی ایکسکیوز نہیں تھا!

غصے سے اُس کا چہرہ تہمتا اٹھا۔ آنکھیں غضبناک ہو گئیں۔

ہاتھ بڑھا کر اُس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”جی۔ شاندانہ بول رہی ہوں۔“ اُس طرف سے آواز آئی۔

”تم نے ابراہیم سے منگنی کر لی ہے؟“ وہ گرجا۔

”میں... میں...“ وہ اس اچانک وار کے لئے تیار نہیں تھی۔

”تمہیں اتنی جلدی تھی کہ میری واپسی کا انتظار بھی نہ کر سکیں۔“ اُس کی آواز میں دھاڑ تھی۔

”آپ... آپ میری بات تو سنیں...“

”میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ تمہیں بہت انوسٹ

سمجھا تھا۔“ I hate you—I simply hate you۔ اور کھٹاک سے

ریسیور کر ڈیل پر پٹخ دیا۔

شاداب چپ چاپ سہی سی بیٹھی تھی۔ اس قدر غیض و غضب میں اُس

نے یاد خان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
یاد خان بے کل تھا۔ نادانگی میں اگلیاں آپس میں پھنسا پھنسا کر
کھول رہا تھا۔

شاداب ابھی۔ اُس کے لئے پانی لے کر آئی۔

اس نے دو گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

”یاد بھائی۔ مگنی شادی... یہ تو سب قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔
اُس کی قسمت ابراہیم کے ساتھ ہوگی۔ آپ کی کہیں اور لکھی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس
سے بھی کوئی اچھی لڑکی آپ کی منتظر ہو...“

وہ خاموش تھا۔ اس وقت اُسے کچھ سوچھائی نہ دیتا تھا۔

لچ کے بعد شاداب امی کے پاس ہوسپٹل چلی گئی۔ اور نایاب اپنے
میاں اور بچوں کی خبر لینے اپنے گھر۔

یاد خان کا پل پل عذاب میں کٹ رہا تھا۔ اُس کی زندگی میں شاندا نہ
پہلی لڑکی تھی جس کے اُس نے باقاعدہ پنپنے دیکھے تھے۔ اُس کی دلکش باتیں دل
میں اتر گئی تھیں، اس کے شرمیلے انداز دھڑکنوں میں سما گئے تھے، اُس کی ہر ادا
سانسوں میں بس گئی تھی!

وہ تو اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ کہاں کہاں سے الگ کرتا
اُسے؟

جیسی تو اُسے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ امی پر بھی آیا تھا مگر۔ وہ ماں تھیں
اور ماں کے سامنے اُف کرتا اُسے گوارا نہ تھا!

اُسے آنٹی نور جہاں پر بھی رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کیسے تاک میں بیٹھی
تھی۔ جب دیکھا کہ امی شاندا نہ کے خلاف ہیں اُس کے لٹن سدھارتے ہی
بیٹے کی مگنی کر بیٹھیں۔ اور ابراہیم۔ ابراہیم تو اُسے شروع دن سے ہی زہر لگتا
تھا۔

پر۔ سب سے زیادہ براہم وہ شاندا نہ پر تھا۔ وہ حیران تھا کیسے اُس
نے اتنی آسانی سے ابراہیم کو قبول کر لیا۔ کیا اتنی مہلت بھی اُن سے نہیں لے سکتی
تھی کہ وہ لٹن سے واپس آ جاتا؟
بہر حال۔ شام کو خود جا کر وہ امی کو گھر لے آیا۔ شاداب بھی ساتھ
تھی۔

امی سے کچھ کہنے سننے کی منجائش نہیں تھی کہ اُنہیں مکمل آرام کی ضرورت
تھی۔ اور کسی بھی قسم کی پریشانی سے اُنہیں دور رکھنا تھا۔ اور پھر بات ہو بھی جاتی تو
حاصل کیا ہونا تھا؟ وہی سکے سو تیلے کا لالہ حاصل سلسلہ!

اگلے دن یاد خان نے امی کا E.T.T ٹسٹ کروایا۔ اللہ کے فضل سے
وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ مطمئن ہو کر دونوں گھر آ گئے۔

نایاب اور شاداب بھی آج امی کے گھر آئی تھیں۔ یاد خان اب بھی
بیقرار تھا۔ نایاب اور شاداب نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر تازہ تازہ لگا زخم
تھا۔ اتنی جلدی تو مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ تر وقت اُس نے دونوں بہنوں کے
بچوں کے ساتھ گزارا۔



صبح صبح ایئر پورٹ پر اترا۔ تو لگا اُس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ نہ اُسے گھر پہنچنے کی خوشی ہوئی، نہ ہسپتال کی۔ کہ نہ اُس کے پڑوس میں کوئی اُس کا منتظر تھا۔ اور نا ہی ہسپتال سے اُس کی آمد کی کوئی راہ دیکھ رہا تھا!

آج وہ باقی کوئیکز سے بھی نہیں ملا۔ سارا دن ہسپتال میں خود کو جیسے گھسیٹتا رہا۔ شام سات بجے بستی کے قریب پہنچا۔ مین روڈ سے دائیں ٹرن لیا۔ حسبِ عادی شیشہ قدرے وا کیا۔ پھولوں، باغوں اور جھرنوں کی خوشبوئیں بہت اداس تھیں۔ شبنم کی آنکھ نم نہی اور — نرم خرام ہوائیں ماتم کنناں!

اُس نے شیشہ بند کر دیا۔ اوپر جاتے ہوئے موڑ کاٹا۔ بستی کے گھر وندوں کے دیئے بجھے بجھے سے تھے۔ آسمان کے چراغ بے نور سے۔ اُس نے گہری سانس لی۔ درد تھا جس میں۔ کرب تھا جس میں۔ نگاہ اوپر شندی کی بالکنی پر گئی۔ کوئی نہیں تھا وہاں۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس نے آخری موڑ کاٹا۔ اپنے گیٹ پر جا کر کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں دیو مر رہ گئیں۔

وہیں شندی اپنے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ جانے کیوں کھڑی تھی؟ کیا اسی طرح ہوا کرے گا؟ وہ یوں اُسے نظر آتی رہے گی۔ تو بھول پائے گا وہ اُسے؟

نظریں واپس پھیرتے ہوئے اس نے گیٹ پر جمادیں۔ گیٹ کھلا۔ تو وہ اندر داخل ہو گیا۔ اوپر اپنے بیدروم میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے اور —

بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ شندی اب بھی حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے پاس کھڑی آج پہلی بار وہ اُسے اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ کسی اور کی ہوئی تھی نا!

نو۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ کیا کریگا؟ کیسے رہے گا اُس کے بغیر؟ اُس کا دل کسی کمسن lover کی طرح مچلا۔

تجبی حمید اُس کے لئے کوئی لے آیا۔ وہیں بالکنی میں ٹیبل پر رکھ گیا۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ خالی خالی نظروں سے سامنے تنک رہا تھا۔

’یاور خان اداس ہے بے نور سے تارے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پُرئم آنکھ لئے شبنم نے بھی سن لیا۔ چپکے سے رو دی!‘

وہ اور بھی اداس ہو گیا۔ جی میں آیا۔ اُس سے بات کرے۔ پوچھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اُس نے ابراہیم کو یاور خان پر کیوں ترجیح دی؟ سب

اُس کی عدم موجودگی میں کیوں ہوا؟ مگر پھر۔

خودداری آڑے آئی۔ یہ سب دریافت کرنا ایسے ہی تھا جیسے اسے اُس کی بہت پرواہ تھی۔ اور وہ اُس کی پرواہ اس لئے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کر کے اُس نے اُس کی انسلٹ کی تھی۔ اور اپنی انسلٹ وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا!

وقت نے بڑے بڑے گھاؤ بھرے تھے۔ اُس کا زخم بھی مندمل ہو جاتا! کوئی کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے وہ اندر کمرے میں آ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود نیچے جا کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر نادری کی طرف چل دیا۔ کچھ تو وقت کٹ جاتا!

رات دیر سے گھر لوٹا۔ تو آنٹی نور جہاں کا فون آ گیا۔

”بیٹے۔ میں نے تمہارے گھر پہنچ کر دیا تو تم نکل چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم ڈنر ہمارے ساتھ کر لیتے۔“ وہ شفقت سے بولیں۔

اُسے حیرت ہوئی۔ وہ تو یوں بات کر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ شاید اُن کی دانست میں سب ٹھیک تھا۔ کہ امی تو شائدانہ کو ویسے بھی نہیں اپنا رہی تھیں۔ سو اُنہوں نے اپنا لی۔

”تھینک یو آنٹی۔ بس میں اپنے ایک کولیگ کے یہاں چلا گیا تھا۔“ اُس نے بھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”ماں کیسی تھی تمہاری؟ نایاب اور شاداب۔ سب ٹھیک تو تھے نا؟“

”امی کو تھوڑی پراہلم ہو گئی تھی۔ مگر اب ٹھیک تھیں۔“ اُس نے مختصر اُمی کی پراہلم بتائی۔

”اوہ۔ شکر ہے خیریت گزری۔ میں کل فون کروں گی اُسے۔“

تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر فون کر دیا۔

آنٹی کی باتوں سے تو کسی عناد کی بو نہیں آ رہی تھی۔ پھر؟ شائدانہ نے

کیوں نہیں کہا کہ وہ یاور خان کے ساتھ Committed تھی اس لئے کسی اور کے ساتھ منگنی نہیں کر سکتی تھی؟ ایک بار پھر اُسے سارا غصہ شائدانہ پر آ گیا۔

اُس کی باتوں سے، اُس کی آنکھوں کی ہرجنبش سے، اُس کی ہر اداسے اُس کے لئے پیار پکپکتا تھا۔ پھر کیسے وہ اتنی جلدی سب پس پشت ڈال گئی؟ اُس کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا۔ اپنا غصہ اُس پر نکالنے کو۔ لیکن۔

پھر خود کو کنٹرول کر لیا۔ کہ اس کا یہی تو مطلب تھا کہ اُسے اُس کی پرواہ تھی۔ کبھی نہیں۔ نہیں کرے گا وہ اُس کی پرواہ!

اور پھر۔ وہ بھی تو اُسے فون کر سکتی تھی۔ وہ کیوں نہیں کر رہی تھی اُس کو فون؟

اوہ۔ اُسے فوراً خیال آیا۔ اب وہ ابراہیم کی امانت بن چکی تھی اور وہ اس امانت کی حفاظت کر رہی تھی۔ بہہ۔ ابراہیم!

رات دیر تک اُسے نیند نہیں آئی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اُس پر غصہ ہونے کے باوجود وہ اُسے یاد آ رہی تھی۔ وہ کب اُسے بھول پائے گا؟ کتنا عرصہ لگے گا؟ اور اب وہ وقت جلدی جلدی گزرنے کی تمنا کرنے لگا۔



موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ آسمان پر بگلہ سے سفید بادل منڈلا رہے تھے۔ نوخیز ہریالیوں میں قدرت سرگوشیاں کر رہی تھی اور۔۔۔

صبح بستہ شام گھر آئی تھی!

چھٹی کے بعد وہ گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ وائینڈنگ پتلی سڑک کے بائیں جانب آبادی اور چھوٹی چھوٹی ٹیرسڈ کھیتوں میں اُگی فصلیں، دائیں جانب ہری بھری پہاڑیاں اور اکاؤ کا گھر۔ پھر۔۔۔

وہ دائیں طرف بیچ صاحب کی پرائیویٹ روڈ پر مڑا۔

پچھلے چند دنوں سے شاندا نہ اُسے اپنی بالکنی میں نظر نہیں آتی تھی۔ جانے کیا وجہ تھی؟ بہر حال۔۔۔

وہ ویسی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ شاندا نہ کی بالکنی کے نیچے والی سڑک پر سے ہوتے ہوئے وہ گھوم کر سامنے آ گیا۔ گاڑی اپنے گیٹ کی طرف لے جانے لگا تو نظریں غیر ارادی طور پر شندی کے گھر کی طرف اٹھیں۔ اس وقت پھر پچھلے دروازے کے پاس شندی اور ابراہیم کھڑے تھے۔ ابراہیم اُسے ایک پکٹ تھمانے آگے بڑھاتا تھا۔ مگر جوں ہی شندی لینے کو ہاتھ بڑھاتی وہ پکٹ اپنے سر سے اوپر لے جاتا۔ شندی آگے بڑھنے سے جھجک کر رک جاتی۔ وہ پھر پکٹ اُس کی طرف بڑھاتا۔ پھر وہ لینے کو بڑھتی۔ پھر وہ پکٹ سر سے اونچا لے جاتا۔ پھر شندی رک جاتی۔۔۔ اس وقت واقعی اُس کا دل چاہا اپنے پستول کی ساری گولیاں ابراہیم کے سینے میں اتار دے۔ مگر۔۔۔

”ہہ۔۔۔“ اُس نے تلخی سے وہیل پر ہاتھ مارا۔ شندی اُس سے یہ اختیار چھین چکی تھی۔ کتنا بے بس ہو گیا تھا وہ!

جانے کیا سوچھی اُسے؟ گیٹ میں ہی میوہ خان سے ڈنر باہر کھانے کا کہا اور گاڑی واپس موڑ لی۔ دوبارہ نیچے مین روڈ پر آ گیا۔ اب پھر وہ شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ڈاکٹرز ہوسٹل میں اپنے دوستوں کے پاس۔

کیوں نہ وہ بھی ہوسٹل شفٹ ہو جائے؟ روز روز کے یہ سین تو نظر نہیں آئیں گے۔ اینٹنکی کا پچھلا دروازہ، شاندا نہ اور ابراہیم۔ پچھلا دروازہ، شاندا نہ اور ابراہیم۔ اپنے آگے، دائیں، بائیں۔ اُسے یہی کچھ نظر آنے لگا اور۔۔۔

گاڑی سامنے موڑ میں سے نکلتی گاڑی سے ٹکرا دی۔

اُسے ہوش آیا۔ تو وہ اپنے ہسپتال کے V.I.P روم میں تھا۔ بایاں بازو

فریچر ہونے کی وجہ سے اُس کی سرجری ہوئی تھی۔ جگہ جگہ زخموں پر ڈریسنگ ہوئی تھی اور ڈاکٹر نادر بھی اُس کے کمرے میں موجود تھا۔

"Damn it ... I'm telling you, I won't lie down on the bed." یاور خان نے جھنجھلاتے ہوئے ڈاکٹر نادر سے کہا۔
وہ مسکرا دیا۔

"سُر شکر کریں جان بچ گئی ہے۔ اتنا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے کہ ... دو چار دن تو بیڈ پر رہنا ہی پڑیگا۔"

"میں اکیلا نہیں رہوں گا۔ تم بھی میرے ساتھ رہو گے اسی کمرے میں۔" ہاتھ پاؤں سیدھے کئے چھت کو گھورتے وہ کیسے پڑا رہتا اتنے دن؟

"O kay. I'll convey your message to Dr. Nadia."

اور۔ اُس کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

بہت ساری چوٹوں کی وجہ سے اُس کی ہنسی بھی مضحکہ خیز پڑ گئی تھی۔

"میں نے جج صاحب کو اطلاع کر دی ہے آپ کے ایکسیڈنٹ کی۔" نادر نے اُسے مطلع کیا۔

"میرا خیال ہے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" اُس کی آواز بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

"سُر آپ کی گاڑی کو بھی وہاں سے اٹھواتا ہے۔ اور پھر وہ میاں بیوی آپ کے بزرگوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔" اُسے یاور خان اور جج صاحب کے فیملی Terms کا پتہ تھا۔

معا اُس کی نظروں میں ابراہیم، پھر شاندانہ اور پھر۔ ایکسیڈنٹ کا وقت گھومنے لگا۔

اُس نے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔ غالباً دواؤں کا اثر تھا۔ اُسے غنودگی آنے لگی۔

اُسے کمرے میں شفٹ ہوئے گھنٹہ بھر ہوا تھا۔ کہ آنٹی نور جہاں اور انکل ذوالفقار پہنچ گئے۔ دونوں دیر تک اُس کے پاس رہے۔ اُس کا ڈنر آیا۔ تو آنٹی نے اُس کا سر ہانا اونچا کیا نیکیے درست کئے، اور شفقت سے سوپ پلائی رہیں۔ انکل تو چلے گئے۔ مگر وہ باوجود یاور خان کے کہنے کے گھر نہیں گئیں۔ وہیں اُس کے پاس رہیں۔ ماں کی طرح اُس کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ اس دوران اُس کے دوست بھی آتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب اُس کا کولیک ڈاکٹر فیاض آ گیا۔ تو وہ گھر چلی آئیں۔

نور جہاں بانو نے رات کو ہی بہت سوچ بچار کے بعد نایاب کوفون پر یاور خان کے ایکسیڈنٹ کا بتا دیا تھا۔ تسلی بھی دی تھی کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ ایسہ بیگم کو بھی طریقہ سے بتا دینے کا کہہ دیا تھا۔ کہ ماں تھیں۔ کل کو اُن ہی سے گلہ کرتیں کہ انہیں اطلاع نہیں کی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اُن کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یاور خان کی ٹھیک ٹھاک کیئر ہو رہی تھی۔

صبح ہوئی تو نایاب نے فون پر ماں سے یاور خان کے ایکسیڈنٹ کا یوں ہی ساڈ کر کیا۔ کہ انہیں پتہ بھی چل جائے۔ اور گھبرا بھی نہ جائیں مگر۔

ایسہ بیگم کو تو ہول اٹھنے لگے۔ فوراً ایئر لائن فون کیا۔ خوش قسمتی سے ساڑھے نو بجے کی فلائیٹ میں سیٹ مل گئی۔ اور۔

دن کے گیارہ بجے ایئر پورٹ پر اترتے ہوئے سیدی ہو سٹل پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر نادر انہیں یاور خان کے کمرے میں لے آیا۔

"ہائے میرا بچہ۔" جگہ جگہ پٹیاں، کمزور چہرہ، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دیکھتے ہی وہ تو بچ کرے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

یاور خان نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ امی کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی حیرت بھی۔

”امی آپ کو کس نے بتایا؟ خواہ مخواہ تکلیف کی۔“ اُس نے کروٹ اُن کی طرف لینا چاہی مگر ابھی زخموں میں تکلیف خاصی تھی ایسا نہ کر سکا۔

”خواہ مخواہ تکلیف کی؟“ وہ رو رہی تھیں۔ پاس آ کر بستر کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے اُسے بے اختیار چومنے لگیں۔ ”اللہ تیرا شکر ہے میرے بچے کی جان بچ گئی۔ یا اللہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے مجھ پر۔ اسے کچھ ہو جاتا تو میں تو جیتے جی مر جاتی۔۔۔“ اُن کے آنسو اتار سے بہہ رہے تھے۔

”امی پلیز! میں ٹھیک ہوں... آپ ان سے پوچھ لیں۔“ اُس کا اشارہ ڈاکٹر نادر کی طرف تھا۔

”آئی! یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ سرسری زخم آئے ہیں۔ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”ارے بیٹا۔ بازو میں فریکچر ہے اتنے سارے زخم ہیں تیرا بخار ہے۔ ٹھیک کیسے ہے؟“ وہ برابر رو رہی تھیں۔

”ان کو دوا دی ہے۔ بخار ابھی اتر جائے گا۔ پھر یہ ٹھیک ٹھاک نظر آئیں گے۔“ ڈاکٹر نادر مسکراتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ امی کے لئے چائے...“ یاور خان نے ڈاکٹر نادر سے کہا۔

”ہاں سر۔“ ڈاکٹر نادر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور امی اکیلے میں اور زیادہ رو دیں۔

یاور خان پریشان سا اُنہیں دیکھا رہا۔ اُٹھ کر اُنہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

امی دل کا بھڑاس نکال چکیں تو انہیں۔ کرسی اٹھا کر اُس کے قریب رکھی اور اُس پر بیٹھ گئیں۔

غور سے ایک بار پھر اُس کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ آنکھ کے اوپر ماتھے پر

بھی سچر آئے تھے۔ چہرہ کس قدر زرد اور آنکھوں کے نیچے حلقے کتنے نمایاں تھے۔ لگتا تھا بہت خون نکل گیا تھا۔

وہ اُس کے چہرے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ کہیں اُسے کچھ ہو جاتا تو؟ وہ کانپ کر رہ گئیں!

”امی۔“

”جی بیٹا۔“

”آپ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں نا؟“ اس وقت وہ بھی جذباتی ہونے لگا۔ اُسے معلوم تھا وہ اُس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ پھر کیوں اُس کی خواہش پوری نہیں کی تھی؟

”میری جان۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ اُنہوں نے اُس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بوسہ دیا۔

وہ چند ہل خاموش رہا۔

”میں دکھی ہوتا ہوں تو آپ بھی دکھی ہوتی ہیں نا؟“ وہ پھر بولا۔

”تم دکھی ہو گے تو میری جان چلی جائے گی۔“ وہ بار بار اُس کا ہاتھ چوم رہی تھیں۔

”امی۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آ جاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے میرے لئے منگوا دیتی تھیں... جب میں چھوٹا تھا۔ تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ

رات گئے میلوں گاڑی بھاگا کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر...“

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی۔ شکوے تھے، شکایتیں تھیں!

وہ جیسے کچھ کچھ سمجھنے لگیں۔

”مگر کیا؟ میری جان۔“ وہ بہت شفقت سے بولیں۔

”مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں...“

ایسہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔

معا... دروازہ کھلا۔ اور وارڈ بوائے اُن کے لئے چائے لیکر آ گیا۔
دوے پریشانی کے اُنہوں نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ اسی طرح چل پڑی تھیں
ایک کپ چائے کی اس وقت اُنہیں واقعی طلب ہو رہی تھی۔

امی سارا دن اُس کے پاس رہیں۔ شام چار بجے نور جہاں بانو اور
براہیم آ گئے۔ اُس کے دلی جذبات سے بے خبر براہیم نے یاور خان سے ہاتھ
ملا لیا۔ خیریت دریافت کی اور۔

یاور خان کو ایک مختصر خواہش ہوئی۔ بس اُس کی گردن مروڑ کر اُس کا
رخ دوسری طرف کر دے کہ اُس کی منحوس شکل نظر نہ آئے!

نور جہاں بانو کے اصرار پر ایسہ بیگم گھر چلی گئیں۔ خود نور جہاں بانو نے
اُن کی جگہ سنبھال لی۔ رات کو ایسہ بیگم نے دوبارہ آنا تھا۔ مگر یہ فیصلہ یاور خان پر
چھوڑا گیا کہ رات کو امی اُس کے پاس رہیں یا نرس کافی تھی۔ کہ بقول یاور خان
امی کے لئے آج کی Exertion ہی کافی تھی!

ایسہ بیگم گھر آ گئیں۔ اوپر اپنے کمرے میں گئیں۔ نہادھو کر کپڑے
تبدیل کئے۔ حمید سے چائے لانے کا کہا اور۔ باہر کھلے ٹیریس میں آ کر ریٹنگ
کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کراچی میں ان دنوں زبردست جس ہو رہی تھی مگر۔ یہاں واقعی
جنت کا سماں تھا۔

جج صاحب کا گاؤں قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ اونچی نیچی ہری بھری
پہاڑیاں، اوپر تلے کچے پکے گھروندے، گنگنا تے جھرنے، بل کھاتی گڈھنڈیاں،
سیاہ گھٹائیں، بارش کی پھواریں یا پھر بادلوں سے آنکھ بھولی کھیلتا سورج!

اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا راج تھا۔ اور بارش اب برسی کہ اب!
یاور خان کو رم جھم پڑتی پھواریں بہت اچھی لگتی تھیں، سورج اور بادلوں

کے دھوپ چھاؤں کا کھیل بہت پسند تھا...

’امی۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آ جاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے
میرے لئے منگوا دیتی تھیں...‘ یاور خان کی صبح کبھی بات اُن کے کانوں میں
کوئی۔

اُس کی پسند کے عین مطابق یہاں سے کچھ فاصلے پر پہاڑی کی چوٹی پر
گھر بنانے کے لئے پلاٹ اُنہوں نے ہی تو یاور خان کے لئے خریدا تھا۔
’جب میں چھوٹا تھا تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ رات گئے میلوں
گاڑی بھاگ کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر۔‘

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی۔ شکوے تھے، شکایتیں تھیں!
وہ کچھ کچھ سمجھنے لگی تھیں۔ اُس کا اشارہ نفسیہ کی بیٹی کی طرف تھا۔
’مگر کیا؟ میری جان۔‘ اُنہوں نے کہا تھا۔

’مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں...‘
ایسہ بیگم کا دل اب بھی کٹ کر رہ گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُن کا لاڈلا،
اکھوتا یاور۔ زندگی میں پہلی بار اُن سے شکوہ کیا تھا۔ بہت تکلیف میں تھا تا، دل
کی بات زبان پر آ گئی تھی۔ ورنہ تو اتنا عرصہ تو اُف تک نہیں کی تھی۔ نایاب اور
شاداب ہر بات صاف کہہ دیتی تھیں۔ مگر یاور، اُن کی جان، بہت صابر تھا۔ آج
جسمانی تکلیف حد سے بڑھ گئی تو زبان پر بھی شکایت آ گئی!

اُن کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ غصے کی تو وہ سخت تھیں وہ مانتی تھیں مگر۔ ایک
بے مثال ماں بھی تو تھیں۔ آج اُف کی جان کو تکلیف تھی۔ روح کو کیسے قرار
آ گیا؟

معا۔ دائیں جانب کچھ آہٹ سی ہوئی۔

اُنہوں نے دیکھا۔ اینٹکی سے دو چار گز پرے مسٹرڈ رنگ کے کپڑوں
میں ملبوس اُن کی طرف پیٹھ کئے ایک لڑکی تار پر سے کپڑے اتار رہی تھی۔

ک... کہیں... یہی تو نفسیہ کی بیٹی نہیں تھی؟ جانے کیوں وہ عینک

درست کرتے ہوئے غور سے اُسے دیکھنے لگیں۔ آج پہلی بار وہ بغیر کسی عداوت کے اُس کو دیکھ رہی تھیں۔

کپڑے بازو پر ڈال۔ اُس نے رخ موڑا۔

لباقد، نہایت متناسب جسم، پرکشش نقوش، بڑی بڑی حسین آنکھیں اور بہت خوبصورت بال۔

ارد گرد سے بے خبر وہ ایٹکسی کے پچھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔

یہ شکل تو بہت جانی پہچانی سی تھی۔ غیر نہیں لگ رہی تھی بالکل بھی!

تبھی۔ حمید چائے لے آیا۔ ساتھ میں بسکٹ بھی۔

سوچوں میں گم۔ وہ دھیرے دھیرے چائے پیتی رہیں۔

مغرب کی اذان ہوئی۔ تو انہوں نے وہیں ٹیریس میں نماز پڑھ لی۔

دیر تک شکرانے کے نفل پڑھتی رہیں۔ اللہ کے حضور شکر کر کے روتی رہیں،

گزر گزاتی رہیں۔ کہ خدا نخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ راستے میں انہوں نے اُس کی

ابھی بھی وہیں پڑی چکنا چور گاڑی دیکھ لی تھی۔ جس میں سے اُس کا زندہ بچ لکنا

کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ جائے نماز تہہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئیں۔

رات ڈنر کے بعد دوبارہ یاور خان کے پاس چلی گئیں۔ گھر میں قرا رہی

نہیں آ رہا تھا۔

پھر۔ یاور خان کے منع کرنے کے باوجود رات وہیں صوفے پر پڑ

رہیں۔



ایسہ نیگم فجر کی نماز کے لئے انھیں تو سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ زبردست قلو

ہوا ہوا تھا۔ کل شام دیر تک کھلے ٹیریس میں بیٹھی رہی تھیں۔ ٹھنڈ لگ گئی تھی۔

نماز پڑھنے کے بعد دیر تک جائے نماز پر بیٹھیں آیات شفا پڑھ پڑھ کر

بے خبر سوئے یاور خان پر دم کرتی رہیں۔

پھر انھیں۔ اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی۔ گرم گرم پی لی تو طبیعت

قدرے بحال ہو گئی۔ دوبارہ بستر میں لیٹ گئیں۔

آنکھ بچ رہے تھے۔ ہوسٹل کا عملہ حرکت میں آ چکا تھا۔ یاور خان کی بھی

آنکھ کھل گئی۔ امی کو دیکھا تو چونک اٹھا۔ اتنی دیر تک وہ کبھی بستر میں نہیں رہتی تھیں۔

”امی۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ قلو ہو گیا ذرا۔ چائے پی لی ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ شمال سے منہ ڈھانپتے ہوئے بولیں۔

اُنہیں معلوم تھا۔ کوئی اور ان سے قلو لے نہ لے، یا اور خان کے تو جیسے پیچھے قلو بھاگتی تھی۔

”امی۔ بیمار کر دیا نا خود کو۔ صوفے پر لیٹیں الگ بے آرام ہو رہی ہیں۔ پلیز گھر چلیں۔“

”مجھے چھوڑو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے جان؟“ وہ بستر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

پاس نہیں آ رہی تھیں کہ۔ اُنہیں ڈرتا وہ اُن سے قلو کچھ کر لیتا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس آپ گھر چلیں۔ میوہ خان ادھر ہی ہے۔ آپ کو لے جائے گا۔“

ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے سائیڈ ٹیبل پر سے اپنا سیل فون اٹھایا۔ اور میوہ خان کو اوپر بلا لیا۔

پیڈ پر کچھ دوائیاں لکھیں۔ میوہ خان کو نسخہ پکڑایا اور۔ امی کو دوائیاں سمجھاتے ہوئے اُس کے ساتھ گھر روانہ کر دیا۔

ایسہ بیگم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ کہ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں تھا۔ اوپر سے قلو بھی ہو جاتا۔ تو اور مشکل ہو جاتی۔

ایسہ بیگم اور میوہ خان گھر کے لئے رواں دواں تھے۔ ایک Mitsubishi کار آگے آگے جا رہی تھی۔ نہ راستہ دے رہی تھی، نہ سپیڈ کر رہی تھی۔

”بیگم صاحبہ میں نے مسابیش چلائی ہے۔ بہت شاندار گاڑی ہے۔...“ وہ اپنے آگے چلتی مسابیشی کو دیکھتے دیکھتے گویا ہوا۔

اور۔۔۔ مسابیشی کو مسابیش کہتے سن کر ایسہ بیگم نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

وہ اسی طرح کچھ کا کچھ بنا کر بول لیتا تھا۔

”ہاں ہے تو۔ اچھا سنو۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ شمیم کو ہسپتال لیجا کر چیک اپ کرواؤ۔ کروایا تم نے؟“ انہوں نے میوہ خان سے پوچھا۔

ابھی چند روز قبل ہی میوہ خان نے فون پر ایسہ بیگم کو خوشخبری سنائی تھی کہ اُن کی بہو، یعنی میوہ خان کی بیوی اُمید سے تھی۔ اور انہوں نے اُسی وقت اُسے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اُس کا باقاعدہ چیک اپ کرواتا رہے۔ تاکہ آگے جا کر کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔

میوہ خان شرمایا۔ فوراً منظر سے چہرہ چھپالیا۔

”جی بیگم صاحبہ۔“

”سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟“

”جی بیگم صاحبہ۔ اور۔ آپ کو پتہ ہے آپ کی بہو کیا کہتی ہے؟“

”کیا کہتی ہے؟“

”ٹی وی میں اشتہار دیکھ دیکھ کر کہتی ہے کہ ایسے ہی ڈپرینج کے لئے لانے ہوں گے۔...“

ڈپر۔ ایک پل کو ایسہ بیگم نے سوچا۔ اور پھر بے اختیار ہنس دیں۔ گاڑی چلاتے چلاتے اُس کا بھی بس دھیان کبھی گاڑیوں میں اور کبھی گاڑیوں کے گُل پرزوں میں انکار ہوتا تھا۔

”ڈپر نہیں۔ ڈایپر۔ بیوقوف۔...“ اُن کے لب و لہجے میں اُس کے لئے شفقت تھی۔

”بس بیگم صاحبہ۔ بہت دل چاہتا ہے کہ انگریزی بولوں۔ لیکن کیا کروں آتی جو نہیں ہے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب کیا انگریزی بولتے ہیں۔ بہت زبردست لگتے ہیں۔ اُس وقت۔ ویسے بھی ہمارے صاحب کی پرس... تل... ٹ بہت شاندار ہے...“

’پرسنٹی‘ کو کیا جوڑ جوڑ کر آخر میں ہی غائب کر دی تھی۔ انہیں پھر ہنسی آگئی۔

”آتی ہے یا نہیں۔ مطلب تو سمجھا لیتے ہوتا۔ یہی کیا کم ہے۔“ وہ ہنستے ہنستے بولیں۔

”اس طرح تو مجھے بے شمار لفظ آتے ہیں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”شیم کے ساتھ ہر وقت بولتا رہتا ہوں۔“

”اچھا؟“

یوں ہی باتیں کرتے وہ ہستی پہنچ گئے۔ میوہ خان اوپر ہی اوپر بڑھ رہا تھا۔ آخری موڑ کاٹا۔ تو ایسہ بیگم کی نظریں سیدھی شدی کی اینٹکی پر گئیں۔ وہیں اینٹکی کے باہر شدی زمین پر بیٹھی ایک چھوٹے سے مینے کی پیٹھ پیار سے سہلا رہی تھی۔ اور۔ ابراہیم پاس کھڑا اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ ایسہ بیگم کو ابراہیم، اور اُس کا شدی کو دیکھ دیکھ کر مسکرانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔

اچانک جیسے شدی انہیں اپنی سی اور وہ غیر لگنے لگا۔

”یہ دیکھو۔ یہ مشنڈا یہاں کیا کر رہا ہے؟ دن دھاڑے جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا ہے۔“

میوہ خان کی بھی بانیں جانب اُن دونوں پر نظر گئی تھی۔ مگر فوراً ہی رخ واپس موڑ لیا تھا۔

قدرے آگے بڑھتے ہوئے وہ گاڑی گیٹ کے اندر لے گیا۔

”یہ پہلے بھی آیا ہے اس طرح اس کے پاس؟“ وہ گاڑی سے اترتے اترتے جیسے کچھ تشویش سے پوچھنے لگیں۔

وہ تو اکثر آتا رہتا تھا۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی!

”آنے دیں بیگم صاحبہ۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں...“

”ارے کیسے آنے دوں۔“ وہ اُس کی اُن سنی کرتے ہوئے قدرے

تیزی سے کہنے لگیں۔ ”کیسے فکر نہ کروں...“

تجھی۔ اُن کا سیل بج اٹھا۔

کان سے لگائے لگائے وہ اندر کی طرف بڑھیں۔ نایاب کا فون تھا۔

بھائی کی خیریت ہو سہیل میں تو پوچھ چکی تھی۔ اب اُن سے تفصیلاً بات کرنا چاہتی تھی۔

”ابھی ابھی ہو سہیل سے آرہی ہوں۔ اوپر بیڈروم میں جاتی ہوں۔ تم

بند کرو۔ بستر میں لیٹ کر میں خود فون کرتی ہوں۔ دراصل فلو ہو گیا ہے مجھے۔

سارے جسم میں درد ہو رہا ہے...“

نایاب نے فون بند کر دیا۔ ایسہ بیگم کچن میں حمید کو اپنے اور میوہ خان

کے لئے ناشتے کا کہتے ہوئے اوپر چلی گئیں۔ کچھ کھالیتیں تو دوائی بھی لے لیتیں۔

بستر میں لیٹیں تو قدرے آرام آنے لگا۔

پھر نایاب کو فون ملایا۔ اور سارا حال احوال بتا دیا۔

حمید اُن کے لئے ناشتہ لایا۔ میوہ خان نے دوائیاں دیں۔ اور ایسہ بیگم

سرمنہ لپیٹ کر پڑ ہیں۔

آدھے گھنٹے بعد ہی آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگیں۔ جسم کا درد معدوم

ہونے لگا۔ اور طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

آہستہ سے بستر سے اٹھیں۔ الماری سے کلام پاک نکالا اور تلاوت

کرنے لگیں۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔ خنکی بڑھ رہی تھی اور۔۔۔ سیندوری شام فسون گر وادی کو اپنے سیندور میں رنگ رہی تھی۔

اپنی بالکنی میں کھڑی شندی یا در خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب سے اُس کے ایکسیڈنٹ کا سنا تھا۔ بیقرار تھی۔ بہت دل چاہتا تھا اُس کی خیریت معلوم کرنے کو۔ کہ باقی باتیں ایک طرف، وہ اُس کا کزن بھی تو تھا لیکن۔ ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک تو اُس کے غصے سے خائف تھی، دوسرے۔۔۔ اُس کی آواز سن کر یادوں نے مزید یلغار کر دینی تھی۔

بھولی تو وہ اُس کو ایک پل بھی نہیں تھی۔ سانس لینا کیسے بھول جاتی وہ؟ اُس کو تو اُس نے زندگی مان لیا تھا!

گہری سانس لیتی وہ کمرے سے کچن میں آگئی۔ وہیں مامارات کا کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”ماما۔“

”جی بیٹا۔“

”ماما... وہ... ڈاکٹر صاحب کی خیریت تو پوچھنی چاہئے۔“ وہ کچھ جھجکتی

سی بولی۔

”صبح سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں... لیکن پھر خیال آتا ہے۔

آگے سے پتہ نہیں کیا جواب دیں۔“

”نہیں۔ آپ کے ساتھ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ میں جانتی ہوں

انہیں...“ کہتے کہتے وہ اداس سی نظر آنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ میں فون کرتی ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ دھوئے، تو لیے

سے خشک کئے۔ اور کچن سے باہر نکل آئیں۔

شندی کی نظر کچن کی کھڑکی سے باہر مئی۔ نور محمد کی بھیڑ کا منہ سا سفید سفید

بچہ اُس طرف آ نکلا تھا۔

بڈیوں کی چہرتی سردی کی شدت کم پڑتے ہی جہاں بستی کے مکینوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہاں اُن کی بھیڑ بکریوں نے بھی آس پاس چہا شروع کر دیا تھا۔

شندی کو بھیڑ بکریوں کے یہ ننھے۔ منے بچے بے حد پیارے لگتے تھے۔ لپک کر کچن سے نکلتے ہوئے کوریڈور میں سے ہوتی پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔

پاس جا کر روٹی کے گالوں جیسے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اور پیار کرنے لگی۔ معا۔ اُس کی نظر میوہ خان کے گھر سے نکلتے ہوئے اوپر آتیں ایسہ بیگم پر پڑی۔ میوہ خان بھی پیچھے پیچھے تھا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ کہ شندی کسی کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ پہلے تو جی میں آیا، بھاگ کر اندر گھر چلی جائے۔ مگر۔۔۔ پھر خیال آیا کہ وہ تو صرف چند قدم کے فاصلے پر تھیں۔ اُسے دیکھ بھی رہی تھیں۔ ساتھ میں میوہ خان بھی تھا۔ اچانک اندر چل پڑتی تو کیسا لگتا؟

تجھی اُس نے ارادہ بدل دیا۔ وہیں کھڑی رہ گئی۔ ایسہ بیگم ہانپتی کانپتی۔ اُس کو ہی نکلتی چلی آ رہی تھیں۔

شندی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اُن کے چہرے پر ناگواری، بیزاری یا غصہ کہیں نہیں تھا۔ بلکہ۔۔۔ کچھ نرمی سی تھی، شفقت سی تھی۔

بالکل قریب آئیں۔ تو ایک تو اُن کی عمر، دوسرے اتنا نزدیک۔ اُس نے انہیں مودب طریقے سے سلام کیا۔

پھولی سانسوں کے درمیان وہ قدرے رکیں۔ ”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو...“ ایک نظر بغور اُسے دیکھتیں و ملاحت سے بولیں، اور پھر۔

آگے بڑھ گئیں۔

شندی کی آنکھیں بالکل اُن کے ابا جان کے جیسے تھیں۔ گرے بلو، بڑی بڑی اور بہت خوبصورت!

ایسہ بیگم اور میوہ خان آگے بڑھے ہی تھے۔ کہ نیچے سے شارٹ کٹ کرتا ابراہیم اوپر آتا دکھائی دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ شندی کے پاس جا پہنچا۔

ایسہ بیگم رخ موڑ کر اُسے دیکھنے لگیں۔

”میوہ خان۔ یہ لڑکا باؤلا ہوا ہے۔ شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔

اور یہ جوان جہان لڑکی کے پاس کھڑا ہے۔“

میوہ خان کو ہنسی آگئی۔ کبھی ’دن دھاڑے‘ پر اعتراض، کبھی ’شام کے سایوں‘ پر خفگی!

”آپ فکر مند نہ ہوں بیگم صاحبہ۔“ میوہ خان کو صرف اتنا علم تھا کہ

شندی یا ورخان کی کوئی رشتہ دار تھی اور بس۔ ”دونوں کی منگنی بھی تو ہوئی ہے۔“

بات پکی ہونے کے بعد وہ بھی شام ڈھلے ندی کنارے شمیم کی راہ نکالتا تھا۔

”ارے چپ۔“ رخ واپس موڑتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگیں۔

”منگنی ہی ہوئی ہے۔ کوئی نکاح تو نہیں ہوتا۔“

جبکہ۔ شاداب کی منگنی کے بعد جواد جب بھی آتا تھا۔ شاداب سے

بات کئے بنا واپس نہیں جاتا تھا۔ شندی کے بارے میں پتہ نہیں کیوں؟ وہ بہت حساس ہو گئی تھیں!

نہلے پر دہلا۔ نور جہاں بانو بہ نفس نفیس دونوں ہاتھوں میں ایک ڈش تھامے، ڈھلان چڑھتیں، دائیں باتیں ڈولتیں، اُن کے سامنے آنمو دار ہوئیں۔

”ٹہلنے لگی تھی؟“ نور جہاں بانو رکتے ہوئے بے ترتیب سانسوں کے

درمیان بولیں۔

”نہیں۔ میوہ خان کے گھر گئی تھی۔ اور تم کہاں جا رہی ہو؟“

”شاندا نہ کو بریانی دینے جا رہی ہوں۔“ وہ خوش خوش بولیں۔

”نوکر نہیں ہے کیا؟“ اُنہوں نے جیسے جل کر کہا۔

”ہے۔ لیکن۔“ وہ ہنس دیں۔ ”دل کرتا ہے خود دے آؤں جا کر۔“

”ہوں۔“ اُنہوں نے کہا اور۔

آگے بڑھ گئیں۔

”دل کرتا ہے خود دے آؤں۔“ اُنہوں نے نور جہاں بانو کے الفاظ

دہرائے۔ ”خواہ مخواہ باجھیں کھلی جا رہی ہیں۔ حیرت ہے بیٹا اور ماں دونوں

واری جا رہے ہیں۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھیں۔

”یہ ابراہیم واپس کب جا رہا ہے؟“ وہ ایک بار پھر گویا ہوئیں۔

انجانے میں وہ جیسے اُس سے نجات کی خواہاں تھیں۔

”جج صاحبہ کراچی گئے ہیں۔ واپس آئیں گے تو ابراہیم صاحب لندن

جائیں گے۔ جج صاحبہ وہاں ایک شادی پر بھی جائیں گے۔ اُس کے بعد ہی

واپس آئیں گے۔“

”ہوں۔“ ”ہوں“ کو لمبا کھینچتے ہوئے۔ وہ اپنے گھر کے دروازے

میں داخل ہو گئیں۔

”بیگم صاحبہ۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے سوپ جلدی بنائیں۔ پہنچانا بھی

ہے۔“ میوہ خان نے یاد دہانی کرائی۔

لاکھ ہسپتال میں یادور خان کی خاطر میں ہو رہی تھیں۔ مگر سوپ ایسہ بیگم

نے ہی بنا کر بھجوانا تھا۔

تھوڑا دم لینے کے بعد وہ کچن میں آ گئیں۔ یادور خان کے لئے سوپ

بنانے!

شام گہری ہونے لگی۔ تو ابراہیم سے معذرت کرتے ہوئے شندی اندر

آگئی۔

”ماما۔ بات کر لی ڈاکٹر صاحب سے؟“ وہ کچن کے دروازے میں سے

جھانکی۔

”ہاں بیٹا۔ کہتے تھے بہتر محسوس کر رہے ہیں اب...“

”ہوں۔ وہ... آپ کو ڈر تھا کہ ٹھیک سے بولیں گے نہیں...“

”نہیں نہیں بیٹا۔ وہی پہلے کی سی نرمی تھی انداز میں۔ کہتے تھے بہت

مشکور ہیں میرے پوچھنے کے۔“

شندی کے بارے میں تو ظاہر ہے کیوں پوچھا ہوگا؟ افسردہ سی سانس

لیتی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

معا۔ اُس کا لینڈ لائن بج اٹھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس نے ریسپور

اٹھالیا۔

”کون بول رہا ہے؟“ وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

”سرفراز۔ سرفراز جہانگیر۔“

شندی کا رنگ فق ہو گیا۔ فوراً ریسپور واپس رکھ دیا۔

ایک بار پھر رنگ آئی۔ مگر اُس نے نہیں اٹھایا۔

دھک دھک کرتا اُس کا دل جیسے پنجر توڑ کر باہر آنے لگا تھا۔ پھر۔ اُسے

کوئی ہوش نہیں رہا۔ کھڑے قد سے قالین پر گر گئی۔

دھڑام کی سی آواز سن کر ماما بھاگی آئیں۔

شندی کو قالین پر بے سدھ پڑے دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”شندی بیٹا... شندی بیٹا...“

”یا اللہ۔ کس کو بلاؤں؟ کیا کروں؟“

کہ پہلے تو یادور خان ہوتا تھا۔ جی جان سے آجاتا تھا۔ اب تو وہ خود

ہوسپٹل میں تھا۔ اور پھر شندی کی متغنی کے بعد اب پتہ نہیں آتا بھی یا نہیں؟

وہ بھاگیں نور محمد کی طرف۔ اُسے نور جہاں بانو کی طرف دوڑایا۔ خود

شندی کے پاس آگئیں۔

”بھئی۔ شندی نے خود ہی آنکھیں کھول دیں۔

”کیا ہوا تھا بیٹا؟“ آنکھوں میں آنسو لئے وہ اُس پر جھک آئیں۔

شندی آہستہ سے اٹھتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔

”ماما... سرفراز نے فون کیا تھا۔“

”ک... کون سرفراز؟“ ماما کے کانٹو لوٹو نہیں تھا بدن میں۔

”انکل جہانگیر کا بیٹا۔“

”مگر... اُسے یہاں کا نمبر کیسے پتہ چلا؟“

”یہی تو میں حیران ہوں۔ اس کا مطلب ہے اُس کو یہ بھی معلوم ہے کہ

میں یہاں رہ رہی ہوں۔“

”ہاں لگتا ہے سب پتہ ہے۔ اللہ خیر کرے...“

دفعۃً نور جہاں بانو ماما کو پکارتیں اندر داخل ہوئیں۔

”شندی بی بی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سخت کمزوری ہو رہی تھی۔

میں نے نور محمد کو آپ کی طرف بھیج دیا۔ کہ شندی بی بی کو تھوڑی تسلی ہو جائے گی۔“

وہ اصل واقعہ گول کر گئیں۔

”آپ انرجائیل بنا کر لائیں شندی کے لئے۔ میں بیٹھتی ہوں اس کے

پاس۔“

وہ شندی کو وہاں سے اٹھا کر بستر پر لے آئیں۔ زبردستی لٹایا۔ خود بھی

پاس بیٹھ گئیں۔

”بیٹا تم بہت کم کھانا کھاتی ہو۔ اچھی طرح کھایا پیا کرو۔ اپنی صحت کا

خیال رکھا کرو۔ میں چند دن تمہیں ویسی مرغی کا سوپ پلاؤں گی۔ کمزوری جاتی

رہے گی...“ وہ شفقت سے اُس کا ماتھا سہلاتیں کہہ رہی تھیں۔

پھر۔ اُسے انزجائیل پلایا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔
 شندی کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی۔ تو گھر چل دیں۔
 شندی سے رات کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ طرح طرح کے وسوسے دل
 میں سر اٹھا رہے تھے۔ ماما اپنا بستر اُس کے کمرے میں لا کر پڑ رہی تھیں۔ شندی
 سوچ رہی تھی۔ کہ کل ابراہیم سے بات کرے گی۔ جبکہ۔ ماما کا کہنا تھا کہ اگر
 سرفراز کا فون دوبارہ آیا تو وہ یا درخان کے آگے رکھیں گی سارا معاملہ!



یا درخان۔ صحت یاب ہو چکا تھا۔ روئین پھر سے بحال ہو گیا تھا۔
 آج پھر چھٹی کے بعد گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔
 شام گھر آئی تھی۔ ٹھنڈا تر آئی تھی اور۔ یہ بڑا چاند جھانکنے لگا تھا۔
 وہ آج بھی اداس تھا۔ آج بھی بے کل تھا۔ آج بھی سوچوں میں گم تھا۔
 بہتری کو شش کر رہا تھا۔ کہ شندی کی یاد دل سے نکال پھینکے۔ اُس نے
 اُس کے ساتھ بیوفائی کی تھی، اُس کی محبت کی توہین کی تھی مگر۔
 جانے کیا تھا؟ جتنی کوشش کرتا اُسے بھول جانے کی، اُس سے کہیں

اتنی کے ساتھ ٹیریس پر بیٹھ کر کوئی پیتے ہوئے وہ کپ شپ کرنے لگا۔ تو دھیان بٹ گیا۔ طبیعت مل گئی۔

رات ڈنر پر امی نے اُس کا پسندیدہ مٹن پلاؤ پکایا تھا۔ کھیر بھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ امی کو اُن کے کمرے تک لایا۔ بالکنی کے پردے برابر کئے، اُن کی دوائیاں اور جگ میں پانی چیک کیا۔ اور — ’شب بخیر‘ کہتا اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔

حسب معمول وہ چند لمبے لمبے بالکنی میں آ گیا۔

چاروں اور مکمل سکوت تھا۔ گہرا سناٹا، اور — پورا چاند! ہر سو پھیلی دودھیا چاندنی میں اُس نے دیکھا۔ بائیں جانب درخت سے ٹیک لگائے کھڑی شندی شاید چاند اور چاندنی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ اندر آ گیا۔ ڈریسنگ روم گیا، کپڑے تبدیل کر کے ٹائیٹ سوٹ پہنا، صوفے پر آ کر بیٹھا اور — دنوں بعد رات گئے تک ٹی وی دیکھتا رہا۔ سونے کے لئے بستر پر لیٹا، آنکھیں موندیں مگر — نیند نہیں آرہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے Sleeping pill لے لی۔ کہ وہ خالی ذہن نہیں رہنا چاہتا تھا!

شندی بھی اندر چلی گئی۔ آج رات کا کھانا لیٹ تھا۔ ماما بقول اُن کے ایک خاص ڈش تیار کر رہی تھیں جس میں خاصا وقت لگنا تھا۔ بہر حال — کھانا میز پر لگ چکا۔ تو دونوں مل کر کھانا کھانے لگیں۔

”بیٹا۔ ابراہیم صاحب سے بات کی تم نے سرفراز کے فون کے بارے میں“۔ ماما نے باتوں کے دوران پوچھا۔

”ہاں ماما... ابھی شام کو ہی کی ہے لیکن...“ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”کر لی بات؟“

زیادہ ور آتی وہ یادوں میں!

اُس کی باتوں کی مدھرتا اُس کے کانوں میں رس گھولتی، اُس کی ہنسی کی کوہلا اُسے مسحور کرتی، اُس کی چھیڑ چھاڑ کی چچھلا اُسے مدھوش کرتی! وہ تو دیوانہ تھا اُس کی ہر ادا کا۔ کیسے بھول پائے گا اُسے؟ گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے بہتی کے اوپر کا موڑ کاٹا۔ اپنے گھر کے ساتھ ساتھ حج صاحب اور شندی کے گھر بھی نظر آنے لگے۔

اس وقت پھر ابراہیم شندی کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ اچانک شندی نے جانے کیا کیا؟ ابراہیم کا فلک شکاف قہقہہ بلند ہوا۔ اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے پچھلتا سیسہ انڈیل دیا۔ تو — آج اپنی چچھلا سے شندی ابراہیم کو محظوظ کر رہی تھی! کتنی آسانی سے اپنے جلوے ابراہیم کے نام کر دیئے تھے! اُسے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ اپنی بے لوث محبت کی توہین!

اور — یہیں اُس نے فیصلہ کر لیا۔ اب وہ اُسے یاد نہیں کرے گا۔ نوج کر پھینک دیگا اُس کی یادوں کو۔ اتنا کمزور نہیں تھا وہ۔ اگر آج تک اُسے چاہتا آیا تھا، تو اس یقین کے ساتھ کہ وہ بھی اب تک اُسے چاہتی تھی۔ مگر — جس جوش سے ابراہیم کا قہقہہ گونجا تھا۔ کیا صاف نہیں بتا رہا تھا کہ اُس کی یہ خوشی شندی کی کسی خوش کن حرکت کا ہی نتیجہ تھی؟ وہ اُسے خوش کر رہی تھی اور وہ —

خوش ہو رہا تھا!

کبھی نہیں۔ اب وہ اُس کو اور یاد نہیں کرے گا۔ اُس کا فیصلہ اٹل تھا!

گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ اپنے گیٹ کے اندر چلا گیا۔

”کرتولی لیکن ... وہ بچارا تو مجھ سے بھی زیادہ گھبرا گیا ...“ وہ ہنوز ہنس رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے جب بتایا کہ سرفراز میرے انہی چچا کا بیٹا ہے۔ جنہوں نے مجھے مارا بیٹا تھا، جو میری شادی اُس کے ساتھ زبردستی کروانے والے تھے اور جن پر میں نے پاپا کے قتل کی دعویداری کی ہوئی ہے ... تو رنگ اس طرح اڑ گیا گویا ...“

”ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ جیسے کچھ سمجھیں نہیں۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں ماما۔“

”کچھ کہا نہیں کہ وہ کچھ بندوبست کریں گے وغیرہ۔“ اُن کے لہجے میں حیرت سی تھی۔

”نو“۔ شندی نے نفی میں سر ہلایا۔

”کچھ تو کہا ہوگا۔“ ماما نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

”ہاں۔ کہا تھا۔ کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے بات کریں گے ...“

ماما چپ سی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگیں۔ سوچ میں پڑ گئیں تھیں جیسے۔

نور جہاں بانو نے کہہ سن کر ابراہیم کو شندی سے منگنی کے لئے راضی تو کر لیا تھا لیکن۔

اُس کے دل سے وہ خوف نہ نکال پائی تھیں۔ جو ابراہیم کو شندی کی خاندانی پیچیدگیوں اور دشمنیوں کی وجہ سے لاحق تھا۔ بقول اُس کے اُس سے رشتہ جوڑ لینے پر ابراہیم کو خطرات کا اندیشہ تھا۔ جو وہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

”تم بھی تو اُس کے اتنا آگے پیچھے ہو رہے تھے ...“ نور جہاں بانو نے شندی کے ساتھ منگنی کے لئے آمادہ کرتے وقت اُسے کہا تھا۔

وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

”امی اتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ کس لڑکے کا دل نہیں چاہے گا۔ اُس کے قریب جانے کو۔“ اُس نے لا پرواہی سے کہا تھا۔

”اچھا بس چھوڑو۔ تمہارے ابا کی بھی یہی مرضی ہے۔ والدین کی مرضی سے شادی کرو گے تو سکھی رہو گے۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

اور۔ جب نور جہاں بانو نے اُس کے آگے شندی کی املاک کا نقشہ تفصیل سے کھینچا۔ تو۔ ابراہیم کے بھی منہ میں پانی آ گیا۔ گو۔ شندی سے بچے خطرات کا دھڑکا اب بھی اپنی جگہ تھا!

شام کو شندی نے اُسے سرفراز کے فون کا بتایا۔ تو اُس کا رنگ واقعی فق ہو گیا تھا۔

فون کا مطلب تھا۔ شندی کے دشمنوں کو اُس کی جائے پناہ کا پتہ چل چکا تھا۔ اور اب شندی کے ساتھ ساتھ اُن سب کی بھی یقیناً خیر نہیں تھی!

اُس نے شندی سے بھی کہا۔ اور خود بھی یہی مناسب سمجھا۔ کہ یاور خان سے بات کی جائے۔ خالہ زاد تھا اُس کا۔ وہ جانے اور اُس کا کام۔ یہ بکھیرے اُس کے بس کے نہیں تھے!

”امی آپ سے کہا تھا نا۔ اس مصیبت میں ہاتھ مت ڈالیں۔“ شندی سے واپس آتے ہی وہ کچن میں مصروف نور جہاں بانو پر زور اتارنے لگا۔

”کس مصیبت میں؟“

”یہی شاندا نہ کی مصیبت میں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔ اُس کے چچا کے بیٹے کو اس جگہ کا پتہ چل چکا ہے۔ فون کیا تھا اُسے۔“

ایک پل کو تو وہ بھی گھبرا گئیں۔ اپنے لئے نہیں۔ شندی کے لئے۔

ایسہ بیگم ابھی یہیں تھیں ، یادور خان کے پاس۔ یادور خان ہی اُنہیں جانے نہیں دے رہا تھا۔ اُسے ان دنوں خاص طور سے اُن کی ضرورت تھی۔ اُن کی شفقتیں شندی کی یاد کو دور رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ایسہ بیگم حسب معمول کچن کے باہر گھاس پر کرسی ڈلو کر بیٹھ گئیں۔

”حمید۔ مٹلاؤ چھیل دوں“۔ وہ جنت نظیر نظاروں پر نظریں ڈالتے ہوئے کچن میں مصروف حمید سے بولیں۔

”لیکن بیٹا ایسی حالت میں تمہیں اُس کو تسلی دینی چاہئے۔ ہم سب کو اُس کی مدد کرنی چاہئے...“

”ہہہ۔ مدد۔ میں سیدھا سیدھا ڈاکٹر سے بات کروں گا۔ وہ کرے گا مدد۔ پہلے بھی کر چکا ہے“۔ ساری مصیبت یادور خان ہی کی تولا ئی ہوئی تھی۔

اور۔۔۔ نور جہاں بانو پچھتا ئیں۔ ابراہیم شندی کے قابل نہیں تھا۔ اُنہوں نے غلط سوچا تھا۔ منگنی وگنی تو ایک طرف۔ ایک مظلوم کی مدد کرنا تو فرض بنتا ہی تھا!

اپنے فیصلے پر پشیمان سی وہ کچن سے نکل آئیں۔ اپنے کمرے میں گئیں۔ اور صبح کراچی جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ جج صاحب نے بلوایا تھا۔ اُن کے قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ جج صاحب نے بلوایا تھا۔ اُن کے قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ دونوں کا انینڈ کرنا ضروری تھا۔

فارغ ہوتی تھیں۔ سوسیزی وغیرہ پھیلنے کاٹنے میں حمید کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔

”جی ابھی لایا۔“ حمید کی آواز آئی۔

اور جلدی ہی وہ مٹرا اور ساتھ میں چھکوں کے لئے برتن لے آیا۔ وہ مٹر بھی چھیلی جاتیں۔ اور گا ہے گا ہے آس پاس بھی نظر ڈالتی جاتیں۔

قریب ہی چند گز پر شندی کی اینٹکی کا پچھلا دروازہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رخ موڑ کر اُس طرف دیکھ لیتیں۔

پتہ نہیں کیوں؟ جب سے اُسے نزدیک سے دیکھا تھا۔ اُس کی اپنے ابا جان کے جیسی آنکھیں دیکھی تھیں۔ دل کو جیسے کوئی مسوس رہا تھا۔ سوتیلی ماں، سوتیلی بہن۔ آہستہ آہستہ پیچھے جا رہی تھیں۔ سامنے بس شندی ہی تھی! عاجزی، باادب سی، اور پھر۔

’میں دکھی ہوتا ہوں تو آپ بھی دکھی ہوتی ہیں نا؟‘ اُن کے کانوں سے ہوسپٹل میں ایڈمٹ یا درخان کی آواز نکلائی۔

’تم دکھی ہو گے تو میری جان چلی جائے گی۔‘ وہ بار بار اُس کا ہاتھ چوم رہی تھیں۔

’ای۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آ جاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے میرے لئے منگوا دیتی تھیں... جب میں چھوٹا تھا۔ تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ رات گئے میلوں گاڑی بھاگ کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر...‘

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی۔ شکوے تھے، شکایتیں تھیں! وہ جیسے کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں۔

’مگر کیا؟ میری جان۔‘ وہ شفقت سے بولی تھیں۔

’مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں...‘

تب بھی ایسہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

اس وقت بھی بے کل سی ہو گئیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں۔ یا درخان بہت اداس رہنے لگا تھا۔ نہ وہ پہلے کی سی مگپ شپ رہی تھی، نہ ہنسی مذاق۔ کھانا پینا تک برائے نام رہ گیا تھا۔ افسردگی کی ایک مستقل چھاپ رہنے لگی تھی پر کشش چہرے پر!

وہ خود کو مجرم سامحوس کرنے لگیں۔

اپنے بیٹے کی خاطر، اپنی جان کی خاطر، کیا وہ پچھلی باتیں بھول نہیں سکتی تھیں؟ اُنہوں نے خود سے سوال کیا۔

یا درخان کی خاطر۔ اپنے بہت صابر اور بہت فرمانبردار بیٹے کی خاطر! وہ خود سے جنگ لڑ رہی تھیں۔ کئی دنوں سے!

’بھول جاؤ پچھلی باتیں۔ بے آسرا ہے، اپنا لو! سے۔ اپنا خون ہے...‘

اُن کے کانوں میں نور جہاں بانو کی بات گونجی۔

’ای۔ یا در بھائی کا بھی سوچیں۔ اُنہیں... بہت پسند ہے شندی۔ اگر آپ بھی...‘

’نایاب کی جھجکتی جھجکتی آواز اُن کے کانوں سے نکلائی۔‘

’ای پلیز! یا در بھائی کا... دل ٹوٹ جائے گا...‘ بھائی کی محبت میں ڈوبی شاداب کی آواز آئی۔

دفعتاً۔ اُن کے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ کوئی رورہا تھا!

ایسی تڑپ تھی رونے میں۔ کہ ایسہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ بے چین سی وہ رخ موڑتے ہوئے آواز کی سمت دیکھنے لگیں۔

شندی کی اینٹکی کے اندر سے آواز آرہی تھی۔ وہ بے اختیار اُٹھیں۔

اور۔ قدم اینٹکی کی طرف بڑھنے لگے۔

دروازے پر دستک کی۔ ماما نے دروازہ کھولا۔

’یہ کون رورہا ہے؟‘ اُنہوں نے بلا تمہید پوچھا۔

”شندی بی بی رو رہی ہیں۔“

اور۔ مزید کچھ کہے سنے بغیر وہ اندر داخل ہو گئیں۔

ماما حیرت زدہ سی اُن کے ساتھ ساتھ شندی کے کمرے تک گئیں۔

”کیا ہوا میرا بچہ؟“ سیکنڈز میں وہ صوفے پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے

پھوٹ پھوٹ کر روتی شندی کا سر سینے سے لگائے تھیں۔

جانے کیا ہوا؟ شندی کی چپیں نکل گئیں۔ امیہ بیگم کے گرد دونوں بازو

پٹیتے ہوئے وہ بیقراری سے رو دی۔

امیہ بیگم اُسے چپ کراتی رہیں۔ اُس کے بال سہلاقی رہیں، اُسے پیار

کرتی رہیں۔

”پانی لانا ذرا اس کے لئے۔“ اُنہوں نے ماما سے کہا۔

”بس میرا بچہ۔ بس۔ اور نہیں رونا۔“ اپنے آنسو شال کے پلو سے

پونچھتے ہوئے وہ شفقت سے بولیں۔

ماما پانی لے کر آ گئیں۔ امیہ بیگم نے اپنی شال سے شندی کے آنسو

خشک کئے۔ گلاس اُس کے منہ سے لگایا۔

”بی بی بیٹا۔“

اور۔ وہ چپ چاپ پینے لگی۔

”یہ کیوں رو رہی تھی اتنا؟“ گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ ماما سے

مخاطب ہوئیں۔

”آج شندی بی بی کے والد کی سالگرہ ہے۔ بہت خوشی خوشی منایا کرتی

تھیں شندی بی بی اُن کی سالگرہ... اُن کے انتقال کے بعد پہلی بار اُن کی سالگرہ

آئی ہے... اُن کی تصویر نکالی۔ اور رونے لگیں...“

”اوہ۔“ امیہ بیگم دکھ سے بولیں۔ ایک بار پھر اُس کا سر سینے سے لگایا۔

شندی سانس لی۔ ”اللہ کی آزمائش ہے بیٹا، صبر کرو۔ دکھ آیا ہے تو سکھ بھی آئے

گا۔ ہر رات کی صبح ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ جو کرتا ہے۔ ہم

نہیں سمجھ پاتے۔ اُن کی زندگی اتنی ہی تھی۔ سب نے جانا ہے باری باری۔ بس تم

دعا کیا کرو اُن کے لئے...“

اُن کے سینے سے لگی شندی کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ بھری دنیا میں

کوئی اپنا ملا تھا۔ ساتھ ہی۔

اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے اچانک پہنچ گئی تھیں؟

امیہ بیگم کچھ دیر اور وہیں بیٹھی رہیں۔ شندی سنبھلی۔ تو اٹھ کھڑی

ہوئیں۔

”اب چلوں گی بیٹا۔ دل گھبرائے تو میرے پاس آ جایا کرو۔ میں یہیں

ہوں ابھی۔“

شندی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی پلیر! چائے، کوئی پی کر جائیں۔“

”نہیں بیٹا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چائے پی ہے۔ یہ تو بس تمہارے

رونے کی آواز سنی تو رہا نہیں گیا...“ وہ کوریڈور میں نکل آئیں۔

شندی بھی ساتھ ساتھ تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اُن کے لئے دروازہ

کھول کر تھام لیا۔

وہ باہر نکلیں۔ تو وہ بھی ساتھ ساتھ باہر تک آ گئی۔

”بہت شکریہ آئی۔“ شندی نے کہا۔

”خدا حافظ بیٹا۔“

”خدا حافظ۔“

شندی وہیں کھڑی اُنہیں جاتے دیکھتی رہی۔ خواب سا لگ رہا تھا سب

اُسے!

وہ اپنے کچن کے اندر چلی گئیں۔ تو شندی واپس مڑی۔ دیکھا ماما بھی

دروازے میں کھڑی تھیں۔ وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

برسوں پر محیط ایسہ بیگم کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ انہونی ہی تو ہوئی تھی!

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر سوتاریکیاں گھر آئی تھیں۔ بستی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

بس روشنی ہو رہی تھی تو۔۔۔ جج صاحب کے گھر میں۔ یا پھر یاد خان کے یہاں!

یاد خان آن کال تھا ان دنوں۔ پندرہ بیس منٹ قبل ہوسپتال کے لئے نکل گیا تھا۔ ایسہ بیگم بستر پر جلدی جانے کی عادی تھیں۔ دس بجے ہی پڑ رہی تھیں بستر پر۔ میوہ خان اور حمید البتہ یاد خان کے انتظار میں باہر گیٹ کے قریب سوکھی ٹہنیوں کی آگ تاپتے کپ شپ کرتے جاگ رہے تھے۔

ایسہ بیگم کو غنودگی آنے لگی تھی۔ منہ ہی منہ میں اب بھی اپنے بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں کہ۔

اچانک کچھ غیر معمولی سی آہٹوں پر کان کھڑے ہوئے۔ غنودگی ہوا ہو گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بستر میں بیٹھ گئیں۔ کان لگایا۔ شندی کی اسٹنکی کی طرف کچھ ہورہا تھا۔

گھبرائی گھبرائی وہ میڑھیاں اترنے لگیں۔ کچن میں آئیں اور دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل آئیں۔

اندھیرا ضرور تھا۔ مگر نظر سب آ رہا تھا۔

اُن کے دیکھتے دیکھتے دو آدمی شندی کے ٹیریس کے دروازے سے باہر نکلے۔ اگلے آدمی کے کندھے پر کچھ ٹھڑی سی تھی اور پچھلا خالی ہاتھ تھا۔

انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا؟ کہ سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگیں۔

تبھی انہوں نے شندی کی کھٹی کھٹی آوازیں سنیں۔ اور۔۔۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ یہ لوگ شندی کو اٹھا کر لیجا رہے تھے۔

یاد خان تو تھا نہیں۔ وہ بھاگیں ابراہیم کو فون کرنے۔

فون ابراہیم نے ہی اٹھا لیا۔

”جی آئی۔ خیرت تو ہے؟“ ایسے بے وقت انہوں نے پہلے کبھی فون جو نہیں کیا تھا۔

”بیٹا جلدی کرو۔ شندی کو دو آدمی اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔“

”اوہ۔“

اور۔۔۔ دونوں نے فون بند کر دیا۔

لحہ بھی ضائع کئے بغیر وہ واپس وہیں آ گئیں۔

اب دونوں آدمی تیزی سے اسٹنکی کے پچھلے دروازے کے پاس سے گزرنے لگے تھے۔

شندی شاید بندھانہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”ابراہیم، ابراہیم، ابراہیم...“ اُس کی آواز وادی میں گونج رہی تھی

مگر۔

ابراہیم نثار دھوا!

”میوہ خان، میوہ خان۔“ ایسہ بیگم دوڑتی ہوئی گیٹ کی طرف آئیں۔

”حوصلہ کریں بیگم صاحبہ۔ ہم نے شندی بی بی کی آوازیں سنی ہیں۔

لیکن میوہ ماموں نے گاڑی شارٹ ہونے کی بھی آواز سنی ہے۔ وہ شارٹ کٹ

کر کے گاڑی کا راستہ روکنے گیا ہے...“ وہ خود بھی بھاگا میوہ خان کی طرف۔

”یا اللہ رحم کر۔ یا اللہ رحم...“

تبھی۔۔۔ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

ایسہ بیگم دہل کر رہ گئیں۔ بدحواسی جج صاحب کے گیٹ کی طرف بڑھیں۔ مگر۔

وہاں تو جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ نہ چوکیدار، نہ نوکر چاکر اور۔۔۔ نا ہی منگیتر نامدار ابراہیم!

جلتی بتیاں تک بند کر دی تھیں سب!

واہ۔ کیا سسرال تھی؟ اور کیا منگیتر تھا؟

وہ والہاں پلٹ آئیں۔ بلا سوچے سمجھے اُسی طرف بڑھنے لگیں۔ جس طرف میوہ خان اور حمید گئے تھے۔

موڑ کے قریب پہنچیں۔ تو انہیں سب نظر آنے لگا۔

جیب فرار ہو رہی تھی۔ پتلی سی پرائیویٹ روڈ پر دسترس سے باہر نکل رہی تھی۔ اور سچ سڑک پر ہستی کے مرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

وہ لوگ یقیناً شندی کو لے گئے تھے۔ ایسہ بیگم وہیں بیٹھ کر وادیا کرنے لگیں۔

پھر انہوں نے دیکھا۔ مرد چھٹ گئے تھے۔ حمید اُن کے پاس آیا۔

”بیگم صاحبہ۔ شندی بی بی سڑک پر پڑی ہیں۔ آپ اور ماما جا کر انہیں لے آئیں۔ خیریت سے ہیں بالکل۔ میوہ ماموں اُن کے پاس ہے۔۔۔“ وہ خود

شندی کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ کہ وہ اُن کے لئے بہت قابل احترام تھی۔

ایسہ بیگم مارے خوشی کے رونے لگیں۔

”ارے جاؤ۔ ماما کو بلا کر لاؤ۔“

حمید اوپر بھاگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گرتی پڑتی ماما کو لے آیا۔

”سٹور میں بند کر کے کنڈی لگا دی تھی کم بختوں نے۔“ حمید بولا۔

”خدا غارت کرے۔ آؤ الفت۔ نیچے چلتے ہیں۔۔۔“ انہوں نے ماما

سے کہا۔

”نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ لوگ یہیں رہیں۔ سخت چڑھائی ہے۔ نور محمد پاس والے گاؤں سے سوزو کی بس لانے ہی والا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“

منٹوں میں ہی سوزو کی آگئی۔ اور وہ سب شندی کو اُس کی اینٹکسی میں لے آئے۔

شندی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پکڑ دھکڑ، فائرنگ اور۔۔۔ اغوا کا خوف!

ایسہ بیگم اور ماما اپنی سی کوششیں کر رہی تھیں۔ ایسہ بیگم نے یاور خان کو بھی فون کر کے بلوایا تھا۔ مگر جبکہ قدرے پرے اور راستہ بُرا ہی تھا۔ پہنچتے پہنچتے وقت تو لگتا ہی تھا۔

میوہ خان نے پستول سے فائر کئے تھے۔ جو اندھیرے میں نشانے پر تو نہیں بیٹھ سکے تھے۔ مگر اتنا تھا کہ اُن لوگوں نے گھبرا کر شندی کو سڑک پر پھینکا۔ اور ہوائی فائرنگ کرتے بھاگنے کی کرنے لگے۔ کہ سڑک چکر دار تھی۔ سپیڈ کرنیں سکتے تھے۔ اور تھے گولیوں کی زد میں!

صبح کے دو بجنے کو تھے جب یاور خان گھر پہنچا۔

حمید نے گیٹ کھولا۔ اُس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ اور غلبت سے اندر جانے لگا کہ۔

امی نے فون پر کہا تھا۔

”گھر آ جاؤ۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

یقیناً کچھ سیر لیس تھا۔ ورنہ وہ حتی الامکان اُسے اپنی پریشانیاں نہیں بتایا کرتی تھیں۔

”صاحب۔ بڑی بیگم صاحبہ۔۔۔ اوپر اینٹکسی میں شندی بی بی کے پاس

ہیں۔“ حمید نے اُسے پورچ میں ہی آیا۔

”کیا؟“ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

پھر— حمید نے سارا واقعہ اُس کے گوش گزار کر دیا۔

”اوہ مائے گوڈ!“ اُس نے اتنا ہی کہا۔

”شندی بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زخم بھی آئے ہیں...“

اور— وہ وہیں سے واپس مڑ گیا۔

”میرا فرسٹ ایڈ بوکس لے آنا“— اُس نے کہا۔ اور—

تیزی سے اینٹکی کی طرف بڑھنے لگا۔

شندی نے اُس کی توہین کی تھی، اُس سے بیوفائی کی تھی۔ یہ سب اُسے

بچ لکنے لگا۔

اُس کے حالات نے بہت سنگین صورت اختیار کر لی تھی اور— اُسے

اُس کی مدد کی ضرورت تھی۔ بس یہی حقیقت تھی!

اس سے زیادہ وہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا!

دستک دیتا وہ شندی کے بیڈروم میں آ گیا۔

شندی تکیوں سے پشت ٹکائے بستر میں لیٹی تھی۔ چہرے سے نقاہت کے

ثار ہو رہا تھے۔ امیہ بیگم اب بھی اُس کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ سخت پریشان لگ

ہی تھیں۔

شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پی رہے تھے۔ اُسے اچھا لگا!

”شکر ہے بیٹا تم آگئے ہو۔ میری تو جان پر بنی ہے...“

”جی— مجھے حمید نے بتا دیا ہے سب۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب

ایک ہو جائے گا۔“ موقع واقعی پریشانی کا تھا فکر مندی کا تھا لیکن—

امی کی بے تحاشہ پریشانی۔ وہ بھی شندی کے لئے!

سورج کہیں مغرب سے تو نہیں نکلا تھا آج؟

نجیدہ سچویشن کے باوجود ایک غیر محسوس مسکراہٹ اُس کے لبوں کو

چھو گئی۔

پھر— اُس نے شندی کو T.T انجکشن لگایا۔ مرہم پٹی کی، دوائیاں

دیں۔

کچھ بھی کہے بغیر، کچھ بھی سنے بنا!

اما کوڈیئر ساری تسلی دی۔ میوہ خان و نور محمد کو ہدایات دیتے ہوئے اُن

کے پاس چھوڑا اور— امی کو قدرے ریست کرنے ساتھ لیتا آیا۔

※—※

یادِ خان کے F.I.R درج کرانے پر پولیس آچکی تھی۔ چنان بین کر چکی تھی۔ اور۔۔۔ جج صاحب کے نئے بھرتی کردہ بائیس تیس سالہ لک محمد نعیم کو گرفتار کر کے لیجا چکی تھی!

بہت ہی انوکھی بات سامنے آئی تھی۔

محمد نعیم ایک مقامی گریجویٹ لڑکا تھا۔ جس کو ڈاکٹر نادیر کی تجویز پر سرفراز نے جج صاحب کے یہاں کوئی دس دن قبل خانساں رکھوایا تھا۔ جو روزانہ ڈاکٹر نادیر کو اور۔۔۔ وہ آگے سے سرفراز کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھتی تھی۔

جج صاحب پہلے سے کراچی میں تھے۔ نور جہاں بانو دو چار روز قبل کراچی سدھاری تھیں۔ ابراہیم کل صبح، رات باہر گزارنے کا کہکر دوسرے شہر کام سے نکل گیا تھا۔ اور۔۔۔ یادِ خان آن کال تھا ان دنوں!

جوں ہی یادِ خان ہو سہل کے لئے نکلا۔ محمد نعیم نے نادیر کو اور۔۔۔ نادیر نے چند روز سے یہیں کہیں مقیم سرفراز کو انعام کر دیا۔

محمد نعیم چوکیدار کو یہ کہکر کہ اُس کے سر میں شدید درد ہے اور وہ بستی کے نچلے حصے میں رہنے والے اپنے دوست کے یہاں سے گولی لینے جا رہا ہے، چل دیا نیچے۔

دریں اثناء۔۔۔ ابراہیم واپس آ گیا۔ اُس کا کام دن کو ہی ہو گیا تھا۔ سو خواہ مخواہ رات باہر گزارنے کی بجائے اُس نے گھر واپس لوٹنا بہتر سمجھا۔

چوکیدار نے اُسے بتایا کہ محمد نعیم کی طبیعت ٹھیک نہیں، نیچے گیا ہے۔ تو ابراہیم نے خود ہی فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا، کھایا، اور اوپر اپنے بندرہ میں چلا گیا۔

تبھی۔۔۔ اُسے ایسہ بیگم کی فون کال آئی۔ کہ شندی کو کوئی کڈنیپ کر رہا ہے!

سرفراز کے بندے کل شام اندھیرا چھاتے ہی بستی کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے۔ بس انتظار تھا تو صرف یادِ خان کے گھر سے باہر نکلنے کا! سکیم تو بہت زبردست تھی پر۔۔۔

جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے! میوہ خان نے جان کی پروا کئے بغیر اغوا کاروں کو پسپا کرتے ہوئے شندی کی جان بچائی اور۔۔۔ سرفراز اور نادیر کے خواب خاک میں ملا دیئے۔

نادیر کا سرفراز سے رابطہ کیسے ہوا تھا؟ تفتیش کے دوران محمد نعیم نے ہی بتایا۔ کہ جب شندی بیمار پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر نادیر اُسے دیکھنے آئی تھی۔ تو ساتھ

میں شندی کا چھوٹا سا ٹیلیفون، انڈیکس بھی اپنے پرس میں لیتی مٹی تھی۔

واہ۔۔۔ یادور خان کو حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔ نادیا یہ اس حد تک گر سکتی تھی؟ اتنا دور رس اور گھناؤنا پلین بنا سکتی تھی؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا!

’کہیں دوستی سے بات آگے نکل گئی ہو تو؟‘ یادور خان کو کچھ عرصہ قبل کی نادیا سے باتوں کے دوران کئی اپنی بات یاد آئی۔

’میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی‘۔ تب بھی اُس کے لب و لہجہ میں وارننگ سی تھی! پر۔۔۔ اتنا بڑا انتقام؟ اتنا بھیاں تک انتقام؟ کہ بھلے شندی کی شادی ایک بدنام زمانہ، شادی شدہ بچوں والے شخص سے ہو جائے۔ جو اُس کی تمام املاک ہڑپ لے۔ جس کے ساتھ وہ تمام عمر روتے سکتے زندگی گھسیٹی رہے مگر۔

نادیا کی خواہش پوری ہو۔ شندی یادور خان کو نہ ملے۔

لیکن۔۔۔ نادیا اُس کے ساتھ Sincere تو نہیں تھی۔

پھر۔۔۔ اتنا خطرناک کھیل کیوں کھیلا تھا؟

اوہ۔۔۔ وہ سمجھ گیا۔ انور کے بعد اُس کے خیال میں شاید یادور خان ہی

زیادہ پیسے والا تھا!

شام کے دھند لے گھر آئے تھے۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بوند باری ہو رہی تھی۔ اور۔۔۔

یادور خان سوچوں میں گم حسب معمول گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

شندی کے حالات گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کے کزن، چچا وغیرہ کو اُس کی جائے پناہ کا پتہ چل چکا تھا۔ پہلے فون پر شندی کی موجودگی کسفرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اٹھوانے تک کی نوبت آ پہنچی تھی۔

ان لوگوں نے اُسے کسی طور چھوڑنا نہیں تھا۔ اس بار اٹھوانے کی کوشش کی کل کو کچھ اور بھی کر سکتے تھے۔

ایسے میں اُسے ابراہیم کا خیال آ گیا۔ ان حالات میں اُسے چاہئے

تھا۔ کہ فوراً اُس کے ساتھ نکاح کر لیتا۔ اپنی حفاظت میں لے لیتا۔ مگر۔

’ارے لعنت بھیجو ابراہیم پر۔ میں نے فون پر بتایا بھی اُسے سب۔ مگر لائسنس آف کر کے چھپ کر بیٹھ گیا گھر میں۔ نوکروں تک کو باہر نہیں بھیجا۔۔۔ اُس کے استفسار پر امی نے بتایا تھا۔

اُسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اگر ایسے وقت میں وہ اپنی منگیتری کی حفاظت نہیں کر پایا تھا۔ تو منگنی ہی کیوں کی تھی اُس سے؟ اچھا مرد تھا؟

’اے چھوڑو۔ نامرد کہیں کا۔ بس میرا منہ مت کھلواؤ۔ امی سخت ناراض لگ رہی تھیں۔

ویسے۔ امی شندی پر خاص مہرباں نظر آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیسے؟ ’بائے دادے امی۔ آپ کی۔۔۔ اوپر والوں سے کیسے دوستی ہوئی؟‘ وہ چھیڑنے لگا انہیں۔

وہ اُس کا اشارہ سمجھ گئیں۔ جُڑی ہوئیں۔

’کون؟ شندی سے؟‘

’اچھا یہ نام ہے اُس کا؟‘ وہ مزید شرارت سے بولا۔ انہیں ہنسی آ گئی۔

’بہت مہرباں نظر آ رہی ہیں اُس پر۔۔۔‘

’بس چھوڑو۔ اپنا خون ہے میرا۔ کب تک Avoid کرتی۔‘

اُس کی سیاہ گھنی بھونٹیں اوپر اٹھ گئیں۔

’واؤ۔ وہ خوبصورتی سے بولا تھا۔

یکا یک۔ پیچھے سے ہارن ہوا اور۔ اُس کے سوچوں کی دھارا ابھر گئی۔

بوند باری تھم گئی تھی۔ بادل دھیرے دھیرے چھٹ رہے تھے۔ شام کا پہلا نوخیز تارہ نظر آنے لگا تھا۔

اُس نے گاڑی آہستہ سے اپنے گھر کی سڑک پر ڈال لی۔ شیشہ نیچے کیا۔ بہت ساری بھگی بھگی، بھینی بھینی خوشبوئیں در آئیں۔
پتہ نہیں کیسے؟ اُسے شندی کا خیال آ گیا۔
اُس کی قربت میں بھی تو شبنم میں بھیکے پھولوں کی خوشبوؤں کا احساس ہوتا تھا!

جب سے یہ واقعہ ہوا تھا، اُسے قریب سے دیکھا تھا۔ یاد تو نہیں آنے دی تھی اُس کی لیکن۔ دل میں ٹیسس سی ضرور اُٹھ رہی تھیں!
یہ ٹیسس کیا اُسی کی یاد کی نہیں تھیں؟ اچانک اُس نے خود سے سوال کیا۔
لیکن۔ وہ کافی حد تک خود کو سنبھال تو چکا تھا۔ دن بھر مصروفیت کی ایک اونچی فصیل اپنے ارد گرد کھڑی کر دی تھی کہ اُس کی یاد کو در آنے کا موقع نہ ملے۔
رہی رات۔ تو وہ آرام سے Sleeping pill لے لیتا تھا! اُس نے خود کو جواب دیا۔

”تو۔ بھول پائے اُسے؟“ اُس نے پھر خود سے پوچھا۔

”ہا۔۔۔ اُس نے جیسے جھجکتے ہوئے خود سے کہا۔

”کس کو دھوکہ دے رہو؟“

”لیکن۔ میں اُسے یاد کرنا نہیں چاہتا۔“

”یہ الگ بات ہے۔“ جواب ملا!

میوہ خان نے گیٹ کھولا اور اُس کی محویت ٹوٹ گئی۔ آگے بڑھتے ہوئے گاڑی پورچ میں لے گیا۔

اپنے معمول کی کوئی وہ ان دنوں امی کے ساتھ میریس پر بیٹھ کر جادوئی اطراف پر نظریں جمائے، امی سے گپ شپ کرتے پیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں بیٹھے کوئی پی رہے تھے۔

”صبح سے شندی نے ہنگامہ مچایا ہے۔۔۔“ ایسہ بیگم آہستہ سے گویا

ہوئیں۔

وہ خاموش رہا۔ اُس کے ذکر پر وہ شادی کوئی کومنٹ دیتا تھا۔

”اپنی ماما کو منگنی کی انگٹھی دی ہے کہ جا کر ابراہیم کو دے آئے۔۔۔“

ایسہ بیگم بات کر رہی تھیں مگر۔ پتہ نہیں کیوں؟ جیسے اُس کا سامنا نہیں کر پارہی تھیں۔

اب یا درخان کے کان کھڑے ہوئے۔ استغفامیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی!

”کہتی ہے ایسے بزدل آدمی سے شادی کرتے ہوئے اُسے شرم آتی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہہ رہی ہے۔ کہ منگنی توڑنے کے بعد وہ اُن کی اینٹکسی میں ایک پل بھی نہیں رہے گی۔ واپس اپنی حویلی جائے گی۔ آگے جو ہوگا۔ اُس کی قسمت ہوگی۔۔۔“

بات تو شندی نے ٹھیک کی تھی۔ بزدل تو وہ تھا۔

شندی تو شندی۔ وہ تو پوری ہستی کی نظروں میں گر گیا تھا!

مگر۔ واپس حویلی؟

”اُس کا حویلی جانا، وہاں اکیلے رہنا۔ یہ تو وہی سچویشن ہوئی جو روز اول کو تھی۔۔۔“

”میں خود پریشان ہوں۔ اُس کی ماما اُسے روکے ہوئے ہے۔ کہتی ہے

نور جہاں سے بات کرے گی۔۔۔“

”وہ لوگ آپکے ہیں کیا؟“

”ہاں۔ شام پانچ بجے پہنچے ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے اس پورے معاملے کے بارے میں۔“

”میں تو سخت آپ سیٹ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ادھر شندی اکیلی

اور مصیبت میں۔ ادھر شاداب کا بار بار فون آ رہا ہے۔ ڈیلیوری میں چند دن ہیں

اُس کے ...“

امی اچانک شندی کے لئے اس قدر موم ہو گئی تھیں۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی مگر۔ زیادہ پوچھ گچھ اس لئے نہیں کی۔ کہ مبادا یوٹرن لے لیں۔ ایسے حالات میں شندی کے لئے اُن کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں تھا!

”ابراہیم واپس کب جا رہا ہے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اُن کا ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ پرسوں کراچی جائے گا۔ وہیں سے فلائیٹ ہے لنڈن کی۔“

یاور خان دوپہل خاموش رہا۔ اندر جیسے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

”ابراہیم نکاح کیوں نہیں کر لیتا اُس سے۔“ وہ بڑے ضبط سے بولا۔

”اس طرح شندی آنٹی اور انکل کے پاس شفٹ ہو کر محفوظ ہو جائے گی۔ بعد میں ابراہیم ڈو کیومنٹس تیار کر کے اُسے بلوا سکتا ہے۔“

اُس کا چہرہ اُس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے اور۔ دلنشیں آنکھوں میں کرب اُتر آیا تھا!

ایسہ بیگم ماں تھیں۔ بیٹے کے ایثار پر تڑپ کر رہ گئیں۔

”شندی نہیں مانے گی۔ اُس نے اپنی ماما سے کہا ہے کہ اگر وہ انگوٹھی واپس نہیں کرتیں۔ تو وہ خود جا کر دے آئے گی ...“

”یہ بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔ کہ جب دل چاہا انگوٹھی پہن لی۔ جب چاہا انگوٹھی اتار لی۔ منگنی کا فیصلہ تو اُس نے خود کیا تھا۔ کسی نے دباؤ تو نہیں ڈالا تھا۔ یہ سب سوچنے کا اب وقت نہیں ہے۔ پہلے سوچنا چاہئے تھا اُسے۔“ اُس نے

قدرے تو وقف کیا۔ ”اُس نے حامی بھری۔ اس کی تو سمجھ آتی ہے۔ اپنی حفاظت کی خاطر کیا جو کچھ کیا۔ لیکن۔ اتنی جلدی کیوں کی؟ میرے لنڈن سے واپسی کا

انتظار تو کیا ہوتا۔ آخر تو پہلے بھی ہر پروہلم میرے ساتھ ہی ڈسکس کرتی تھی ...

وہ کہتا گیا اور۔ ایسہ بیگم مجرم ہی بنیں سنتی رہیں۔ کیسے کہتیں کہ۔ ایک

طرف تو اُنہوں نے نور جہاں بانو پر دباؤ ڈالا تھا۔ کہ یاور خان کے لنڈن جاتے ہی ابراہیم کی شندی سے منگنی کرادے۔ دوسری طرف کسی بھی شک و شبہ کا امکان ختم کرنے کے لئے اُنہوں نے شندی کی ماما کے ذریعے شندی کو خبردار کر دیا تھا۔ کہ وہ یاور خان سے شادی کا خواب دیکھنا بند کر دے۔

ایسے میں شندی ایسا نہ کرتی تو کیا کرتی؟

ایک لمحے کو تو جی میں آیا۔ بتا دے سب اپنے یاور کو۔ مگر دوسرے ہی لمحے ارادہ بدل لیا۔

کیا سوچے گا اپنی ماں کے بارے میں؟ نظروں سے نہ گر جائیں کہیں اُس کی!

تبھی۔ میوہ خان اوپر آ گیا۔

”صاحب۔ ماما نے نور محمد کو بھیجا ہے۔ شندی بی بی کو بخار ہے۔ دوا منگوائی ہے۔“

شندی کو چونٹیں آئی تھیں۔ اُسی وجہ سے غالباً بخار نے آ لیا تھا۔

یاور خان خاموشی سے اپنے کمرے میں گیا۔ دوائیاں نکال کر میوہ خان کو دیں۔ استعمال سمجھایا۔ اور امی کی طرف آ گیا۔

”آئیں امی اندر چلتے ہیں۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو۔“

”ہاں۔ چلو۔“

دونوں ماں بیٹا اندر آ گئے۔



شروع ہو جاتا تھا۔

آج یا درخان اُسے خود دیکھنے گیا۔ avoid کر رہا تھا اتنے دن۔ پر کیا کرتا۔ ڈاکٹر بھی تو تھا!

اب بھی ٹیپر پچر تھا۔ خاصی کمزور بھی ہو گئی تھی۔ اینک بھی لگ رہی تھی۔

”ماما۔ کل ہسپتال میں داخل کرواتے ہیں آپ کی شندی بی بی کو“۔ وہ

واپسی پر ماما سے بولا۔ اور۔

یوں وہ اگلے دن ہسپتال میں ایڈمٹ ہو گئی۔ ماما بھی ساتھ تھیں۔

اتفاق ہی تھا کہ وہی بلاک اور وہی کمرہ ملا تھا۔ جہاں کچھ عرصہ قبل یا درخان اُسے

حویلی سے لیکر آیا تھا۔

مزید ٹسٹ ہوئے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ مگر۔ ٹیپر پچر پھر بھی وہی ہلکا

ہلکا۔ چل رہا تھا۔

شام چھ بجے فارغ ہوا۔ تو یا درخان اُس کے کمرے میں آ گیا۔ آج

بھی سسٹرنز گس ساتھ تھی۔

یا درخان نے اُس کے Vital chart پر نظر ڈالی۔ وہی کل والی

حالت تھی۔

اس وقت پھر اُس نے اُس کی نبض محسوس کی، سٹیٹھو سکوپ سے معائنہ کیا،

آنکھیں چیک کیں۔

”سسٹر۔ بلڈ سیپل آغا خان لیب بھجوا دیں۔“ شاید وہاں کی

Investigations زیادہ accurate ہوتیں!

”جی سر۔“

”اوکے۔“ یا درخان نے کہا۔

اور۔ ہمیشہ کی طرح باوقار چال چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

نڈھال سی اُس نے کروٹ بائیں جانب کھڑکی کی طرف لے لی۔

شندی کے بخار کو تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ کسی طرح ٹوٹا ہی نہیں

تھا۔ ٹیپر پچر 100°C سے نیچے آ ہی نہیں رہا تھا۔ اب تو یا درخان کو بھی فکر پڑ گئی۔ زخم

تو اُس کو معمولی سے آئے تھے۔ اتنے دن ٹیپر پچر زخموں کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے

تھا۔ اُس نے ایسہ بیگم سے شندی کو ہسپتال لانے کو کہا۔ اُس کی

Investigations کروائیں۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ دوائیاں

بدل دیں۔ اور ریٹ کرنے کو کہا۔

چار دن مزید گزر گئے۔ مگر وہی۔ شام اُترتے ہی بخار اوپر چڑھتا

اُس پار جنگل کے پیڑوں میں شام بئرا کرنے لگی تھی۔ درختوں میں سے چھتی عمارتوں میں روشنیاں جھلجھل کر رہی تھیں اور۔ پورے آکاش کو گھیرے میں لئے اودی گھنائیں۔ اب برسیں کہ اب!

اُس نے گہری سانس لی۔

پہلی بار اسی کمرے میں وہ اُسے کتنی شفقت اور چاؤ سے لیکر آیا تھا۔ اور آج۔

آج جیسے کوئی اجنبی تھی وہ۔ اشد ضروری ہوا۔ تو کوئی بات پوچھ لی ورنہ۔

چپ سادھ لی تھی بالکل!

اچانک اُسے لگا۔ وہ ڈاکٹر خان تھا! یا ورخان نہیں تھا!

ڈاکٹر خان۔ ڈیوٹی فل اور اٹل!

وہ حادثہ والے دن اُس کی اینٹکی میں آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ بڑا حادثہ ہوا تھا۔ پھر کل شام آیا تھا۔ شاید ایک ڈاکٹر کا فرض نبھانے۔ اور۔ آج صبح سے وہ اُس کے کمرے میں تیسری بار آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اُسی کی پشنت تھی!

مگر۔ بالکل سیریس۔ جبرے سختی سے جوئے اور۔ ہونٹوں پر گہری سنجیدگی کی مہر۔ کہ بھولے سے بھی مسکراہٹ چھو گئی۔ تو شاید بوس نہیں رہے گا!

اپنی طرف سے وہ اُس سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ لیکن بیچ میں ایسا واقعہ رونما ہوا تھا۔ کہ سامنا کرنا مجبوری بن گئی تھی۔ ورنہ شاید وہ اُس کی شکل تک نہ دیکھتا!

وہ حق بجانب تو تھا۔ اُس نے کسی اور سے منگنی کر لی تھی۔ اب وہ اُس کی نظر میں کسی اور کی امانت تھی۔ کیسے پہلے کی طرح شفقت اور پھر دھیرے دھیرے محبت سے پیش آتا؟

کتنا دکھ دیا تھا اُس نے اُسے۔ کتنی انسلٹ کی تھی اُس نے اُس کی! لیکن۔ اُس نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا تھا، ایسا کرنے میں اُسے کتنا درد ہوا تھا، کتنا تڑپی تھی۔ یہ تو وہ ہی جانتی تھی۔

اُس کا لنڈن سے فون آیا تھا۔ تو تب بھی وہ اُسے اصل حقیقت بتانہ پائی تھی۔ اور اب۔ اب بھی اپنا آپ کم ظرف لگتا تھا کچھ بتاتے ہوئے!

اور پھر۔ کوئی قائدہ بھی نہیں تھا۔ اُس کی دانست میں وہ اب ابراہیم کی ملکیت تھی۔ جبکہ خود شندی نے۔ اُسے اُس کی ماں سے کبھی نہ چھیننے کا اپنے آپ سے وعدہ کیا ہوا تھا!

اُس نے تھکی سی سانس لی۔

ایک میل نرس اُس کا بلڈ سپرل لینے کمرے میں آیا۔ تو اُس کی سوچوں کی اُدھیڑ بن تھم گئی۔

”جلدی سے ٹھیک ہوں۔ آپ بستر پر لیٹی اچھی نہیں لگتیں۔“ سسٹرنز اُس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بہت اپنائیت سے بولی۔

وہ مسکرا دی۔

”بچھلی بار ہم لوگ دنوں آپ کو یاد کرتے رہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ بخار چڑھا کر آ جائیں۔۔۔“

”اور میں کیسے آتی؟“ وہ خوشگوار سی بولی۔

”ڈاکٹر خان سے کہہ کر آپ کسی بھی وقت آ سکتی تھیں۔“

”ڈاکٹر خان سے؟“ وہ بھی تو گھبراتی تھی ڈاکٹر خان سے۔ کم از کم ان دنوں!

نرس کھلکھلا کر ہنس دی۔

”پتہ چل گیا نا ڈاکٹر خان کا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی تھی کہ شاف کی جان جاتی ہے اُن سے۔“

”ہاں چل گیا پیہ۔“ شندی اب بھی مسکرا رہی تھی۔ پیہ نہیں کیوں؟ یا اور خان کے بارے میں نرمس کی باتیں اُسے اچھی لگ رہی تھیں۔
 ”بیٹی۔“ سسز کو مخاطب کرتے ہوئے ماما گویا ہوئیں۔ ”میری بچی کا بخار اتر کیوں نہیں رہا؟“ وہ بہت فکر مند لگ رہی تھیں۔

”اُتر جائے گا۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ بخار ہی تو ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے میڈیکل شاف کے Typical انداز میں بولی اور۔

دو چار مزید باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

لائینس آن تھیں۔ ڈنر آچکا تھا۔ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ کہ اُس کی بھوک ہی غائب تھی۔ ماماٹی وی کی آواز بند کئے سکرین پر نظریں جمائے تھیں۔ شندی آنکھیں نقاہت سے موندے لپٹی تھی۔

معا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اور ایسہ بیگم بمعہ نور جہاں بانو اور جج صاحب کے اندر داخل ہوئیں۔

نور جہاں بانو اور جج صاحب کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر ڈھیروں تسلیاں اور دعائیں دیتے چل دیئے۔

ایسہ بیگم البتہ وہیں رہ گئیں۔ انہیں بہت تشویش تھی اُس کے بارے میں۔ مگر ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ کہ وہ گھبرانہ جائے۔

”ماما۔ خالہ جان کے لئے چائے بنائیں۔“ ایسہ بیگم ہی کے کہنے پر اب وہ انہیں بہت پیار سے خالہ جان کہہ کر بلاتی تھی۔

ماما چیسٹ پر رکھے الیکٹریک کیبل کی طرف گئیں۔

”نہیں الفت۔ ایک گلاس پانی دیدوبس۔“ انہوں نے منع کر دیا۔

ماما گلاس میں جوس ڈال کر لے آئیں۔

”الفت تم روز بھول جاتی ہو۔ کہ مجھے شوگر ہے۔“ وہ بہت دوستانہ انداز میں بولیں۔

”ہائے بیگم صاحب۔ پھر بھول گئی۔“ پھر دوسرے گلاس میں فریج سے بوتل نکالتے ہوئے منزل واٹر بھرا۔ ”یہ لیجئے۔“ انہوں نے ایسہ بیگم کو گلاس تھما دیا۔
 ایسہ بیگم کی ماما سے خوب بنتی تھی۔ خوب خوب کپ شپ کیا کرتی تھیں دونوں۔ اب تو ایسہ بیگم ماما سے نفیہ بیگم کے بارے میں بھی پوچھا کرتی تھیں۔ غور سے اُن کے حالات سنا کرتی تھیں۔ اُن کے دکھ میں دکھ اور سکھ میں خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔

شندی کو یہ سب بہت اچھا لگتا۔ یا اور خان بھی کیوں نہیں آ بیٹھتا تھا اُن میں؟ آخر تو اُس کا کزن تھا۔ ایسہ خالہ کا بیٹا تھا۔ اُس سے ناراض سہی۔ رشتہ تو اپنی جگہ تھا۔ وہ اُسے دیکھتی تو۔ سنتی تو۔

اُس کے جاندار تھے، مسور کن باتیں، جادو جگاتی آنکھیں! وہ سنتی تو۔ دیکھتی تو! دس بجے میوہ خان آیا۔ اور ایسہ بیگم اُسے بہت سارا پیار کرتیں، ڈھیر ساری دعائیں دیتیں۔ گھر روانہ ہو گئیں۔

ماما کیفی ٹیریا میں کھانا کھانے چلی گئیں۔ سسز نرمس حسب سابق اُس کے پاس اندر آ گئی۔ دیکھا اُس کا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا شندی کا کھانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ اشتہا جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ تبھی تو ویٹ لوز کر رہی تھی، جھکن محسوس کرتی تھی بہت زیادہ۔ بہر حال۔

نرمس نے اُسے زبردستی سوپ پلانے کی کوشش کی۔ دو چمچ پڈنگ کے بھی کھلائے۔ اور۔

دوائیاں لینے کی تاکید کرتے ہوئے۔ باہر نرمس کاؤنٹر پر چلی گئی۔
 تنکیوں کے سہارے بستر سے پشت نکاتے ہوئے اُس نے سامنے ٹی وی پر نظریں جمادیں۔

معا۔ اُس کا ہیل فون بجنے لگا۔

ناہید کا تھا، اُس کی بہت کلو زفرینڈ کا۔

جب سے اُس کی کڈ پٹنگ کا واقعہ ہوا تھا۔ تب سے ہی وہ ابراہیم کی اینکسی چھوڑ کر اپنی حویلی واپس جانے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ جانے کہاں سے اُس میں اتنی ہمت و طاقت آگئی تھی۔ کہ سب چھوڑ چھاڑ دو بارہ اپنی حویلی میں جا بسنے کا سوچ لیا تھا۔

ابراہیم کی بزدلی نے اُسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مزید دوسروں کی مرہونِ منت اور احسانوں تلے دبی زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے کی ٹھوکروں نے اُسے قدرے مضبوط بھی بنا دیا تھا۔ انکل جہانگیر علاج کی غرض سے کچھ عرصے کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ اور سرفراز کہیں چھپا ہوا تھا۔ یہ اُسے ایسہ بیگم سے پتہ چلا تھا۔ جنہیں یقیناً یادِ خان نے بتایا تھا۔ بہر حال۔

اُن دونوں کی غیر موجودگی میں وہ حویلی جا کر اپنے ملازموں اور گارڈز کو اکٹھا کر کے، پولیس کی مدد لیتے ہوئے اپنے گھر میں رہ سکتی تھی۔ اب تو اُسے کورٹ کچہری کا سامنا کرنا پڑا تو بھی کر لیتی۔ وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ اُس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ رہی بدنامی۔ تو اُس کے چچا اور چچا زاد نے جو اُس کے بارے میں پروپیگنڈہ کرنا تھا کر چکے تھے۔ اب اُس نے اپنی جنگ خود لڑنا تھی۔ بس اللہ کا فضل و کرم چاہئے تھا!

دو چار روز قبل ہی اُس نے ناہید کو فون کر کے سارا احوال اُس کے گوش گزار کر دیا تھا کہ اب اُس کی روپوشی کا راز عیاں ہو چکا تھا۔ سرفراز کے علاوہ انکل جہانگیر اور یقیناً ماموں جان بھی اُس کے whereabouts جان چکے تھے۔ ناہید سے کیا چھپانا تھا؟

اُس نے ناہید کو اپنے تمام ملازمین کے ایڈریس دیے ہوئے اُس کے والد سے ریکویسٹ کی تھی۔ کہ وہ اُن سب تک رسائی حاصل کر کے انہیں حویلی پہنچنے کی تاکید کریں۔ مزید — کہ اُسے پولیس کی نگرانی کی ضرورت تھی!

ناہید کے والد جشید علی قریبی شہر کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر حیدر کوئی ڈھکی چھپی شخصیت نہیں تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں سبھی اُنہیں جانتے تھے۔ وہ اُن کے انتقال اور شندی کی گھر سے فرار سے بھی واقف تھے۔ اُس کی فرار کی اُس کے چچا اور سرفراز نے لوگوں کے سامنے جس غلط انداز میں پیش کیا تھا اُس پر اُنہیں بہت افسوس تھا۔

پھر۔ ناہید کا شندی کی وجہ سے عالمگیر حیدر کے یہاں آنا جانا بھی تھا۔ اُسے پک اینڈ ڈراپ کرنے دو ایک بار وہ خود بھی گئے تھے۔ اسی اثناء ایک بار اُن سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہت عمدہ انسان تھے!

شندی کے حالات جان کر اُنہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ ناہید کی دوست تھی۔ اس ناطے اُن کی بیٹی تھی۔ اُنہوں نے فوراً اپنی ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی۔ ”تمہارے انکل کچھ ہی دن پہلے لنڈن گئے ہیں۔ تمہارا کزن سرفراز پولیس کے ڈر سے کہیں چھپ گیا ہے۔ شاید تمہاری کڈ پٹنگ کے کیس میں۔ تمہارے تین ملازم یا سانی مل گئے ہیں۔ اکرم بابا تمہارے انکل کے خوف سے کہیں روپوش ہیں۔ وہ تین ملازم کہہ رہے تھے کہ اُنہیں اُن کی جائے پناہ پتہ ہے۔ کہہ رہے تھے کہ تمہارے آنے سے پہلے پہلے وہ اُنہیں ساتھ لیکر حویلی پہنچ جائیں گے۔ چاروں گارڈز کو بھی مطلع کر دیں گے۔ رہے تمہارے ماموں۔ تو وہ بمعہ اہل و عیال کے خوش باش زندگی گزار رہے ہیں۔“ ناہید نے خوشگوار سے بات ختم کی۔ اور۔

شندی کو عرصہ بعد ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔



فریڈن ایک ایک کر کے ایک بار پھر سب رپورٹس دیکھ رہے تھے۔
 ”ڈاکٹر خان۔ ہمیں کسی بھی خبر کے لئے کسی بھی وقت تیار رہنا چاہئے۔“
 رپورٹس ایک طرف کرتے ہوئے انہوں نے پرسکرپشن پیڈ اپنے سامنے رکھا۔
 ”میں یہ پانچ دن کی دوائی لکھ کر دیتا ہوں۔ اس سے ٹمپریچر ختم نہ ہوا تو
 we would go for further investigations.“
 لکھتے لکھتے فریڈن گویا ہوئے۔
 "The possibility of Lymphoma
 can not be ruled out."

یاور خان کا رنگ پلچ ہو گیا۔

"Lymphoma?" اُس کی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

"Well, I suspect so ..."

خان کی طرف دیکھا۔

یاور خان اب بھی انہیں دیکھ رہا تھا۔ خالی خالی نظروں سے!
 ”آپ ڈاکٹر ہیں“۔ انہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے
 جیسے تسلی دینا چاہی۔ "And this is called life"

یاور خان نے ایک گہری بے بس سانس لی۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”او کے۔ تھینک یوسر“۔ اُس نے سینئر فزیشن کا شکریہ ادا کیا اور۔
 بو جھل سے قدم اٹھاتا اپنے آفس آ گیا۔ اسٹنٹ کو دوائی لانے کا
 کہا۔ اور خود مریض دیکھنے لگا۔

آج ہفتہ تھا۔ ہاف ڈے تھا۔ آؤٹ ڈور مریضوں کی لائین لگی تھی۔
 ایک بچہ فارغ ہوتے ہی وہ شندی کی طرف آ گیا۔
 مسلسل بخار سے وہ کافی کمزور ہو گئی تھی۔ Lymphoma — مبلگنسی — دوسرے
 لفظوں میں کینسر! اور۔ یاور خان کا دل جیسے کسی نے منھی میں لے لیا۔
 ”کیا حال چال ہیں میم شاندا نہ“۔ اُس نے خود کو سنبھالا۔ پاس آتے

دن گزرتے جا رہے تھے۔ شندی کو اب بھی شام چھ بجے تک بخار
 آ لیتا تھا۔ رات گئے تک رہتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے کم ہوتے ہوئے 99°C پر
 آ جاتا تھا۔

یاور خان اور سب گھر والے سخت پریشان تھے۔ متفکر تھے۔ طرح طرح
 کے دسو سے دلوں میں سر اٹھا رہے تھے۔

پچھلے چند دنوں سے وہ فزیشن کے زیر نگرانی تھی۔ اس وقت بھی یاور
 خان شندی کے تمام Investigation reports ساتھ لئے اُن کے آفس
 میں بیٹھا اُن سے شندی کا کیس ڈسکس کر رہا تھا۔

ہوئے اُس کی نبض تھام لی۔

چونکتے ہوئے وہ اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا تھا اُس سے۔ وہ بھی بالکل شروع کی طرح! بہت اپنائیت سے، بہت کیئر سے۔ انہونی ہی تو تھی!

بے حس بُت بنا رہتا تھا کل تک۔ سنگین سناٹا لئے ہوتا تھا پورے سراپے میں، بے درد سکوت چھایا رہتا تھا آنکھوں میں!

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ہی تو تھا اُس کا۔ ب کچھ۔ محافظ بھی، محبت بھی! اتنے دن وہ پتہ نہیں کہاں بھٹکتی رہی تھی؟ غیروں میں، انجانوں میں! جبکہ۔

اپنے موجود تھے۔ لیکن۔ کیسے موجود تھے؟ یا اور خان تو کوسوں دور چلا گیا تھا۔ معلوم نہیں آج کیسے لوٹ آیا تھا؟

”رو نہیں پلیز!“ وہ بہت پہلے کی طرح اُس کے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ”تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اُس کے آنسو اپنی انگلیوں پر اٹھاتے ہوئے وہ ملائمت سے بولا۔

جبکہ۔ وہ جانتا تھا وہ بخار کی وجہ سے نہیں، اُس کی بے رخی کی وجہ سے رورہی تھی!

پر۔ اُس نے بھی تو اُس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ کسی اور کو اُس پر ترجیح دی تھی۔ اُس کی انسلٹ کی تھی، اُس کی محبت کی بھی!

اس وقت بھی اُس کے پرکشش چہرے پر تاریک ساسایہ لہرایا۔

مگر۔ دوسرے ہی لمحے کینسر؟ اور۔ اُس کی جیسے سانس رکنے لگی۔

لُچ پر شندی نے بمشکل آدھا سب کھایا۔ یا اور خان نے اپنے ہاتھ سے فزیشن کی تجویز کردہ دوا کھلائی۔ ماما کو چند ہدایات دیں۔ تسلی دی اور۔

باہر آتے ہوئے سسٹرنز گس سے شندی کے ٹمپر پچر سے اُسے باخبر رکھنے کا

کہتے ہوئے وہ۔ گھر روانہ ہو گیا۔

لُچ کے بعد وہ آرام کرنے اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ مگر۔ آرام کہاں؟ شندی کو کچھ ہو گیا تو؟

تمام دوپہر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ پانچ بجے اٹھ کراچی کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔ یقیناً شام کی چائے پر اُس کی منتظر معمول کی طرح کچن کے باہر گھاس پر کرسیاں ڈلوائے بیٹھی تھیں۔

وہ وہیں آ گیا۔ امی کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہ کیسا بخار ہے کہ اترتا نہیں ہے؟“ اُن کی فکر مند آنکھیں اُن کے اندیشوں کی غماز تھیں۔

”ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“

جبکہ وہ خود۔ مجسم ’فکر‘ بنا ہوا تھا!

تبھی۔ اُسے گیٹ کے قریب میوہ خان نظر آ گیا۔ اُس نے آواز دے کر اُسے بلا لیا۔ اُس کے ساتھ باتیں کر کے ہی شاید اُس کا اور امی کا دھیان بٹ جائے!

اور پھر۔ میوہ خان شروع ہو گیا۔ پوری ہستی کی خبریں ایک ہی سانس میں سنا ڈالیں۔

کتنی معصومیت تھی ان لوگوں میں۔ کتنے Innocent تھے یہ لوگ!

نہ کسی بیماری کا پتہ۔ نہ کسی روک تھام کی پروا۔

اور۔ عقیدہ اس قدر مضبوط کہ مایوسی پاس بھی نہ پھٹے۔

کوئی بیمار پڑ گیا، تو منہ دھل گئے۔ مر گیا، تو اللہ کی مرضی!

کتنی تسلی آمیز حقیقت بھی۔ کتنے قریب تھے یہ لوگ خدا کے۔

پڑھ لکھ کر اُن کے عقیدے کمزور پڑ گئے تھے۔ بیماریوں کے بارے میں

جاننے لگے تھے۔ مداوا ڈھونڈنے لگے تھے۔ اور۔ کوئی مر گیا؟ تو دوا دیا کرنے

ہوسپٹل پہنچتے ہی وہ شندی کے کمرے میں آ گیا۔ سسٹرنز گس بھی ساتھ تھی۔ اُس نے شندی کا چارٹ دیکھا۔ نمبر پچرویسے کا دیا تھا۔ شکل سے کچھ بھی ظاہر کئے بغیر وہ شندی کے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اُس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

سسٹرن جان چکی تھی اب تک۔ کہ وہ یاور خان کی کزن تھی۔ جیسی وہ اتنی دلچسپی لیتا تھا اُس کے کیس میں۔

”اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، ہاں۔“ یاور خان نے شفقت سے اُس کا

لگے تھے!

پڑھے لکھوں کو ان سے سیکھنا چاہئے۔ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر کتنے مطمئن اور پرسکون ہوتے ہیں! اُس کو بھی قدرے قرار آ گیا۔

میوہ خان اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اب بھی تینوں باتیں کر رہے تھے۔ شاداب کے یہاں بچی پیدا ہوئی تھی۔ انیسہ بیگم نے سب نایاب کے سپرد کر دیا تھا۔ ایسے میں شندی کو اکیلا چھوڑ جانا اُن کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا۔ شندی بھی تو بہت تکلیف کئے بیٹھی تھی اُن پر۔ بہت پیاری بچی تھی۔ خواہ وہ اتنا عرصہ اُس کے خلاف دل میں بغض لئے بیٹھی تھیں۔ اُن کے کہنے پر وہ انہیں ’خالہ جان‘ کہہ کر بلاتی۔ تو وہ نہال ہو جاتی تھیں۔ بہت محاسن تھی اس لفظ میں، اس رشتے میں! وہ نایاب اور شاداب کو بھی گا ہے گا ہے بتاتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ بھی اُن کی اس اچانک تبدیلی پر بہت خوش تھیں۔ لیکن — پر افسوس ضرور ہوتا تھا کہ — شندی اُن کی دسترس سے نکل گئی تھی۔ یاور بھائی کتنے خوش ہوتے ہوئے گئے امی کا شندی کی طرف جھکاؤ دیکھ کر۔ لیکن ساتھ ہی انہیں بھی کتنا دکھ ہوتا ہوگا شندی کے ہاتھ سے نکل جانے کا۔ دونوں بہنیں آپس میں ہی باتیں کرتی رہتیں۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ سردی سوا ہو گئی تھی اور — کہکشاں بستی پر جھک آئی تھی۔

اُس نے گہری سانس لی۔ کوشش کے باوجود اُدا سی نے پھر آ لیا تھا۔ امی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ کہ ڈاکٹر ز کو کیا اندیشے تھے؟ رات دس بجے اُس نے سسٹر کو فون کیا۔ پروگریس پوچھی مگر — کچھ فرق آیا ہوتا تو وہ بتاتی!

اتنی جلدی کیا فرق آیا ہوگا؟ اُس نے بھی سوچا۔ اور —

امید و بیم کی کیفیت میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔

گال تھپتھپایا اور۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

”سر۔ ان کی ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ سسٹر نے یاور خان کو مطلع کیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اُس نے ماما سے پوچھا۔

”گھٹنوں کا درد بہت بڑھ گیا ہے۔“

”سسٹر۔ ان کو میڈیسن دیں۔“ اُس نے دوائی کا نام بتایا۔ پھر۔ ماما

کی طرف متوجہ ہوا۔

”ماما آج آپ گھر جائیں۔ آرام کریں۔ لوگ ہیں یہاں دیکھنے کو۔

میوہ خان ادھر ہی ہے۔ آپ کو گھر چھوڑ آئے گا۔ اُس نے کہا اور۔

دروازے کی طرف بڑھا۔ سسٹر بھی ساتھ چلی گئی۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ سے گھر جانے کو...“ شندی ماما سے

مخاطب ہوئی۔

”اے کیسے تمہیں اکیلا چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ میرے تو اب بھی دل میں

ہول اٹھ رہے ہیں۔ بخار تمہاری جان چھوڑے تو کچھ تسلی ہو...“

”اُتر جائے گا۔ بخار ہی تو ہے۔“ شندی نقاہت سے بولی۔

”اللہ کرے آج ہی اترے اور پھر کبھی نہ آئے۔ آمین!!“

اُن کے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر بعد نور جہاں بانوا آ گئیں۔ دیر تک

بیٹھی رہیں۔ اُس کا دھیان بنانے کو ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ڈیڑھ بجے

کے قریب یاور خان بھی آ گیا۔

مزید کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد نور جہاں بانو واپس چلیں۔

یاور خان وہیں کھڑکی کے پاس صوفے پر بیٹھا تھا۔ سوچوں میں گم تھا۔

شندی نے کروٹ اُس کی طرف لے لی۔ خاموشی سے اُسے تنکے لگی۔

کتنا چاہتی تھی وہ اُسے۔ کتنا قریب تھا وہ اُس کے۔ اس کے باوجود کتنا

دور تھا وہ اُس سے!

وہ چاہتی تھی کہ وہ اُس سے باتیں کرے۔ پہلے کی طرح خوبصورت اور

دلچسپ باتیں۔ مگر۔

جانے کن سوچوں میں گم تھا وہ؟

پہلے جیسی نہ سہی، کہ وہ اُس کی نظریں کسی اور کی ملکیت تھی۔ پر۔ ویسے

تو گپ شپ کر سکتا تھا۔ ادھر کی ادھر کی۔ کزن تو تھا نا اُس کا!

شندی خواہ خواہ بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے کچھ اٹھا اٹھا کر رکھتی گئی۔ کہ شاید

اُس کی محویت ٹوٹے۔ اور وہ اُس کی طرف متوجہ ہو لیکن۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

کھڑکی کے اُس پار خلاؤں میں تنکنا وہ اب بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

تجبی۔ سسٹر نرس اندر آ گئی۔ یاور خان کو بیٹھے دیکھ کر سٹ پٹاسی گئی۔

بریک میں وہ اپنے کاؤنٹر پر نہیں تھی۔ اس لئے اُس نے یاور خان کو اندر آتے

نہیں دیکھا تھا۔

وہ اکثر اسی طرح چلی آتی تھی۔ گھڑی دو گھڑی شندی سے کھڑے

کھڑے بات کر کے واپس چلی جاتی تھی۔ شندی کی انکساری اور ملنساری سے وہ

بہت متاثر تھی۔

”آپ کو... کچھ... چاہئے تو نہیں۔ آپ کی ماما نہیں ہیں نا۔ کوئی

پرولیم ہو تو...“ یاور خان کے سامنے وہ اور کیا کہتی؟

یاور خان سمجھ گیا تھا کہ سسٹر نرس اندر آئی تھی۔ شندی سے جو کچھ کہہ رہی

تھی وہ بھی سن رہا تھا مگر۔

نظریں اب بھی کھڑکی کے اُس پار جمی تھیں۔

”پرولیم ہے نا۔“ اس کے کانوں میں شندی کی آواز پڑی۔

”بتائیں نا پھر۔“ سسٹر اُسکے سر ہانے آ گئی۔

”ڈاکٹر خان مجھ سے بات نہیں کر رہے۔“ وہ بچوں کی سی معصومیت

سے بولی اور۔

یاور خان بے اختیار ہنس دیا۔ رخ شندی کی طرف کر لیا۔
 سسر زگس بھی مسکرا دی۔ اُن دونوں کی آپس میں دلچسپی وہ پچھلی بار ہی
 نوٹ کر چکی تھی۔ اب تک قائم تھا رشتہ۔ اُسے اچھا لگا!
 ”کوئی کام ہو تو تیل کر دیجئے گا“۔ زگس نے کہا۔ اور باہر نکل گئی۔
 ”آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ وہ بول ہی پڑی۔
 ساتھ ہی جانے کیوں؟ خوبصورت آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔
 اٹھتے ہوئے وہ پاس چلا آیا۔ اُس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔
 ”کیوں نہیں کرتا بات۔“ عرصہ بعد اُس نے اپنائیت سے اُس کے
 بال سہلائے۔ ”بس۔۔۔ کچھ پریشانیاں ہیں اپنی!“
 اُس کے متواتر اٹھتیس دن کے بخار سے وہ پریشان ہی تو تھا!
 جانے کیا ہونے والا تھا؟
 وہ تو بھول گیا تھا سب کچھ۔ ابراہیم، منگنی۔ بیوفائی، انسلٹ۔ اُسے
 کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد تھی تو بس۔

"The possibility of Lymphoma can not be ruled out..."

فزیشن کی بات۔ جو اُس وقت بھی اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی!
 معاوہ جھکا۔ اور۔ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔
 اِس لمحے وہ اُس کی تھی۔ کل کی کسے خبر۔ ہونہ ہوا!
 اور پھر۔ وہ جیسے بہک گیا۔ پیار پر پیار کرنے لگا اُسے۔
 وہ جو اُس نے اپنے سلگتے جذبوں پر بندھ باندھ رکھا تھا۔ ٹوٹ پھوٹ
 گیا۔ بہہ گیا سب کچھ۔
 وہ اُسی کی تھی۔ اُس کی زندگی تھی۔ وہ نہ رہی تو وہ بھی جی نہیں پائے گا!
 وہ اور بھی بیقراری سے اُسے چومنے لگا۔

شندی کو اُسکی صلح کا انداز بہت پیارا لگا۔
 اُس نے بھی اُس کی گردن میں اپنی دونوں ہانہیں جمائیں کر دیں۔ کوئل
 لب اُس کے گال پر رکھ دیئے۔
 پھر۔ وہ چوکی۔ یاور خان کی آنکھیں سرخ اور نم تھیں۔ کیوں؟ وہ سمجھ
 نہیں پائی!
 شام کو یاور خان نرسز کاؤنٹر پر آیا۔ اُس کا vital chart دیکھا۔
 نمبر بچ بدستور تھا۔
 خود کو سنبھالتا۔ وہ اندر گیا۔ ہشاش بشاش بنا۔ اُس کو تسلی دی۔ اور۔ جلدی
 ہی باہر نکل آیا۔
 گھر کی طرف رواں دواں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا شندی بچ پائے گی؟

※—※

اور یاس کے عالم میں بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ کل کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں...“

معا۔ یا ورخان کا سیل فون بج اٹھا۔

اُس نے کان سے لگایا۔

”سُئر۔ نیم شاندا۔... expire ہو گئی ہیں۔“ سسٹر نادرہ کی آواز تھی۔

وہ سب چھوڑ چھاڑ تقریباً بھاگتا ہوا شندی کی طرف چل دیا۔

کمرے میں گیا۔ شندی آنکھیں بند کئے بستر پر دراز تھی۔ اور امی اُس

کے سر ہانے بیٹھیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح پاس چلا آیا۔

”شندی“۔ وہ اُس پر جھک آیا۔

”شندی“۔ اُس نے اُس کا چہرہ چھوا۔ بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

وہی ٹھنڈی بستر لہر بن کر اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے تیر گئی اور۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اوہ۔ کتنا بھیا تک خواب تھا!

اُس نے سائینڈ ٹیمبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالا۔ اور

ایک ہی سانس میں پی گیا۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھا، نماز پڑھی، اور امی کی طرف

آ گیا۔ اس وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر ایک کپ چائے پیتی تھیں۔ اور پھر صبح

لیکر۔ بستر میں باری تعالیٰ کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

”نیند نہیں آ رہی کیا؟“ اس وقت خلاف توقع اُسے اپنے کمرے میں

آتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

”ہاں“۔ وہ وہیں اُن کے پاس بستر میں بیٹھ گیا۔

”چائے پیو گے؟“

ایوننگ سیشن شروع ہوتے ہی وہ فزیشن کے آفس میں آ گیا۔ شندی کا
ہی کیس ڈسکس کرنے۔ آج چوتھا دن تھا شندی کو فزیشن کی دوائی استعمال
کرتے۔

”آج کا دن دیکھتے ہیں۔ ٹمپلر میں فرق آیا تو ٹھیک ورنہ ... we

Should proceed further“

یا ورخان بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔

”سُئر۔ کل کا دن بھی تو ہے۔ ہو سکتا ہے اتر جائے ٹمپلر...“ وہ آس

”ہاں امی۔“

”ٹھہرو میں بنا کر لاتی ہوں۔“ ایسہ بیگم اس وقت حمید کو نہیں جگاتی تھیں۔ خود بنا لیا کرتی تھیں چائے۔

”آپ بیٹھیں پلیز۔ میں خود بناتا ہوں۔“

وہ نیچے چل دیا۔ اور۔

تھوڑی ہی دیر میں گ میں چائے لئے آ گیا۔

”میں نے شندی کے لئے وظیفہ شروع کیا ہے۔“ امی کہنے لگیں۔

”ویسے بیٹا۔ شندی کا بخار کوئی سیریس بات تو نہیں ہے نا؟“

اس موذی مرض کے بارے میں تو ہر ایک کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ بخار کے

طوالت سے وہ بھی سہی ہوئی تھیں۔

”امی مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ فزیشن ایک دوائی ٹرائے کر رہا ہے۔

پانچ دن کی ہے۔ آج اُسے بھی تیسرا دن ہے... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

”لیکن بخار تو کم تک نہیں ہوا۔“ امی تشویش سے بولیں۔

”بہی تو ساری مشکل ہے۔ پرسوں تک بخار نہ اترتا تو...“ اُس نے

بات ادھوری چھوڑ دی۔

”تو؟ تو کیا بیٹا؟“ امی کی تسبیح پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

”امی ڈاکٹر کو... کینسر کا شک ہے؟ کب تک چھپاتا وہ؟“

”کیا؟“ امی کی آواز ڈوب سی گئی۔

اُس نے گہری سانس لی۔ تشویش تھی جس میں، کیرتھی جس میں۔

”اوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے...“

”ایسا مت کہو بیٹا۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ نہ ہمارے ساتھ ہو نہ ہی کسی

اور کے ساتھ ہو...“

”کاش امی۔ سب کچھ اپنے بس میں ہوتا...“

کتنا دکھی تھا وہ؟ کتنا آپ سیٹ!

وہ تو کب سے اپنے کئے پر پشیمان تھیں۔ جب سے شندی کے ساتھ میل

ہوا تھا۔ وہ اُسے بالکل نایاب اور شاداب کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ خون کیا ایسا

بھی رنگ لاتا ہے؟ انہیں اکثر حیرت ہوتی!

اس وقت فزیشن کی بات سن کر تو دل دہل گیا تھا۔ یاور خان کی حالت

دیکھ کر اور بھی اوسان خطا ہو رہے تھے۔

بہت پیار کرتا تھا وہ شندی سے۔ وہ ماں تھیں۔ سب سمجھ رہی تھیں مگر۔ کبھی جو

ماں کے سامنے زبان کھولی ہو۔ چپ چاپ سہم رہا تھا سب کچھ۔

ایک بار پھر وہ خود کو اُس کا مجرم سمجھنے لگیں۔ یہی گھٹ تھا شاید۔ یا پھر۔ شندی

کی اپنی بے شمار خوبیاں، یا پھر۔ خون کا جوش کہ وہ۔ کئی دنوں سے برابر

سوچ رہی تھیں کہ شندی کے ہسپتال سے آتے ہی وہ اُس کا ہاتھ اپنے یاور کے

ہاتھ میں دیدیں گی۔ مزید دکھی نہیں دیکھ سکتی تھیں وہ اُسے۔ انہوں نے نایاب اور

شاداب سے بھی بات کر لی تھی۔ بس نہیں کی تھی تو۔ یاور خان سے!

وہ تینوں اُسے سر پرانز دینا چاہتی تھیں!

لیکن۔ شندی کا بخار کچھ اور صورت اختیار کرنے والا تھا۔ یہ تو اُن

کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کانپ اُٹھیں۔

”اللہ بہتر کرے گا بیٹا۔ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔“

خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اُس کا ڈھارس بندھانے لگیں۔

”ہاں۔ امید تو نہیں چھوڑنا چاہئے...“ سوچوں میں گم اُس نے اُنہی

کی بات دہرائی۔

”آزمائش ہے اپنے رب کی۔ وہ رحمن اور رحیم ہے۔ اپنا کرم کرے گا

انشاء اللہ۔ تم حوصلہ کرو...“ اُس کے قریب ہوتے ہوئے انہوں نے شفقت

سے اُس کا سراپے سینے سے لگایا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

جواب میں وہ بھی اُن سے لپٹ گیا۔ پیار کیا۔

”امی آپ بہت اچھی ہیں۔“

”بس اچھی ہوں تو پریشان مت ہو۔ تمہیں پتہ ہے۔ میں نے کیا کیا پروگرام بنائے ہیں؟“

وہ بہت اُداس تھا۔ سر پر انز کے انتظار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے بتا دیا ہی بہتر سمجھا۔

”کیسے پروگرام؟“ اُس کے بازو اب بھی امی کے گرد لپٹے تھے۔

”میں تمہاری شادی شندی سے کروانے لگی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔ شندی ٹھیک ہو کر آئے گی۔ تو نایاب اور شاداب بھی آجائیں

گا۔ پھر تمہارے نکاح اور رخصتی کا پروگرام بنائیں گے۔“

”اوہ۔۔۔ لیکن امی آپ بھول رہی ہیں کہ اُس کی مگنی ہو چکی ہے ابراہیم سے۔“

امی مسکرا دیں۔

”وہ تو شندی مگنی کی انگوٹھی ابراہیم کے لنڈن سدھارنے سے قفل ہی

اُسے لوٹا چکی ہے۔ ساتھ ہی اُس سے ریکویسٹ کی تھی کہ جانے سے پہلے وہ نہ

اپنے گھر میں کسی سے ذکر کرے تاہی اُس کے گھر میں کسی کو بتائے۔ کہ بقول

شندی وہ مزید شور شرابے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ بھلا ہوا ابراہیم کا۔ کسی کو بھٹک

تک لگنے نہیں دی۔ شکر کیا تھا شاید کہ جان چھوٹی تھی مسائل سے ...“

”آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“

”صرف کل ہی نور جہاں کو ابراہیم نے فون پر بتایا ہے۔ وہ بھی اس

لئے کہ نور جہاں اُسے شادی کرنے کا کہہ رہی تھی۔ آگے سے اُس نے ساری

بات بتا دی۔“

”اور آئی نور جہاں نے آپ کو بتا دی۔“

”ہاں۔ میں نے بھی سب نور جہاں کے گوش گزار کر دیا۔ کہ کیوں

شندی انگوٹھی واپس کرنا چاہتی تھی۔ نور جہاں بہت شرمندہ تھی۔ کہتی تھی وہ اس مگنی

کے لئے راضی ہی نہیں تھا۔ اُسے شندی کے گھریلو مسائل سے ڈر لگتا تھا۔ نور جہاں

نے ہی اُسے سمجھا بھجا کر آمادہ کیا تھا ...“

”اور آپ نے راتوں رات پروگرام بنالیا۔“ اُس نے ماں کو چھیڑا۔

اس کے باوجود پرکشش چہرے پر تاریک سے سائے لہرائے۔

”نہیں بیٹا۔ میں نے راتوں رات پروگرام نہیں بنایا۔ میرا پروگرام تو

شندی سے پہلی اور پھر دوسری ملاقات میں ہی بن گیا تھا۔ ابراہیم کا خیال آیا تھا

مجھے۔ لیکن پھر میں نے سوچا۔ وہ ویسے بھی بے ضرر سی مخلوق ہے۔ کہہ سن کر منالوں

مگی۔ کہ پہلا حق یاد رکھنا ہے ...“

”ہوں ...“ اُس نے ایک پل کو توقف کیا۔ ”لیکن امی۔ شندی نے

اُس سے مگنی کی ہی کیوں؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟“ اُس کی ناراضگی عود کر

آئی۔

اور۔۔۔ ایسے بیگم نے سوچا۔ بھلے اُنہوں نے شندی اور یاور خان کے

ساتھ زیادتی کی تھی۔ مگر جو کچھ بھی کیا تھا۔ اپنی دانست میں یاور خان کے بھلے کے

لئے ہی کیا تھا۔ پھر۔۔۔ اُنہیں ڈر تھا کہ شندی اُن سے یاور کو چھین لے گی۔ اور

وہی اُن کی متاعِ کل تھا۔ یہ قربانی دینے کو وہ تیار نہ تھیں مگر۔

شندی سے ملیں، اچھی طرح پرکھا۔ تو اپنے اندیشے، اپنا خوف بے معنی

معلوم ہوا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھیں۔ اُن کی بہو ایسی ہونی چاہئے کہ جس میں حیا

ہو، شوہر کی عزت کا پاس ہو، گھر میں سب کا مان رکھنے والی ہو۔ قدم رکھے، تو

ساس اور ندیں واری جاتی ہوں ...

اور یہی سب خوبیاں انہیں شندی میں کوٹ کوٹ کر بھری نظر آئی تھیں۔

نے یہ قدم اٹھایا۔ مجھے دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا... لیکن جب میں شندی کو ملی۔ اور پھر بار بار ملی۔ تو مجھے احساس ہوا۔ میں غلطی پر تھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ جس نے اُس کی تربیت کی ہے۔ یقیناً وہ بھی ایک اچھی عورت ہوگی۔ نفیسہ ضرور اچھی تھی۔ ورنہ اتنی اچھی بیٹی کو کیسے جنم دیتی؟ تمہیں اُس سے خفا نہیں ہونا چاہئے۔ مجھ سے شکایت ہونی چاہئے...“

کتنی صاف دل تھیں امی۔ کتنی صاف گو!

اور۔ اس سارے معاملے میں کیا صرف وہ ہی قصور وار تھیں؟ اُس

نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی؟

”امی کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟“ اُس نے ماں کے قدم پکڑ لئے۔

”کیوں مجھے گناہ گار کرتی ہیں۔ آپ نے جو بھی کیا۔ اچھا کیا۔ پلیز! مجھے معاف

کر دیں امی۔“ اُس نے ماں کے پیروں پر اپنے ہونٹ رکھے۔ ”میں نے بھی بعد

میں سوچا تھا۔ خود کو آپ کی جگہ رکھ کر غور کیا تھا۔ آپ کی جگہ میں ہوتا۔ تو میں بھی

سو تیلی ماں کو پسند نہ کرتا۔ میں بھی اپنی اولاد کا رشتہ وہاں کرنے سے گریزاں

ہوتا۔ میری بھی بالکل وہی Feelings ہوتیں جو آپ کی تھیں۔ اس میں آپ کا

کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور وار میں ہوں۔ خود مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ بچپن سے

لے کر آج تک آپ جن لوگوں سے خائف رہیں۔ میں ہی وہاں کیوں گیا...؟“

ایسہ بیگم نے اُسے اٹھاتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

”میری جان۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ تم بھی مجھے معاف کر

دو۔ میں شندی کو کبھی نہیں تھی۔ بہت اچھی لڑکی ہے وہ...“

”امی آپ اچھی ہیں۔“ وہ اب بھی اُن کے سینے میں سر چھپائے تھا۔

”کیوں شندی اچھی نہیں ہے؟“ اُنہوں نے اچانک اُسے چھیڑا۔

اُس نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں۔ اُس نے میری انسلٹ کی ہے... مانا کہ آپ نے اُسے منع

بہت بڑے گھر کی تھی۔ اس کے باوجود ملازموں تک کو عزت دیتی تھی۔ بستی کے غریب مکینوں سے اس قدر ہمدردی تھی۔ کہ ذکر کرتے آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جانوروں تک سے محبت کرتی تھی۔

خود ایسہ بیگم کو بے پناہ عزت اور محبت دی تھی۔ اپنی ماں کے بعد شاید وہ اُنہیں ہی چاہتی تھی۔ اُنہیں یقین تھا اُس کی ماما اُسے یاور خان سے متعلق اُن کا پیغام دے چکی تھی۔ وہ چاہتی تو یاور خان کو بتا سکتی تھی۔ ماں اور بیٹے کے درمیان تفرقہ پڑ سکتا تھا مگر۔ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ عالی ظرف اور صابر تھی۔ اُن کی نفرت کا اندازہ ہو جانے کے باوجود اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ بہت قدر اور احترام دیا تھا اُن کو۔ پھر۔

کیسے نہ وہ اُن کے دل میں گھر کرتی؟

”ایسا کر کے اُس نے میری انسلٹ کی ہے۔“

ایسہ بیگم چونکیں۔ بجائے اُس کو حقیقت بتانے کے، وہ تو خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور نکل گئی تھیں۔

”اُس نے تمہاری انسلٹ نہیں کی۔ تاہی اُس نے اپنی مرضی سے

ابراہیم سے منگنی کی ہے۔ میں نے کہا تھا نور جہاں سے کہ وہ شندی کو ابراہیم سے

بیاہ دے۔ اور۔ میں نے ہی شندی کو اُس کی ماما سے کہلوایا تھا۔ کہ وہ تمہارے

ساتھ شادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے...“

یاور خان متحیر سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

”کہنے دو مجھے بیٹا۔ میں تم دونوں کی مجرم ہوں۔ میں نے نور جہاں پر

باقاعدہ دباؤ ڈالا تھا اس منگنی کے لئے۔ اور میں نے ہی شندی کو بہت سخت الفاظ

میں تم سے باز رہنے کی تنبیہ کی تھی۔ لیکن۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے تمہاری خالہ

نفیسہ سے سو تیلی بہن ہونے کی وجہ سے شدید نفرت تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ نفیسہ نے مجھ

سے میرا باپ چھینا تھا۔ کہیں شندی بھی مجھ سے تمہیں نہ چھین لے۔ اس لئے میں

کر دیا تھا۔ مگر کیا ضروری تھا کہ وہ منگنی ہی کر لیتی؟“
 ”بیٹا اُس کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ...“
 ”نہیں ای۔ پیار سچا ہو تو کسی اور کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔“

بھتا وہ شندی کے لئے پریشان تھا۔ اتنا ہی دل میں اُس سے ناراض تھا۔ منگنی کے بعد شندی نے اُس کو دل سے نکالنے کی کوشش کی ہوگی۔ ابراہیم کو توجہ دینے کی سعی کی ہوگی۔ ابراہیم اُسے ملتا بھی رہتا تھا۔ کہیں اُس نے کوئی Advances کی ہوں تو؟ یہاں آ کر اُس پر وحشت سوار ہو جاتی تھی۔ آپے سے باہر ہونے لگتا تھا!

”بس چھوڑو پچھلی باتیں۔ دعا کرو اُسے صحت نصیب ہو۔ بخار ٹوٹے اُس کا۔“
 جیسی۔ وہ بھی حال میں پلٹ آیا۔ حقیقت کتنی تلخ تھی۔ کیا پتہ کیا ہو نوالا تھا!

”او کے مام۔“ اُس کی تابعداری میں حسبِ عادت شوخی عود کر آئی۔
 ”آپ بھی دعا کریں اُس کے لئے۔“
 ”کیسے نہیں کروں گی۔ وہ ہم سے الگ تھوڑی ہے۔“ امیہ بیگم کے لب و لہجہ میں شندی کے لئے خلوص ہی خلوص تھا۔

پھر۔ دونوں ماں بیٹا کچھ دیر بیٹھے یوں ہی باتیں کرتے رہے۔ نایاب کی، شاداب کی، شندی کی۔

پھر۔ شندی کے یہاں جانے کی۔ اُس کو اپنے گھر کر اچی مدعو کرنے کی۔ اُس کے چچا کی، سرفراز کی، جن کے لئے یادِ اور خان کا ارادہ پکا تھا۔ کہ شندی کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی وہ اُس کے تمام کیسے خود دلجوئی سے کورٹ میں Persue کرے گا۔ اُس کے ماموں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ شندی کے بلڈ

رپورٹ میں زہر کے Traces موجود تھے۔ مسز علی کو اعتراف کرنا ہوگا۔ ہر حال میں۔ وہ نادیہ کو بھی Spare نہیں کرے گا۔ جس نے شندی کے کڈ پنگ کیس میں مک مکا کر کے خود کو بچا لیا تھا!

مگر۔ دونوں کی خوشی کچھ ادھوری ادھوری سی تھی۔ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے کچھ چھپا رہے تھے۔ کاش آج کوئی معجزہ ہو جائے اور شندی کو بخار نہ آئے، دونوں کے دلوں میں ایک ہی آرزو تھی!
 حمید نے ناشتہ لگنے کی اطلاع دی۔ تو دونوں نیچے ڈائیننگ روم میں آ گئے۔

وہ آفس میں بیٹھا اپنے ایک پچھلے آپریشن کردہ مریض کو دیکھ رہا تھا۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ مگر ان دنوں وہ قدرے ٹھہر کر گھر جاتا تھا۔ شندی کے ٹیپر پیر کی اونچ نیچ کا اندازہ کرنے نہیں رکا رہتا تھا۔
 چھ بجے ہی اُس کا بخار اوپر چڑھنا شروع ہو جاتا تھا۔ اس وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ یقیناً کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ورنہ۔ نرس اُس کی شدید تشویش اور انتظار کو سمجھتے ہوئے اُسے کبھی کا مطلع کر چکی ہوتی۔
 پہلے وہ خود چلا جاتا تھا اس وقت شندی کے پاس۔ مگر آج۔ پتہ نہیں کیوں؟ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

جانے کیا ہونے والا تھا؟ کام کرتے ہوئے وہ خود کو کھینٹ رہا تھا جیسے۔ سات بج گئے۔ پھر۔ ساڑھے سات۔ وہ اپنا آخری پیسٹ کبھی کا دیکھ چکا تھا۔ یوں ہی آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے سر نکائے بیٹھا تھا۔
 پھر۔ اٹھا۔ اور تھکے تھکے بوجھل قدم اٹھاتا، بیڑھیاں چڑھتا اوپر شندی کے کمرے میں آ گیا۔ سسٹر نادرہ بھی ساتھ آ گئی تھی۔

”کیسی ہو؟“ وہ سیدھا شندی کے پاس آ گیا۔ سسٹر سے بات ہی نہیں

کی کہ۔

کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کوئی نئی خبر نہیں تھی!

“Fine.” وہ بھی مختصر ابولی۔

اُس نے حسب سابق اُس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ اب بھی بخار تھا۔

چپ چاپ۔ وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

”سر!“ سسٹر نادر پاس چلی آئی۔ ”میڈم کا ٹیپر پچر سر۔“ اُس نے

vital chart اُس کے سامنے کیا۔

”ہوں۔“ اُس نے یوں ہی سی نظر ڈالی۔

اور پھر۔ وہ زور سے چونکا۔

ٹیپر پچر نیچے آچکا تھا۔ تھا ضرور۔ پر کم تھا۔ پچھلے کئی دن جہاں تک کر رہ

گیا تھا۔ اُس سے نیچے آ گیا تھا!

”آپ۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ اُس کے لہجے میں غصہ عود

کر آیا تھا۔

سسٹر سہم کر رہ گئی۔

”میں نے منع کیا تھا۔۔۔“ شندی دھیرے سے گویا ہوئی۔

یاور خان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اور پھر سے چارٹ کی طرف متوجہ

ہو گیا۔

”سوری سر۔“ سسٹر نے کہا۔

”Its okay.”

”میں جاؤں سر؟“ اُسے پتہ تھا۔ یاور خان ابھی بیٹھے گا۔ سوا اجازت

طلب کر لی۔

”ہاں۔ تھینک یو۔“ اُس نے کہا۔

سسٹر جا چکی۔ تو وہ دوبارہ شندی کے پاس آ گیا۔

وہیں کھڑا اُسے ٹکٹے لگا۔ وہ اتنا خوش تھا۔ کہ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

کہ کیا کہے؟

”بینٹیں سے نہیں؟“ وہ بیٹھتا جو تھا اُس کے بیڈ کنارے۔

وہ بیٹھ گیا۔ جھکتے ہوئے اپنے تپتے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

”کیوں منع کیا تھا سسٹر کو بتانے سے، ہاں؟“

”سر پرانز دینا چاہتی تھی آپ کو۔“

وہ ایک بار پھر خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔

”تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ میرا ایک ایک ٹپ کتنے کرب میں گزر رہا تھا۔۔۔“

”سوری۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ خان۔“

وہ خوشگوار سی ہنس دیا۔

”نام اچھا رکھا ہے۔ I like it.“

”ویسے۔ پچھلے دنوں آپ ڈاکٹر خان ہی تو تھے۔“ اُس کے لہجے میں

ٹھکڑا سا تھا۔

اور۔ دنوں بعد اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

”ہنسنے کی بات نہیں ہے۔“

”رونے کی بات بھی نہیں ہے۔“

اب کے وہ ہنس دی۔

دونوں ہنس رہے تھے۔ وہ ڈر گیا۔ کہیں بخار پھر اوپر چلا گیا تو؟ اتنی

خوشی دونوں کو اس آئے گی کیا؟

وہ سیریس ہو گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ہلکی پھلکی۔ دلچسپ

باتیں۔ کہ سنجیدہ بات چیت اُس کے ذہن پر بوجھ ڈال سکتی تھی!

وہ وہیں رہا۔ اُس کے پاس۔ انڈر رابرز رویشن رکھنا چاہتا تھا اُسے۔

ایک اور بھی معجزہ ہوا۔ بخار کی Duration بھی پہلے کی نسبت کم تھی!

شاداں و فرحاں۔ وہ گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

اندیشہ البتہ اب بھی گا ہے گا ہے سرائٹا رہے تھے۔ کہیں کل پھر ٹپر چکر اوپر چلا گیا تو؟

امی کو بھی سب بتا دیا۔ لیکن ساتھ ہی دعا کے لئے بھی کہا۔ کہ پتہ نہیں کیوں؟ وہ اب بھی خوفزدہ تھا!

اگلا سارا دن بھی سب جیسے دم رو کے شندی کی جانب آس اور یاس سے دیکھ رہے تھے۔ امی اور ماما گھر پر۔ اور یاور خان ہوسپتال میں! شام کے سات بج رہے تھے۔ یاور خان فورتحہ فلور پر کنسلٹنٹ لاؤنچ میں بیٹھا کوئی پیتاٹی وی پر نظریں جمائے تھا۔ کان اب بھی اپنے سیل فون کی طرف لگے تھے۔

آج دن کو شندی کو بخار نہیں آیا تھا۔ اور۔۔۔ شام چھ بجے وہ اُس کے کمرے میں گیا ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ کچھ خائف سا تھا جیسے اُس کے کمرے سے ہی!

یہیں آ کر بیٹھ رہا تھا۔ چھ بجے سسٹر نے اُسے بتا دیا تھا کہ شندی کو بخار نہیں آیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ پرتھوڑی سی بے اطمینانی اب بھی تھی! تبھی۔۔۔ اُس کا سیل بج اٹھا۔ امی تھیں۔

”بیٹا شندی کو بخار نہیں آیا۔ میں نے ابھی ابھی نرس سے پتہ کیا ہے۔“ امی بہت خوش لگ رہی تھیں۔

کتی اچھی تھی اُس کی ماں۔ کتنی گریٹ تھی!

”I love you Ammi.“

”I love you too Beta.“

”امی میں شندی کو دیکھ کر بس جلدی گھر آ رہا ہوں۔ اُمید ہے اب اُسے

بخار نہیں ہوگا۔“ وہ مطمئن سا لگنے لگا تھا۔

”نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ بس آ جاؤ جلدی سے۔ نایاب کا فون آیا تھا۔ وہ اور شاداں بچوں سمیت کل صبح کی فلامیٹ سے پہنچ رہی ہیں۔۔۔“

”واؤ۔ خوش کر دیا امی۔“

اگلے ہی دن شندی گھر واپس آ گئی۔ سبھی خوش تھے۔ ماما نے کلام پاک سے ختم کے لئے مسجد کے امام اور اُن کے شاگردوں کو بلایا ہوا تھا۔ ایٹکنسی کے پچھلے دروازے کے باہر وہ لوگ کھلے آسمان تلے پارے لئے بیٹھے ختم قرآن پاک میں مصروف تھے۔

نور محمد کے ساتھ ساتھ حمید بھی اُنہیں اینڈ کر رہا تھا۔ میوہ خان کچن سے مٹھائی لے کر بستی بھر میں تقسیم کر رہا تھا۔

ناایاب اور شاداں شندی کے پہنچنے ہی اُس کے پاس چلی آئی تھیں۔ ایسے بیگم البتہ اس وقت گھر پر ہی کچن کے آگے اپنی مخصوص جگہ پر کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ کہ صبح سے ہی بستی کی عورتیں شندی کی صحت یابی پر اُنہیں مبارکباد دینے آ جا رہی تھیں۔

ایسے بیگم کو ایک انجانی سی خوشی ہو رہی تھی، عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اُنہیں بھی تو برس ہا برس کینیڈا میں گزارتے ہوئے اپنوں کی یاد آئی تھی۔ پھر تو نہیں تھیں!

آج جیسے۔۔۔ وہ کمی پوری ہو گئی تھی۔ ابا جان نہیں تھے پر۔۔۔ شندی بالکل ابا جان کی تصویر تھی۔

وہ شندی کو اپنے گھر لائیں گی۔ ابا جان کی تصویر کو ضرور اپنے گھر میں سجائیں گی۔

اُن کی یاد میں اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

’ابا جان۔ شندی بالکل تنہا ہے۔ اکیلی ہے۔ میں اُسے اپنے گھر لانا چاہتی ہوں۔ آپ ہم سب کی خوشیوں کے لئے دعا کریں۔‘
اور۔۔۔ انہیں لگا۔ ابا جان خوش ہو گئے تھے۔ انہیں بھی جیسے شندی کے بارے میں تشویش تھی!



ہر سونچا چل تھی۔ چاروں اور چہل پہل۔ یہاں وہاں کھڑے گاڑے چاق
و پھو بند تھے اور۔۔۔
ذہلیق شام کے دھند نکوں میں دور تک پھیلی پڑ شکوہ حویلی زندگی کی
رعنائیوں سے مالا مال نظر آ رہی تھی۔
اُس نے گاڑی روک لی۔ قدم باہر رکھائی تھا کہ۔۔۔
پوری حویلی ہفت رنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ اونچے منارے، بام
و در، رنگ و نور کے سیلاب میں نہا گئے۔ بینڈ کی خوبصورت دھنیں جھونکیں اور۔۔۔

جواب میں یاد اور خان کے دوست و احباب نے اتنی فائزنگ کی۔ کہ پورا علاقہ گونج اٹھا۔

اُسے کزنز اور دوستوں کے جلو میں لیکر۔ نایاب، شاداب، اُس کی چچا زاد اور پھوپھی زاد بہنیں۔ اُس کے آگے آگے میوزک کی دھن پر رقص کرتیں دھیرے دھیرے حویلی کے بڑے سے منقل چوہی دروازے میں داخل ہو گئیں۔ ست رنگی روشنیوں میں، پھولوں کی برسات میں، خوشبوؤں کی پھواروں میں۔ اُسے لمبی راہداری سے گزارتے ہوئے وہ لوگ کچھلی طرف مہمان خانے میں لے گئیں۔ نوبے مہندی کا رسم شروع ہوتا تھا۔ تب تک یہ لوگ سستا لیتے، فرش ہو جاتے۔

جگہ چونکہ دور تھی۔ اس لئے ایک دن پہلے سے ہی مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایسہ بیگم کی سرال، دیگر رشتہ دار اور قریبی دوست کل شام آپہنچے تھے۔ ایسہ بیگم بعد نور جہاں بانو کے، نایاب، شاداب اور شندی کو لیکر چارون پہلے ہی آگئی تھیں کہ ایسہ بیگم کے ذمے پوری حویلی اور مہمانوں کا انتظام بھی تھا۔ شندی کی ماں تو تھی نہیں۔ وہ ہی خالہ اور ماں دونوں بن کر سب نمٹا رہی تھیں۔

دن رات مہمانوں کی خاطر تواضع جاری تھی۔ حویلی کے اندر زرق برق کپڑوں میں ملبوس ماماں کہیں ٹھنڈا پہنچا رہی تھیں۔ تو کہیں چائے اور کوئی۔ کہیں سنکیس جا رہے تھے، تو کہیں مٹھائیاں۔

صبح ہر ایک کی مرضی کے مطابق ناشتہ کمروں میں سرو کیا جا رہا تھا۔ دوپہر اور رات کو لمبے چوڑے دسترخوانوں پر انواع و اقسام کے کھانے پچھے جا رہے تھے۔

مردانے میں خدام آنکھیں فرش راہ کئے تھے۔ مہمانوں کی تواضع میں، اُن کی ہر خواہش پوری کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوشاں تھے۔

یاد اور خان کو خاص طور سے حویلی کے پرانے ملازم اکرم بابا اٹینڈ کر رہے تھے۔ باقی خدام اکرم بابا پر رشک کر رہے تھے کہ وہ۔ یاد اور خان کی دیکھ بھال پر مامور تھے!

ماما الفت سبز کا مدار جوڑا زیب تن کئے زیور سے لیس شندی کی سہیلیوں کی خاطر تواضع پر تعینات یہاں سے وہاں مستقل گردش میں تھیں۔ خوشی اُن کی ہر حرکت سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور کیوں نہ ہو۔ کہ اُن کی شندی بی بی کو بہت سارے دکھ اٹھانے کے بعد اُس کا پیار ملنے والا تھا!

ہر طرف ہلچل تھی، ہنگامہ تھا۔ ہنسی تھی، قہقہے تھے۔

روشنیاں تھیں، چمک دمک تھی۔ رنگ تھا، ترنگ تھا کہ۔

عرصہ بعد حویلی کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ گھر کا داماد آیا تھا۔ شندی بی بی کی شادی ہو رہی تھی!

جتنی خوشی مناتے، کم تھا۔

جب سے شندی، ایسہ بیگم، نایاب اور شاداب بمعہ بچوں کے حویلی میں پہنچی تھیں۔ ڈھولک منگوالی گئی تھی۔ سرشام شنید کی سہیلیاں پہنچ جاتی تھیں اور پھر۔ ایسا

دھوم دھڑکا ہوتا تھا کہ الامان!

اس وقت بھی اُس کے کمرے میں اُس کی کزنز اور فرینڈز براجمان تھیں۔

شندی بالکنی کے قریب لگے صوفے پر بیٹھی تھی۔ خوش تھی۔ کہ۔

وہی مشفق چہرے تھے، قدموں کی مانوس آہٹیں تھیں، جیتا جاگتا ماحول

تھا!

لیکن — پاپا نہیں تھے۔ دو موتی لڑھک کر شندی کے خوبصورت گالوں پر آرہے۔

پھر — یاور خان بھی تو اُس سے خفا تھا۔ بات نہیں کر رہا تھا۔ پچھلے جمعے کو ہی نکاح نامے پر دستخط تو کر لئے تھے۔ مگر —

’نہیں کروں گا بات اُس سے۔‘ وہ شاداب پر برساتا تھا۔
’لیکن آپ... ہوسپٹل میں تو... اُس سے بات کرتے تھے۔‘ وہ سہمی سہمی سی بولی تھی۔

یقیناً اُسے شندی نے بتایا تھا۔

’ہاں کرتا تھا۔ تب وہ بیمار تھی۔ مگر اب بیمار نہیں ہے۔‘

کیا منطق تھی یاور بھائی کی بھی؟ پر شاداب کو کیا خبر کہ — یاور خان کی تو جان پر بنی تھی اُن دنوں۔ کیسے بات نہ کرتا؟

’یاور بھائی کچھلی باتیں بھول جائیں نا اب۔‘

’ایک — صرف ایک بات کا جواب چاہئے مجھے — اُس نے کسی اور سے متعلق کی حاشی بھری ہی کیوں؟‘ اُس نے پہلے بھی کئی بار کئی اپنی بات ایک بار اور دہرائی تھی۔

’وہ... اپنی پروٹیکشن... کے خیال سے...‘

’ڈیم اٹ۔ پروٹیکشن — میں مر گیا تھا کیا؟‘ وہ دھاڑا تھا۔ اور —

شاداب خاموش ہو رہی تھی۔ شندی کو تسلی دے دی تھی۔ کہ بولے گا۔

کب تک نہیں بولے گا!

’He is so handsome.’

اُس کے کانوں میں ناہید کی آواز پڑی۔ تو محویت ٹوٹی۔

’میں نے دیکھا ہے بالکلی سے۔‘ ناہید نے اپنی بات پوری کی۔

’چاند سورج کی جوڑی ہے۔‘ سرگز نرگس بولی۔

نرگس کو شندی نے خاص طور پر انوائیٹ کیا تھا۔

’بالکل۔ And he looked so happy.‘ نویدہ نے کہا۔

’اور... ڈاکٹر خان... جو انہیں پسند کرنے لگے تھے۔ میں تو اُس

وقت کی گواہ ہوں۔‘ نرگس پھر چپکی۔

’اچھا؟ یعنی محبت کو پروان چڑھتے آپ نے دیکھا تھا؟‘ نویدہ اور

ناہید ایک ساتھ بولیں۔

باقی سب بھی تجسس سے نرگس کو دیکھنے لگیں۔

’ہاں۔ اپنی ان دو آنکھوں سے۔‘

’ڈاکٹر خان کو بتاؤں گی۔‘ شندی نے تڑی دی۔

’پلیز! پلیز میم۔ اُن سے مت کہئے گا۔‘

اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

’آپ اتنا ڈرتی ہیں اُن سے؟‘ ناہید نے پوچھا۔

’اس سے بھی کہیں زیادہ۔‘

’میں... بھی... ڈرتی ہوں۔‘ شندی نے مسکین صورت بناتے

ہوئے کہا۔

ایک بار پھر لڑکیاں خوشگواہی سے ہنس دیں۔

”سچ کہہ رہی ہو یا؟“ ناہید کو فکر لاحق ہو گئی۔ ”کہیں غصے والا تو نہیں؟“
”ایسا ویسا؟“ شندی بولی۔

”اوہ۔۔۔ پھر تو اچھی خبر نہیں...“ اب کے فرزانہ بولی۔

”جو رد کا غلام تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔“ شندی نے آہستہ سے کہا۔

”اچھا؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

اور وہ۔۔۔ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”ٹھیک تو کہتی ہے۔ مرد کو مرد ہونا چاہئے۔“ بڑی دیر کی چپ سادھے

لیلیٰ چبکی۔

”نہ زیادہ مرد ہونا چاہئے۔ نہ ہی زیادہ غلام ہونا چاہئے۔“ ناہید نے

مخلصانہ رائے دی۔

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ کاٹ چھانٹ کر درست کر لیں گے۔“ فرزانہ

نے سنجیدگی سے کہا۔

ایک بار پھر قہقہے گونجنے۔

یوں ہی چہلپیں ہوتی رہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔

پھر۔۔۔ پیشتر آئیں۔ اور شندی کو مہندی کی رسم کے لئے بنانے

سنوارنے لگیں۔

حویلی کے سائیڈ والے دور تک پھیلے لان میں۔ پنڈال اور اُس کے

اندر خوبصورتی سے سجا سٹج جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ میوزک آن تھی۔ شوخ و شنگ

لڑکیاں میوزک کی دھن پر رقص میں مصروف تھیں۔

شندی کو تھامے نایاب اور شاداب پنڈال میں داخل ہوئیں۔ تو میوزک

رک گئی۔ رقص کرتی لڑکیاں سمٹتے ہوئے اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھیں۔ اور۔۔

کیمرے حرکت میں آ گئے۔

شندی نایاب، شاداب، ان کی کزنز اور شندی کی سہیلیاں آہستہ آہستہ

سٹیج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شندی بیٹھ چکی تو۔۔۔ یاور خان کو بھی کزنز اور دوستوں کی سنگت میں،

ضو پاشیوں اور گل پاشیوں کے درمیان سٹیج پر لایا گیا۔

واقعی۔۔۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی دونوں پر!

پیلے رنگ کے زرق برق کپڑوں میں ملبوس ماما الفت دونوں کے آگے

ہرل کی دھونی دے رہی تھیں۔ انہیں ڈرتھا انہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے!

سٹیج کے آگے نایاب، شاداب اور سب کزنز ڈانس پر ڈانس کرتی جا

رہی تھیں۔

نور جہاں بانو سے مزید صبر نہ ہوا۔ میوزک بدلواتے ہوئے لڑکیوں کو

پرے کیا اور۔۔۔ ایسہ بیگم، اُن کی تندوں اور دیورانی کو لا کر میدان پر قبضہ کر لیا۔

خوب خوب ہنگڑا ڈالا۔ خوب خوب داد ملی۔

لڑکیوں اور پھر خواتین نے جی بھر کر تاج کیا۔ تو یاور خان کے کزنز اور

دوست فلور پر آ گئے پھر تو۔۔۔ سماں ہی بندھ گیا!

یاور خان سب کچھ بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد دو ایک شادیاں اینڈ کی تھیں اُس نے۔ مگر ایسی دھوم دھام اور آن بان نہیں تھی اُن میں۔ اُسے اچھا لگ رہا تھا سب! تبھی۔ ڈاکٹر نادر سٹیج پر گیا اُسے ہاتھ سے پکڑا۔

”چلیں سر آپ بھی۔“

”نہیں یار۔ تم لوگ کرو۔“

نایاب دور سے اُس کا انکار سمجھ گئی۔ فوراً پاس چلی آئی۔

”آئیں بھائی۔ اُنھیں۔“

”تو۔“

”کیوں؟“

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

اور۔ شندی سمجھ گئی، وہ کیوں نہیں اٹھ رہا تھا۔ خفا جو تھا اُس سے!

جانے کہاں سے سسزگزس بھی آ گئی۔

”سر پلیز! آئیں نا۔“

اور۔ اتنی ساری ریکوئسٹس اکٹھی ہوئیں۔ تو اُسے اٹھنا ہی پڑا۔

شندی اُسے خوبصورت سٹپس اٹھاتے دیکھتی رہی۔

سب میں نمایاں تھا وہ۔ ٹال، وینڈسم اور۔ بہت gracefully اپنی

movements سے میوزک کا ساتھ دیتا۔ فن کی باریکیوں سے آشنا تھا!

معا۔ ایسہ بیگم سٹیج پر آئیں۔ اور شندی کو ہاتھ سے تھامتے ہوئے نیچے

لا کر سیدھا یاور خان کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔

وہ چونکا۔ پہلے شندی کو دیکھا۔ پھر ماں کو۔

جانے کیا تھا ماں کی نظروں میں۔ وہ روتہ کر سکا۔

دھیرے سے بازو شندی کی نازک کمر میں ڈالا۔ اور دوسرے ہاتھ میں

اُس کا کول ہاتھ تھام لیا۔

اتنی تالیاں بچیں، اتنا شور بلند ہوا۔ اتنے پٹائے گونجے، اتنی آتھ بازی

ہوئی کہ۔ الامان!

بہت دھیمے دھیمے دونوں waltz کی سحر انگیز دھن کا ساتھ دینے

لگے۔

”تم... تم کون ہو؟“ یاور خان نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ

چاہتے ہوئے بھی اُسے چھوڑا۔

عرصہ پہلے۔ جو سوال شندی نے اُس سے پوچھا تھا۔ اُسے یاد دلایا!

وہ خاموشی سے اُسے کھتی رہی۔ کیا کہتی؟

اس وقت اُس کے چہرے پر چند روز قبل والی گہری سنجیدگی، گہرا سناٹا

نہیں تھا۔ آنکھوں میں وہ وحشت بھی نہیں تھی۔

اتھارٹی البتہ اب بھی وہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔ کمانڈ اب بھی آس پاس

ہی منڈلا رہا تھا!

”ہوں۔ بتاؤ نا؟“ اُس کی قربت سے کچھلتا سا وہ پھر بولا۔

اُس کی آنکھیں متلاطم۔ نظریں ہنگامہ خیز تھیں۔

”نہیں پتہ۔“ اُس کی پلکیں تیز کر گر گئیں۔

بلند ہوا تھا۔

وہ تب بھی سہم کر رہ گئی تھی گو۔

اُن دنوں وہ یادِ خان کی پابند بھی نہیں تھی!

اُس نے ہولے ہولے بات یادِ خان کے گوش گزار کر دی۔

”اور مجھے اُس کا قہقہہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔“ شندی نے کہا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔“

”تو پھر۔۔۔ منگنی کے لئے حامی کیوں بھری؟“

اس کا یہ سوال اسے شاداب سے معلوم ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”مجھے ڈر تھا۔ کہ آپ نہ رہے۔ تو وہ لوگ مجھے اپنی اینٹکی سے نکال

دیں گے۔ میں... اکیلی... دنیا کی بھیڑ میں کیسے نکلتی۔ جب کہ قدم قدم پر دشمن

میری تاک میں تھے...“ اُس نے بمشکل کہا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑاتی۔ واپس

سٹیج پر آ گئی۔

اُسے بے تحاشا رونا آیا تھا۔ جس پر وہ بہت مشکل سے قابو پانے کی

کوشش کر رہی تھی۔

یادِ خان متحیر سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

پھر۔۔۔ خود کو سنبھالا۔ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ کچھ سمجھیں۔

اُس کے ذہن پر کا بوجھ تو چھٹ گیا تھا مگر۔

”سنو۔“

”جی۔“ وہ بمشکل بولی۔ کہ فلور پر صرف وہ دو ہی تھے۔ اور ہر ایک کی

نظریں اُن پر ہی لگی تھیں۔

”ابراہیم کے لئے تمہارے دل میں کوئی جگہ بنی تھی؟“ اُس نے اپنا

خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

”No ... never.“

”اُس نے تمہیں چھو اتو نہیں تھا۔“

Waltz کی مدھ دھن کے ساتھ ہولے ہولے سٹیجس اٹھاتا وہ دل پر

دھرا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے اُسے ہمیشہ دروازے کے باہر ہی رکھا تھا۔“

”کیوں؟“ اُس کی سرگوشی ابھری۔

”Because I never liked him.“

اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔

”لیکن تمہاری کسی بات پر ایک دفعہ وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔“ یہی تو وہ

Episode تھا۔ جس پر اُس نے اُسے کبھی یاد نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا!

شندی کو یاد تھا۔ کیسے بھول سکتی تھی کہ۔

اُسی وقت یادِ خان گاڑی میں بیٹھا دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف

بڑھ رہا تھا۔ اور یقیناً اُن دنوں کی موجودگی بھی نوٹ کی تھی۔ شومنی قسمت اُسی

وقت اُس نے اپنے پاؤں پر کوئی چیز ریختی محسوس کی۔ بے طرح گھبراتے ہوئے

اُس نے دیکھا۔ ایک Lady bird تھی۔ بس اُسی پر ابراہیم کا زور سے قہقہہ

شندی کی بات اُس کے دل میں نشتر بن کر اتر گئی تھی۔
'مجھے ڈر تھا۔ کہ آپ نہ رہے۔ تو وہ لوگ مجھے اپنی اینکسی سے نکال دیں گے...'

'وہ لوگ مجھے اپنی اینکسی سے نکال دیں گے...'
'اینکسی سے نکال دیں گے...'
'نکال دیں گے...'
اوہ۔ اُس نے آنکھیں جھپکیں۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود۔ وہ اُس عام سی اینکسی میں سر چھپانے کو ترسی تھی۔ کہ وہ اکیلی دنیا کی بھیڑ میں کیسے نکلتی؟
'اُس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟' کل ہی اُس نے غصے میں شاداب سے کہا تھا۔

'کیا انتظار کرتی۔ امی نے جو اُسے کہلوادیا تھا کہ آپ لنڈن سے واپسی پر سیدھے کراچی آئیں گے۔ وہیں وہ اپنی دوست کی بیٹی کے ساتھ آپ کا نکاح کروا کر ہی آپ کو یہاں ڈیوٹی پر آنے دیں گی...'
تو۔ شندی نے اُس کی طرف سے مایوس ہو کر سر چھپانے کے لئے ابراہیم کا سہارا لیا تھا!

اُس نے گہری سانس لی۔

کس کا دکھ بڑا تھا؟ اُس کا یا شندی کا؟

متاسف سا وہ بھی سٹیج پر آ گیا۔ اپنی جگہ پر شندی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

تجھی۔ خواتین آئیں۔ اور شندی کے ہاتھوں میں مہندی لگانے لگیں۔

وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا اُسے سب! پھر۔ ماما الفت آ گئیں۔ سب کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔
"شندی۔ فنکشن کے بعد مجھے ملو"۔ اُس نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔

"نہیں"۔ پتہ نہیں کیوں؟ اب وہ خفا تھی!
پلیز! میں انکل کی لائبریری میں انتظار کروں گا۔" وہ کچھ ہی دیر قبل گھومتے پھرتے انکل عالمگیر کی لائبریری دیکھ چکا تھا۔
"نہیں"۔ اُس نے سرفی میں ہلایا۔

اور۔ وہ خاموشی سے سٹیج سے اترتے ہوئے دوستوں کے ہمراہ مردوں کے سائیڈ پر چلا گیا۔

ڈنر بہت شاندار تھا۔ انواع و اقسام کے پاکستانی اور چائیز کھانے تھے۔ Salad bar تھا۔ سویٹ بار تھا۔

سامنے ہی لمب بجی بن رہی تھی؟ چکن باربی کیو ہو رہا تھا، سیخوں میں نکلے بھونے جا رہے تھے، تندور پر گرم گرم نان بن رہے تھے۔ ساتھ میں ایک طرف تازہ پھلوں کا جوس نکالا جا رہا تھا، کولڈ ڈرنکس کا شال تھا، کشمیری چائے تھی! مہمان جا جا کر اپنی مرضی سے ہر چیز لے رہے تھے۔ رات گئے تک ہنگامہ جاری رہا۔

ایسہ بیگم اور نور جہاں بانو لڑکیوں بالیوں کو سو جانے کی تاکید کر رہی تھیں کہ —

صبح تڑکے یہاں سے روانہ ہو کر — کراچی جانے کے لئے ایئر پورٹ پہنچنا تھا!

یاور خان اکل عالمگیر کی لائبریری میں بیٹھا شندی کے انتظار میں کتابیں الٹ پلٹ کرتا رہا۔

مگر — شندی نہیں آئی۔

اُس نے کچھ کم ستایا تھا اُسے؟

※ — ※

شندی دلہن بنی یاور خان کے بچے سجائے بیڈ روم میں خوبصورت کشادہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نایاب بھی اُس کے ساتھ تھی۔ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔
رات کے بارہ بجنے لگے تو نایاب اٹھ کھڑی ہوئی۔
”اب چلتی ہوں۔ ورنہ یاور بھائی آ کر زبردستی نکال دیں گے۔ گڈ نائٹ۔“
مسکراتے مسکراتے اُس نے اُسے پیار کیا اور —

باہر نکل گئی۔
رات بھر کی جاگی، دن بھر کی تھکی تھکائی شندی بھی اٹھی۔ دل چاہتا تھا
نہالے اور پھر — جی بھر کر سولے۔

لیکن پھر ارادہ بدل دیا کہ — یاور خان بھی تو آنیوالا تھا۔ یہی سوچتے

ہوئے وہ سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایک۔ پھر دو بج گئے۔ مگر یادور خان نہیں آیا۔

وہ سخت محکم محسوس کر رہی تھی۔ رات مہندی کے فٹنشن کے بعد وہ بمشکل مکھنڈ ڈیڑھ بستر پر لیٹ پائی تھی۔ اُس کے بعد پھر کراچی روٹنگی کی تیاری میں لگ گئی تھی۔

اُس نے آدھا مکھنڈ مزید یادور خان کا انتظار کیا۔ وہ اب بھی نہیں آیا۔

خفا تو وہ تھی ہی اُس سے، اب غصہ بھی آنے لگا۔

تبھی۔ وہ ابھی، واش روم گئی، ٹھنڈے پانی کا شاور لیا، سادہ سا ہلکے

گلابی رنگ کا ٹائمیٹ سوٹ پہنا، بالوں میں برش کیا اور۔ واپس کمرے میں آ کر صوفے پر پڑ رہی۔

تھکی ہوئی تو تھی ہی۔ بے خبر ہو کر سو گئی۔

صبح کے پونے چار بج کر کہیں یادور خان کو دوستوں نے اندر آنے دیا۔

دونوں کے تھکے ہارے سب سو رہے تھے۔ وہ دبے قدموں اپنے بیڈ روم

میں آ گیا۔

واہ۔ کیا دلہن تھی! اُسے ہنسی آ گئی۔

نہ زرق برق لباس، نہ جلمگ کرتے زیور، نہ ہی بستر پر سر جھکائے بیٹھی

روایتی دلہن!

پر۔ نکھری نکھری سی، سادہ سادہ سی وہ اُسے اور بھی زیادہ پیاری

لگی۔

اُس نے بھی ڈرینگ روم جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ ایڑی ہوا۔ اور کمرے میں آ گیا۔

چند لمبے اڈورنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر۔ پاس آتے ہوئے آہستہ سے اُس کے سر ہانے بیٹھ گیا۔

دھیرے سے اُس کے چہرے پر گہرے آئے بال پیچھے ہٹائے، ہولے سے اپنے ہونٹوں سے اُسے چھوا۔ اور۔

شندی کی آنکھ کھل گئی۔

پل دوپل کو اجنبی اجنبی سا لگ سب کچھ۔

پھر۔ نظریں یادور خان پر پڑیں۔ دو ٹائیے حسین خمار آلود آنکھوں سے اُسے لگتی رہی۔ پھر۔

پاس رکھا چھوٹا سا فلکی کشن اٹھایا اور۔ اُس پر دے مارا کہ۔

پچھلے بہت سارے دن اُس نے اُسے بہت ستایا تھا۔ بہت زلایا تھا!

وہ زور سے ہنس دیا۔ اُس کی ناراضگی کا انداز بہت پیارا تھا!

وہ باری باری کر کے صوفے کے روئیں دار، نرم نرم کشتی، اُس پر مارتی

مگنی۔

وہ ہر وار بچا تار ہا۔ خوشگواہی سے ہنستا رہا۔

”بس؟“ آخری کشن بھی دے مارا تو اُس نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”اچھا اور بھی کچھ ہے؟“

وہ اٹھی۔ اور بستر کے ملائم ملائم ٹیکے اور کھنڈ بھی اُس پر پھینک دیئے۔

”اور؟“ وہ جاندار قبہتھوں کے درمیان بولا۔

اور۔ شندی نے ارد گرد دیکھا۔ باقی کی ہر چیز بہت بھاری تھی

اور۔ یا ورخان اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔

آہستہ سے چلتی وہ دوبارہ صوفے پر آگئی۔

ایک روشنی روشنی نظر اُس پر ڈالی۔ اور پھر بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔



☆ ”سرا میں اس آدمی کا پتہ لگانا چاہتی ہوں۔ میں۔ اور پھر کوئی بھی اس کیس کے فیصلے سے مطمئن نہیں۔ اسکا یوں آسانی سے بُری ہو جانا سب کو عجیب لگ رہا ہے۔“

”یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اُسکا انٹرویو لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیگا۔“

”میں کروں گی اُسکا انٹرویو۔“ وہ ایڈیٹر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”مشکل ہے۔“

”تو سر یہ مشکل کام آخر کون کرے گا؟“ وہ الجھی گئی۔

پولیس۔ قانون کا کام ہے یہ۔۔۔“

”صرف پولیس یا قانون کا نہیں ہمارا بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں بعض اوقات پولیس ناکام ہو جاتی ہے اور پولیس کامیاب رہتی ہے۔ پولیس، پولیس، قانون سب کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ پولیس کا تعاون بہت Count کرتا ہے۔“

☆ برآمدے کے لکڑی کے کھمبے سے سر ٹیکے اُسکی نظریں بائیں جانب دریا کے اس پار اونچائی پر چڑ، صونبر اور قد آور درختوں پر لگیں۔

یہ۔ فخر عالم کے جنگلات تھے۔ اور۔ اُس سے بھی آگے کوسوں پر محیط اُسکی اسٹیٹ تھی۔ رات باتوں کے دوران آنٹی نے اُسے اپنے مشرقی پڑوسی کے بارے میں بتایا تھا!

اُس نے سر جھٹکا۔ سوچوں سے باہر نکلی۔

کہ اُس نے کم سے کم وقت میں بہت سارا کام کرنا تھا!

☆ دریا کے تنگ تر حصے پر پہنچ کر وہ ایک پل کور کی۔ اوپر نگاہ کی۔ جنگل میں

بادلوں نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اس وقت اُس کے ذہن و دل میں مچتی تھی۔

وہ بارڈر کراس کرنے جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ پھر اس جگہ کا مالک ایک قاتل اور سفاک شخص تھا۔ اور وہ بہر حال ایک لڑکی!

بولڈ ہونے کے باوجود اس وقت دل ایک بار دھڑکا ضرور!

بڑے سے پتھر پر قدم رکھتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور اللہ کا نام لیکر آگے بڑھی۔

اُس نے دریا پار کیا، اونچی ڈھلان عبور کی، اوپر پہنچی۔

جنگل میں بادل اور کٹر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بھول بھلیوں کا سماں تھا۔ کوئی سر اکوئی سمت تو نظر آتا نہیں تھا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔

کچھ دور جا کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ پاس ہی کہیں سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی تھی۔ اُس کا دل ایک بار پھر دھڑکا۔ کہیں وہ ہی تو نہیں تھا۔

ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

وہ ہی تھا۔ سو فیصد وہی تھا۔ وہ اُسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ عام

سی جینز پر جیکٹ پہنے چند قدم نیچے دریا کے رخ پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ رائیڈنگ کا یہ آخری مرحلہ تھا جیسے۔

اور۔ اپنے پلین کے مطابق — ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر۔ وہ

وہیں لیٹتے ہوئے اُسکی جانب جا لڑھکی۔ انجام کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کو اُس نے وقت ہی کب لیا تھا۔ فخر عالم تک ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے تو اُسے

خاص چوٹ نہیں آئی تھی مگر اُس کے گھوڑے کے ٹاپوں میں الجھنے کے بعد اُسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

’اکیلا‘ آمنہ اقبال احمد کے منفرد سائل میں ایک اور خوبصورت اضافہ ہے۔